بیتی رُتوں کے نقشِ پا

لُبنیٰ رانا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

وہ رو رہی تھی' آنسو ایک تسلسل کے ساتھ اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ اس نے یکلخت اپنی آنکھیں کھول دیں۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ خواب میں نہیں بلکہ حقیقتاً" رو رہی تھی۔ بوجھل آنکھوں اور خوابیدہ دماغ کے ساتھ وہ اس طرح جاگ جانے کے اسباب پر غور کرنے لگی۔ مگر جو چیز سب سے زیادہ غور طلب تھی۔ وہ اس کے آنسو تھے۔ کوشش کے باوجود وہ فوری طور پر نہ تو یہ جان پائی کہ وہ اس وقت کہاں پر ہے اور نہ

مکمل ناول

یہ کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ بے چینی اور اضطراب کے عالم میں اس نے اپنی دائیں جانب کچھ ٹٹولنے کی کوشش کی اور پھر اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔

اس کے ہاتھ کی خفیف سی حرکت سے کمرہ ایک دم روشنی میں نہا گیا۔ کمرے میں اچانک در آنے والی روشنی اسے اپنی آنکھوں میں چبھتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اس چبھن سے بچنے کی خاطر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ مگر جیسے ہی اس کی انگلیوں نے پپوٹوں کو مس کیا تھا۔ اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اسی لمحے اسے یاد آیا کہ وہ سونے سے پہلے کافی دیر تک روتی رہی تھی۔ پھر اسے وہ خواب یاد آیا جس میں وہ تھوڑی دیر پہلے سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ وہ اب بھی اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے کی نمی کو محسوس کر سکتی تھی۔ لیکن یہ سوال کہ وہ کیوں رو رہی تھی اب ایک الجھن کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

اس کے لیے اب یہ الجھن آمیز کیفیت ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کی آنکھوں سے پھسل آنے والا پانی اس کے چہرے کو کیوں نم کر رہا ہے اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ برابر انہیں روکنے کی سعی میں مبتلا تھی۔ مگر دماغ کی متضاد کیفیات نے اس کی ہر سوچ' ہر خیال اور ہر سوال کو مبہم بنا دیا تھا۔

بالآخر اس کی آنکھیں کمرے میں پھیلی روشنی سے خود کو ہم آہنگ کر چکی تھیں۔ اور پھر فقط ایک سرسری نگاہ نے اس پر تمام حقیقت عیاں کر دی۔ اب نہ تو کوئی سوال مبہم تھا اور نہ ہی کسی سوچ نے الجھن کی شکل اختیار کی تھی۔ زندگی اپنی تمام تر بدصورتی کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ جہاں زندگی کا ہر پہلو اس کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ وہیں ناقابل قبول بھی۔ مگر پھر بھی اسے زندگی گزارنا تھی معاً" اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی زندگی تو گزار چکی تھی اب جو باقی تھا وہ زندگی کا اسے گزارنا۔

اور اک کا یہ پل اس قدر بے چین اور بے سکون کر دینے والا تھا۔ کہ اسے اپنے ارد گرد وحشت' بے بسی اور گھٹن کے علاوہ کچھ اور محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

آنسو اب بھی ایک تسلسل کے ساتھ اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ تب اس کی سماعتوں نے اپنی سسکیوں کے ساتھ ایک نامانوس سی آواز کو سنا۔ اس کی سسکیاں تھم گئیں' مگر وہ آواز اب بھی اس کی دائیں

جانب سے ابھر رہی تھی۔ اس نے گردن گھما کر آہستہ آہستہ آواز کی سمت دیکھنا چاہا۔ معاً اسے اپنا سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ آنکھیں پھاڑے بے یقینی کے عالم میں اس جانب دیکھ رہی تھی۔ ایک اور حقیقت، ایک اور امتحان ایک دم کمرے میں آ کر گم ہو گئی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس آواز، اس منظر بلکہ اس درماندہ زندگی سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔

چند قدم بمشکل طے کرنے کے بعد اسے اپنے قدموں میں ہوتی واضح لڑکھڑاہٹ کا شدت سے احساس ہوا۔ کارنر ریک سے سہارا لیتے ہوئے اس نے خود کو بمشکل گرنے سے بچایا۔

"کیا بات ہے بختاور بی بی! آپ کو کچھ چاہیے تھا؟ مجھے جگا دیا ہوتا؟" پشت سے ابھرتی یہ آواز وہ شناخت کر سکتی تھی لیکن وہ پیچھے مڑ کر دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ یونہی کھڑی رہی، ساکت، بے حس و حرکت۔

"آپ کو ایسے اٹھنا نہیں چاہیے تھا۔ ڈاکٹر نے آپ کو مکمل بیڈ ریسٹ بتایا ہے اور اگر بڑی بیگم صاحبہ کو پتا چلا کہ آپ اس طرح اپنے بیڈ سے اتر گئی تھیں تو بخشیں گی نہیں۔ میری خیر نہیں ہے۔" صابرہ اپنے متفکر چہرے کے ساتھ اس کے سامنے تھی۔ اسے اپنی آنکھوں میں شدید تکلیف کا احساس ہوا تھا۔ وہ دھندلی آنکھوں سے صابرہ کے معدوم ہوتے نقوش کو دیکھنے لگی۔ اپنی ذات میں تاریک گوشوں کے حصار میں اس وقت وہاں کوئی دوسرا نہیں تھا۔ کسی دوسرے کا سامنا کرنے کا مطلب تھا اپنا سامنا کرنا اور اس وقت وہ صابرہ سے نہیں بلکہ خود سے نظریں چرا رہی تھی۔ صابرہ کو نظرانداز کر کے وہ غیر ہموار قدموں سے چلتی ہوئی واش روم میں گھس گئی۔

آئینے میں نمودار ہوتا عکس یقینی طور پر اسی کا تھا۔ جس پر ثبت درد، کرب اور اذیت کا ہر احساس ناقابل بیان تھا۔ جیسے یہ تمام احساسات اس کے لیے اوڑھ لیے گئے ہوں، جنہیں وہ چھو تو سکتی تھی محسوس کر سکتی تھی مگر انہیں کھرچ کر اپنے وجود سے باہر نہیں پھینک سکتی تھی۔

اپنے چہرے کے بے جان تاثرات سے واضح نظریں چراتے ہوئے وہ میکانکی انداز میں اپنے چہرے پر پانی گرانے لگی۔ مگر متورم اور بوجھل آنکھوں کو سکون نہیں ملا۔ پانی گرانے کا عمل مزید تیز ہو گیا۔

"سلجوق عمر! تمہیں کچھ بھی [illegible] تکلیف اور آنسو نہیں ملے۔" تیزی سے حرکت کرتے ہاتھ ایک دم ساکت ہو گئے۔ اس کی سماعتوں نے ایک ایسی آواز کو جذب کیا تھا جو نہ تو اس کے تخیل کی تخلیق تھی اور نہ ہی کسی خواہش کی خوش آئند تکمیل۔ اس کے لیے مزید کھڑا رہنا محال ہو گیا۔ واش روم کا دروازہ بند کرنے کے بعد وہ گیلے چہرے اور نم آنکھوں کے ساتھ ایک بار پھر اسی کمرے میں تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر صابرہ کے ساتھ کھڑی دادو پر پڑی تھی۔ جن کے شفقت آمیز نقوش میں پریشانی اور تشویش کی آمیزش صاف دکھائی دے رہی تھی۔ دادو اس کا ہاتھ تھام کر بیڈ تک لے آئیں پھر اسے آہستگی سے بٹھاتے ہوئے بولیں۔

"تمہیں ڈاکٹر نے چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔" دادو وہی بات دہرا رہی تھیں جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے صابرہ کر چکی تھی۔ وہ خاموشی سے آنکھیں موند کر لیٹ گئی۔ دادو ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے صابرہ کو بختاور کے لیے کھانا لانے کی تاکید کر رہی تھیں جب اس نے دادو کا ہاتھ تھام کر نفی میں سر ہلایا۔

"کب تک بھوکی رہو گی؟" وہ استفہامیہ نظروں سے بختاور کو دیکھ رہی تھیں۔

"تم خود کو سزا نہیں دے رہی بختاور، تم مجھے سزا دے رہی ہو۔ اس بوڑھی عورت کو جس کے پاس مزید دکھ برداشت کرنے کا یارا نہیں ہے۔ زندگی کی طرف لوٹ آؤ۔ اپنی خاطر نہ سہی، میری خاطر نہ سہی، اس کے لیے تو تمہیں جینا ہی پڑے گا۔" دادو جس جانب دیکھ رہی تھیں، اس کا دل وحشت سے بھر گیا۔

"میں سونا چاہتی ہوں۔" نامحسوس انداز میں اس کے لہجے میں سرد مہری در آئی تھی جسے دادو نے فوراً محسوس کر لیا تھا مگر بغیر خفگی کا تاثر دیے وہ اس کے

کمرے سے باہر نکل گئیں۔

پہلے وہ خود سے خائف تھی کہ داؤد کی اس بات نے اسے ان سے بھی خائف کر دیا تھا وہ کتنی آسانی سے زندگی اور جینے کی باتیں کر رہی تھیں۔ کما سنے جینے کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ اتنی آسانی سے کیسے سب کچھ بھلا سکتی تھی اور درحقیقت سب کچھ بھلنے والا بھی تو نہیں تھا۔ یہ وہ نقوش تھے جو نقش ہو گئے تھے بلکہ خود اس نے اپنی زندگی پر ثبت کیے تھے اور یہ [illegible] تحریر کیے گئے الفاظ تھے کہ کوئی ان کو بھی لمحے میں مٹا ڈالے اور پھر سب کچھ پہلے جیسے ہو جاتا۔

داؤد کے سامنے اس کا ردعمل اس کے اندرونی احساسات و کیفیات کا آئینہ دار تھا جس کا ہر عکس ان گنت وسوسوں اور اندیشوں سے مزین تھا۔

"کاش! یہ سب کچھ خواب ہوتا' میری زندگی' میرے خوف' میرے اندیشے' میرے خار دیتے احساسات اور یہ وجود۔" اس نے دائیں جانب دیکھا ایک دلفریب آس کے ساتھ "ایک موہوم سی امید کے سہارے' ایک معجزہ کی توقع سے۔ مگر کچھ نہیں ہوا۔ اسے اپنے حواس بے جان ہوتے محسوس ہوئے۔

☼ ☼ ☼

مجھے اپنے حواس بے جان ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر میرے سامنے وہ شخص موجود تھا جس سے تھوڑی دیر پہلے ہوئی ملاقات غالباً اتنی خوشگوار نہ تھی کہ مجھے کسی بھی قسم کی شرمندگی یا پھر خجالت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ مگر میرے شرمندہ تاثرات کے برعکس مقابل کا انداز قدرے سپاٹ اور بے نیازی لیے ہوئے تھا ایسے جیسے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے کی ملاقات وہ بھلا چکا ہو یا پھر میرے بجائے اس کا سامنا کسی اور سے ہوا ہو۔ اور شاید میں اپنے آپ کو اس خوش کن فریب میں مبتلا کر بھی لیتی مگر سامنے بیٹھے اس شخص کی بے نیازی نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔ وہ بہت سنجیدہ انداز میں اپنے سامنے رکھی فائلز سے نظریں ہٹائے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔

"لیکن آپ کی ملاقات ہے اس لیے [illegible] آپ کی ربا فائق کے ساتھ [illegible] اکاؤنٹس کے سلسلے میں آپ [illegible] کانٹیکٹ کریں گے۔ لیکن اگر پھر بھی [illegible] مجھ سے رابطہ کر سکتی ہیں [illegible] آپ کا [illegible] مجھ سے [illegible] علم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے [illegible] بجائے میں اپنی خوش [illegible] کر رہی تھی۔ [illegible] ہونے میں یہ بات [illegible] رہا تھا کیا؟ [illegible] ہانپتے ہوئے [illegible] اندازہ مجھے اس کے چہرے کے [illegible] تھا۔

"آپ اپنے [illegible] میں [illegible] آپ [illegible] پاس بھیجتا ہوں۔" [illegible] میرے اس [illegible] انداز میں [illegible] اپنے [illegible] انداز میں [illegible] اپنے خیالوں سے [illegible]

آفس سے باہر نکل آئی تو ڈر کر سے باہر آتے ہی مجھے شدت سے ایک بار پھر اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔

اتنی بڑی بلڈنگ میں اکاؤنٹس کا شعبہ کہاں تھا اور مجھے کون سا کیبن دیا گیا تھا' یہ خیال محض ہوا میں تیر چلانے کے مترادف تھا۔

"صحیح کہہ رہا تھا ارتضیٰ کہ میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور کروں گی۔ پتا نہیں میں کب تک یہ بے وقوفیاں کرتی رہوں گی۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے میں شرمندگی سے بلند ہوتے احساسات کے ساتھ ایک بار پھر ایم ڈی کے آفس میں تھی۔

"سوری' آئی ایم ان سر!" ایم ڈی صاحب نے مصروف انداز میں سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اب وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا تھا اور مجھے کس قسم کی لڑکی تصور کر رہا تھا' مجھے پتا نہیں تھا مگر اس کے چہرے پر ناراضی کی سی کیفیت نے ایک پل کے لیے مجھے شدید خفت کا احساس دلایا۔

"یس مس ایمن؟" الفاظ جتنے نرم تھے نظریں اتنی ہی آتش لیے ہوئی تھیں۔

"ایکچوئلی سر! میں نہیں جانتی کہ مجھے کون سا آفس دیا گیا ہے۔" خفت آمیز لہجے میں کہتے ہوئے مجھے ایک بار پھر اسی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا۔ پھر اپنے دائیں جانب فون سیٹس میں سے ایک کا ریسیور اٹھا کر دھیمی آواز میں ردا فاروق کو اپنے کمرے میں طلب کیا۔ اس عرصے کے دوران میں خاموشی سے اس شخص کے تیور ملاحظہ کرتی رہی۔ ناگواری اور بے زاری کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا اس کے چہرے پر۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے کسی پر اپنا پہلا تاثر اچھا نہیں چھوڑا تھا۔ کچھ دیر پہلے نادانستگی میں سرزد ہوئی اس غلطی پر شرمندگی ابھی بھی تھی مگر سامنے بیٹھے اس شخص کی جانب سے اس بات پر کسی بھی قسم کی جرح نہ ہونے کے بعد میری شرمندگی بتدریج زائل ہوتی چلی گئی۔

چند منٹ بعد ایک خوش شکل اور بے حد ماڈرن لڑکی براؤن لیج ڈور کھول کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ شخص ایک بار پھر وہی باتیں اس کے سامنے دہرا رہا تھا جو کچھ دیر پہلے میرے سامنے دہرا چکا تھا۔ وہ بھی اثبات میں ہاں ہی کی بس فرق یہ تھا کہ میں نے منتخب اسامی کی بات میں اس کی ہدایت کو سنا تھا اور وہ مکمل حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے وقتاً فوقتاً مسکراہٹوں کا ذخیرہ بھی لٹا رہی تھی۔ مجھے اس لڑکی پر رشک آ رہا تھا۔ غضب کا اعتماد تھا اس کے انداز میں اس کی مسکراہٹ میں۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں تھوڑی دیر بعد یہ رشک میرے لیے امتحان کا دن بن گیا۔

میں ذہانت اور محنت میں اس لڑکی سے بہتر ہو سکتی تھی مگر خود اعتمادی کی دوڑ میں میں ایک قدم پیچھے تھی اور زندگی تھی جو ہر قدم پر سامنے کی قابلیت پر بہتر رہتی تھی۔

"مس قرۃ العین! کسی بھی پوزیشن میں ہوتے ہوئے اس بات کا خاص دھیان رکھنا چاہیے کہ آپ کا دماغ ہر لمحہ حاضر ہو۔ خاص طور پر میرا یہ مشورہ آپ کے لیے ہے کیونکہ آپ اکاؤنٹس کے شعبے کے لیے اپائنٹ ہوئی ہیں اور حاضر دماغی اس شعبے کے لیے Key کی حیثیت رکھتی ہے۔" پہلی بار اس نے مجھے استہزائیہ انداز میں مخاطب کیا تھا۔ لیکن مجھے اس کا یہ انداز برا نہیں لگا۔ جتنا برا میں اس کے ساتھ کر چکی تھی۔ کم از کم اس شخص کا اتنا تو حق بنتا تھا کہ وہ اپنا غصہ کسی بھی انداز میں ظاہر کر سکے۔

"باقی کام مس ردا آپ کو سمجھا دیں گی۔ کیوں مس ردا؟" مجھ سے بات کرتے کرتے وہ ردا سے مخاطب ہوا۔ ردا نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی۔

"شیور سر!"

ایم ڈی آفس سے باہر نکلتے ہی ردا مجھے لیے جس ہال نما آفس میں داخل ہوئی اسے دیکھ کر میرا جی چاہا تھا کہ میں اپنا سر پیٹ لوں۔ اتنا بڑا بڑا لکھا اکاؤنٹس آفس مجھے نظر نہیں آیا تھا۔

یہ بات تو طے تھی کہ آج کا دن میرے لیے اچھا ثابت نہیں ہوا تھا۔ تب ہی تو میں اس دن کے جلد سے

بلو کرنے کی دعا مانگ رہی تھی۔ مگر شاید دعا آج مجھے سب کچھ سکھانا ہی چاہتی تھی۔ بیلنس شیٹ، بیلنس اسٹیٹمنٹ اور سپیڈ رنز سے ڈیٹا کیسے چیک کرنا ہے۔ گزشتہ پانچ سال کی بیلنس شیٹ کے بارے میں بتاتے ہوئے وہ مکمل طور پر بیلنس بنانا سکھا رہی تھی۔

"ان کے لیے اکاؤنٹس ہے کل میں تمہیں بتاؤں گی کہ Capital کے لیے تمہیں آفس کے دوسرے ڈیپارٹمنٹ سے بھی رابطہ کرنا ہوگا۔" وہ بہت انہماک کے ساتھ مجھے سمجھانے کی سعی کر رہی تھی۔ لیکن میں سر ہلانے کے علاوہ میں کچھ نہیں کر سکتی تھی اور میں یہی کر رہی تھی۔ غالباً وہ بھی میری اس بےزاری کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔

"یہ بہت ضروری ہے مہرین! تمہیں یہ سیٹ ملی ہے۔ اس سے پہلے اس سیٹ پر صدیقی صاحب کام کیا کرتے تھے۔ گزشتہ کچھ مہینوں سے ان کی کارکردگی کچھ خاص متاثر کن نہیں رہی تھی۔ اس لیے انہیں فوری طور پر اس فرم سے نکال دیا گیا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ یہ تھوڑا مشکل کام ہے۔ تمہیں حاضر دماغی سے کام لینا ہوگا۔ تم صرف اپنی کارکردگی کی ذمہ دار ہو بلکہ اس پورے شعبہ کی بھی جواب دہ ہو۔ جو جو غلطیاں سامنے آئیں گی تم سے سرزد ہوں یا اس شعبہ سے وابستہ افراد سے، ذمہ دار تم ٹھہرائی جاؤ گی۔ لہذا یہ چند دن تمہارے لیے بہت اہم ہیں۔" وہ بہت بے تکلفی سے تمام ذمہ داریوں سے مجھے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جس کے بارے میں میری واضح رائے یہ تھی کہ وہ مجھے ڈرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ غالباً مجھ سے کچھ دیر پہلے سرزد ہوئی بے وقوفیوں کے سبب مجھے لاپروا مزاج کی لڑکی تصور کر رہی تھی۔ لیکن مجھے اسے یہ سمجھانے یا جتانے کی قطعی ضرورت نہیں تھی کہ میں اپنی ذمہ داریوں کے معاملے میں کتنی مستعد اور کتنی حاضر دماغ تھی۔

زیادہ دیر تک میں اپنے حواس پر اپنے باس کے ساتھ کی گئی بدتمیزی کو سوار نہیں رکھ پائی تھی۔ مختلف فائلز سے مانیٹر پر دیے گئے ڈیٹا کو چیک کرتے ہوئے

میرے ذہن سے صبح کا منظر غائب ہو چکا تھا۔
ایک اچھی جاب کا حصول میری زندگی کی چند خواہشات میں بھی شامل نہیں رہا تھا۔ درحقیقت میں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ تو پتے تھے جنہوں نے مجھے ایک نئی راہ دکھائی [illegible] سب کا میرے لیے محض ایک جنونی بات تھی۔
اگر پاپا میرے جاب کرنے کے خیال کو ناپسندیدگی سے نہ دیکھتے تو شاید میں اس بارے میں خود عملی طور پر کرنا تو دور کنارا اپنے دماغ میں ایسا خیال بھی نہیں لا سکتی تھی۔ جن چیزوں کو وہ ناپسندیدہ نظروں سے دیکھتے تھے وہی میری زندگی کا نصب العین بن جایا کرتا تھا۔ کچھ عرصے سے ان کے چھوٹے چھوٹے اعتراضات کو اہمیت دیتے دیتے میں بور ہونے لگی تھی۔ جب پاپا نے خود مجھے ایک منزل کا نشان دیا۔
نجانے اس روز ارتضیٰ نے کیسے اس موضوع کو پاپا کے سامنے چھیڑ دیا تھا حالانکہ ارتضیٰ نے کبھی خود سے مجھے اس بارے میں قائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔
"پاپا میرا خیال ہے آپ منی کو اپنے آفس میں کوئی جاب دے دیں۔ آپ کو اس کی صلاحیت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ یو نو پاپا! آئی از جینئس' میں اسے یوں گھر میں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔" کاریڈور سے گزرتے ہوئے لاؤنج سے ابھرتی اس آواز کو میں نے سرسری انداز میں سنا تھا مگر اس سے مجھے بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ ارتضیٰ میرے لیے کس قدر پریشان تھا۔ تفاخر بھری مسکان نے میرے لبوں کو چھوا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں اس استدعا کا جواب سننا چاہتی تھی۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔
"میں نہیں چاہتا کہ وہ جاب کرے۔" وہی رعونت بھری آواز اور وہی قطعی لہجہ۔
"لیکن پاپا کیوں؟ اس نے ایم بی اے گھر میں بیٹھنے کے لیے تو نہیں کیا۔" ارتضیٰ کا احتجاج کرتا انداز قطعی طور پر غیر منطقی نہیں تھا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ میں نے ہمیشہ پاپا کے غیر منطقی انداز کو کبھی چیلنج نہیں کیا تھا۔

انہوں نے جب [illegible] ہوا کہ [illegible] تھے [illegible] جواب [illegible] کے بارے میں [illegible] سوچا [illegible] اسی لئے [illegible] پتہ تھا [illegible] ان کی شادی [illegible] پتہ تھا [illegible] وقت میں مجھ کے سامنے [illegible] کچن میں [illegible] ساتھ بار [illegible] استغنیٰ سے [illegible] ہوئے [illegible] نہیں چاہتی [illegible] اخبار میں [illegible] کے لیے درخواست [illegible] میں [illegible] درخواست [illegible] کے ساتھ ارتضیٰ [illegible] اس کی جاب [illegible]
"پاپا ارتضیٰ ہو؟" [illegible] بات [illegible] "کچھ دنوں سے میں جاب کرنے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ جب سے میں یونیورسٹی سے فارغ ہوئی ہوں گھر میں وقت گزارنا [illegible] اب تو موبھی مجھے لفٹ نہیں کرواتی۔" مصروف انداز میں کہتے ہوئے میں نے اس کے چہرے کے تاثرات کو سرسری انداز میں دیکھا۔
"تم جاب کرو گی؟" اس کی حیرت فطری تھی اور ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔
میری ڈرپوک طبیعت اور کم [illegible] مزاج سے جس حد تک واقف تھا اسے ایسا ہی ری ایکٹ کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں نے اس کی حیرت کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ جو کچھ میں کرنے جا رہی تھی اس کے لیے ایک حوصلہ درکار تھا اور اب مجھے خود کو مضبوط کرنا تھا۔ سارا اخلاص کرتے کرتے میں ایک سہارے سے تو محروم ہو گئی تھی۔ اب مزید شکست

کی جگہ تحمل نہیں ہو سکتی تھی سو مجھے اپنا سہارا خود بننا تھا۔

میں نے تین جگہ جاب کے لیے اپلائی کیا تھا اور انٹرویو کال لیٹرز موصول ہونے اور پھر انٹرویو ہو جانے کے باوجود میں کچھ زیادہ پر امید نہیں تھی۔ تینوں فرمز میں تجربے کو ترجیحات میں رکھا گیا تھا اور اس صورت حال میں کسی بھی آس یا امید میں مبتلا ہونا محض دیوانے کے خواب جیسا تھا۔ مگر ایک ہفتہ بعد آرائے کمپنی کی جانب سے موصول ہونے والا اپائنٹ منٹ لیٹر مجھے حیرت زدہ کر گیا تھا۔ حالانکہ اس کمپنی میں میرا انٹرویو پہلی کمپنیوں کی نسبت کچھ خاص اچھا نہیں ہوا تھا۔ اپنی دانست میں تو میں نے انٹرویو لینے والے ان تینوں افراد کے سوالات خاصی خود اعتمادی سے دیے تھے مگر ان تینوں افراد کے چہرے کے تاثرات نے مجھے میری متوقع ناکامی سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔

تب میں اس جاب کے ملنے سے خوش تھی۔ کم از کم مجھے زیادہ ٹھوکریں تو نہیں کھانا پڑی تھیں اور اب مجھے سب سے اہم کام کرنا تھا اور وہ تھا اس بابت پاپا کو مطلع کرنا۔ گو کہ میں خود کو اس لمحے کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کر چکی تھی اور ایک طرح سے مجھے اس لمحے کا شدت سے انتظار تھا مگر ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مجھے عجیب سے احساسات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ تیئس سال پرانا خوف اب اتنا بھی ناپختہ نہ تھا کہ ایک ہی ضرب سے ڈھے جاتا۔ اسے تو کچھ وقت درکار تھا۔ پھر ہمت سے لفظوں کا تانا بانا جوڑتے ہوئے میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مسہری پر دراز وہ یقیناً اپنی کسی آفس فائل کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی ان کے چہرے پر حیرت کا تاثر ابھرا تھا اور ممّا سے اس تاثر کو چھپانے کی خاطر انہوں نے آواز کا سہارا لیا۔

"کیا بات ہے؟ تم اس وقت یہاں، کوئی کام تھا کیا؟"

ممّا کی پشت میری جانب تھی پاپا کی آواز نے انہیں بھی میری جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا وہ ایک دم چونک کر میری طرف دیکھنے لگی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں قرآن تھا وہ یقیناً سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کر رہی تھیں۔ میں بچپن سے ممّا کو یہ سب کرتے دیکھتی آئی تھی۔ وہ مذہب سے محبت کرنے والی خاتون تھیں مگر ہمارے خاندان میں دور دور تک ممّا جیسا مذہبی کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میری تینوں بہنوں نے بھی ممّا کو نظرانداز کر دیا تھا وہ بھی مذہب سے اتنی ہی دور تھیں جتنا کہ خاندان کے دوسرے افراد۔

میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اپنی بات کا آغاز کیسے کروں وہ بھی اس صورت میں جب ممّا بھی وہیں تھیں۔ ممّا کی موجودگی میں پاپا کا رد عمل میں نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر میں نے گلا کھنکھار کر کہنا شروع کیا۔

"مجھے آپ سے کچھ بات کرنا تھی اگر آپ مصروف ہیں تو۔" الکنت آمیز انداز میں کہتے ہوئے مجھے شدت سے اپنے اوپر غصہ آ رہا تھا۔

"نہیں! میں مصروف نہیں ہوں۔" اپنے ہاتھ میں پکڑی فائل کو انہوں نے ایک سائیڈ پر رکھتے ہوئے اپنے مخصوص کھردرے لہجے میں کہا۔

بات بہت عجیب سی تھی نہ صرف سامنے بیٹھے ان دونوں افراد کے لیے بلکہ خود میرے لیے بھی میں جاب کرنا چاہتی تھی اب یہ ایسی کوئی آسان بات بھی نہیں تھی۔ مگر جس طرح میں نے اپنی حیرت پر قابو پایا تھا یقیناً یہ دونوں افراد نہیں پا سکتے تھے۔ جس پل میں نے جاب کرنے کے بارے میں سوچا تھا فقط ایک پل کی حیرت کے بعد پہلی بار میری سوچ نے اصلی رسائی کی جانب پیش قدمی کرنے کے بارے میں مثبت رخ اختیار کیا تھا، پہلی بار ابہام، اوہام نے میرے دل و دماغ کو پابند سلاسل نہیں کیا تھا۔ مگر سامنے بیٹھے میرے باپ کے کیا تاثرات ہو سکتے تھے اس سے میں کما حقہ آگاہ تھی مگر میں پھر بھی ان کا رد عمل دیکھنا چاہتی تھی اور یہ سب دیکھنے کی خواہش میری زندگی کی سب سے بڑی تبدیلی تھی کہ لاشعور سے شعور تک کے سفر کی روداد تھی جس نے کسی تند و تیز طوفان کی مانند میری ٹھہری اور سکڑی سمٹی زندگی کو ایک دم متحرک کر دیا تھا۔

"فرار کا ایک آسان حل بھی تو نکل سکتا ہے۔" سگریٹ سلگاتے ہوئے وہ پرسوچ انداز میں گویا ہوئے۔ مما ایک خاموش تماشائی کی طرح ہم دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو کو سن رہی تھیں۔ اپنی تمام زندگی میں انہوں نے فقط یہی کام کیا تھا اور اب بھی یہی کر رہی تھیں وہ صرف سن رہی تھیں۔ وہ آسان حل کیا ہو سکتا تھا جس کا ذکر پاپا کر رہے تھے اس سے میں بخوبی واقف تھی۔ پاپا یقیناً میری شادی کے بارے میں مبہم انداز میں گویا ہوئے تھے۔ میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

"شادی تو خوشی کا دوسرا نام ہے اور جب میری زندگی میں معجزہ نہیں ہے تو خوشی بھی نہیں ہے۔" میں نے متاسف انداز میں سوچا۔ پاپا سے کچھ بھی کہنے کی بجائے میں دروازے کی اور بڑھ گئی اور پھر ان کی جانب رخ کیے بغیر بولی۔

"کل سے میں اپنی جاب جوائن کر رہی ہوں۔" عقب میں موجود پاپا نے کیسا ردعمل ظاہر کیا تھا۔ میں نہ تو دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی سوچنا۔

☆ ☆ ☆

وہ نہ تو دیکھنا چاہتی تھی اور نہ ہی سوچنا مگر ان دونوں خواہشات پر عمل کرنا اس کے لیے ناممکن ہوتا جا رہا تھا جب کبھی وہ اپنے اندر مثبت تبدیلیاں لانے کے بارے میں سوچتی تو حقیقت کا آکٹوپس اس کے تمام وجود کو اپنے حصار میں لے لیتا اور پھر وہ حقیقت کو کھوجنا شروع کر دیتی حقیقت کو کھوجنا اور پھر اسے پا لینا اس کے لیے کوئی خوشگوار عمل نہیں تھا بلکہ بدصورت اور مکروہ ترین فعل تھا۔ مگر چونکہ اب اس کی زندگی تلخیوں کا مجموعہ بن گئی تھی تو وہ ان تلخیوں کے ساتھ زندگی گزارنے کے بارے میں سوچنے لگتی تھی پھر حقائق اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے تھے اور پھر نفرت کا ایک طوفان اس کی تمام مثبت تبدیلیوں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔

وہ ایک بار پھر حقیقت کو کھوجنے لگی، اس خرابی کا سراغ تلاش کرنے لگی۔ جس نے اسے سراپا نفرت میں ڈھال دیا تھا۔ گزشتہ زندگی پر نظر دوڑانا چاہی تو اسے احساس ہوا کہ زندگی اتنی تو نہیں گزری تھی کہ اسے پیچھے جانے میں کسی دقت یا دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ بائیس سال اتنے طویل تو نہ تھے کہ انہیں پکارنے کی نوبت آتی، یہ تو یہیں تھے اس کے آس پاس 'زندگی سے بھرپور' سانس لیتے ہوئے اپنا احساس دلاتے ہوئے۔

قہقہے، سرگوشیاں، شرارتیں ایک کے بعد ایک دریچہ کھل رہا تھا جہاں سے آتی خوشگوار آوازیں اس کے لیے قطعی نامانوس نہیں تھیں۔ وہ بخوبی ان آوازوں سے وابستہ ہر لمحے کو چھو سکتی تھی محسوس کر سکتی تھی۔ زندگی سے ہمیشہ کے لیے خارج ہونے والے ذہنی سکون اور لاپروائی کے دن اپنے معنی کھو چکے تھے جب اس کے لیے زندگی حقیقی معنویت کے اعتبار سے انجوائے منٹ، ایڈونچر کے سوا کچھ نہیں تھی اور اب زندگی کے معانی ہی بدل گئے تھے اب تو اسے کسی کرب کے نام سے موسوم کیا جا سکتا تھا یا پھر پچھتاوے سے یا نفرت، اضطراب سے زندگی کے یہی نام ہو سکتے تھے۔

ایسا ہونے یا پھر کرنے میں کسی اور کا ہاتھ نہیں تھا بلکہ خود اس نے اپنے ساتھ برا کیا تھا، خود اپنے لیے دوزخ کی آگ تیار کی تھی، اپنے لیے ہر اذیت کی راہ چنی تھی۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔ معاً اسے اپنے کمرے میں کسی کی آمد کی آہٹ محسوس ہوئی مگر وہ یونہی لیٹی رہی۔ دادو اور صابرہ کے علاوہ اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کے پرتشویش چہروں پر اپنے لیے اپنائیت ایک اور اذیت تھی۔ جن آوازوں اور جن چہروں کی وہ منتظر تھی انہیں وہ کھو چکی تھی۔

"بختاور بی بی!" اس نے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے صابرہ کے مؤدبانہ طرز تخاطب کو سنا مگر اس کے انداز میں سرمو تبدیلی نہیں ہوئی۔

"نادیہ بی بی کا فون ہے آپ کے لیے، وہ آپ سے

بات کرنا چاہتی ہیں۔" اس کے وجود میں نہ تو کوئی جنبش ہوئی اور نہ ہی اس کا انداز بدلا تھا۔ صابرہ چند ساعتوں تک اس کے اس بے نیازانہ انداز کو ملاحظہ کرتی رہی اور جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اس کی بات سن کر بھی نظر انداز کر رہی ہے 'ملازمہ ہونے کی حیثیت سے وہ اسے مجبور نہیں کر سکتی تھی تبھی خاموشی سے پلٹ گئی مگر بختاور کے لیے خود احتسابی کی ایک کڑی کا اضافہ کر گئی تھی۔ مگر زیادہ دیر تک وہ اپنے اس جاں لیوا پچھتاوے میں نادیہ کو شریک نہیں کر سکتی تھی۔

نادیہ نے تو کبھی اس کا برا نہیں چاہا تھا بلکہ نادیہ سے دوستی اس کی بچپن کی حسین یادوں کا خوب صورت امتزاج تھی۔

نادیہ سے بختاور کی دوستی تب ہوئی تھی جب غالباً" دونوں نے اسکول جانا بھی شروع نہیں کیا تھا۔ دونوں کی ماؤں میں نہ صرف بہت اچھی دوستی تھی بلکہ بوتیک کے کاروبار میں برابر کی پارٹنر بھی تھیں۔ اسی قریبی تعلق نے ان دونوں کے مابین ایک تعلق کو جنم دیا تھا جسے حرف عام میں دوستی کہا جاتا ہے۔ نادیہ کی فیملی اور اس کی فیملی میں خاصا فرق تھا۔ اس کی فیملی خاصی پڑھی لکھی تھی۔ نادیہ کے ڈیڈی سسٹم میں ایک اعلا عہدہ پر فائز تھے اور مقامی کالج میں انگلش کی پروفیسر تھیں اور ایک وسیع سوشل حلقہ رکھتی تھیں۔ نادیہ کی بڑی بہن بھی پی ایچ ڈی ڈاکٹریٹ تھیں اور شادی شدہ ہونے کے باوجود گھر اور جاب کو بخوبی ہینڈل کر رہی تھیں۔ اس کے دیگر فیملی ممبرز بھی اعلا تعلیم یافتہ تھے یا پھر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اپنے گھر میں سب سے چھوٹے ہونے کی بنا پر پڑھائی کے معاملے پر ہر ایک کی نادیہ پر خاص توجہ تھی۔

نادیہ کی فیملی کے برعکس بختاور کا گھرانہ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اس کے ڈیڈی گریجویٹ تھے مگر کراچی کے چند گنے چنے بزنس ٹائی کون میں ان کا شمار کیا جاتا تھا۔ درحقیقت وہ دو اور دو چار کرنے والوں کی فہرست میں شامل تھے۔ ان کے فیملی بیک گراؤنڈ میں کسی اعلا تعلیم یافتہ شخص کو ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ یہی حال ممی کا تھا' ان کی مستند تعلیم کے حوالے سے کئی شکوک و شبہات جنم لیتے تھے جنہیں انہوں نے بڑی خوب صورتی سے اپنے فیشن زدہ حلیے اور روانی سے بولی انگلش کے پیچھے چھپا لیا تھا۔

دوسری جانب اس کے تینوں بھائی تھے رضا اور فیضی بھائی کو تو ویسے بھی پڑھنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ڈیڈی نے ان کے لیے اتنا بڑا بزنس سیٹ اپ جو بنا دیا تھا۔ بزنس جیسی الجھن میں گم ہو کر وہ کیوں خوامخواہ تعلیم جیسی الجھن میں الجھتے البتہ اصبح کو اعلا تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا اس لیے بھی کہ شاید اس کی دوستی نادیہ کے بھائی ثاقب سے تھی اور بڑے لکھے دوست کا کچھ تو اثر ہوتا تھا اس کے ساتھ بھی اصبح جیسا معاملہ تھا' نادیہ کے ساتھ رہ رہ کر وہ بھی اپنی اسٹڈی کے بارے میں خاصی سنجیدہ تھی۔

اولیول کے فائنل ایگزامز کے دوران وہ خاصی ڈسٹرب بھی' ایک تو فصیح کچھ دنوں کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ ناردرن ایریاز گیا ہوا تھا ورنہ وہ کم از کم اس کی ٹینشن دور کرنے میں ضرور مددگار ہوتا مگر ممی تو مزید اس کی ٹینشن میں اضافہ کر رہی تھیں۔ آئے دن ان کے سوشل سرکل میں کوئی نہ کوئی پارٹی ضرور ہوا کرتی تھی اور جس میں شرکت کرنا ان کی اولین ترجیحات میں شامل تھا اور اس شمولیت پر ہی کیا موقوف وہ زبردستی بختاور کو بھی اپنے ساتھ لے جانے پر مصر ہوتیں۔ اپر کلاس کی مادیت پرستی کے سامنے انہوں نے مکمل طور پر اپنے گھٹنے ٹیک دیے تھے اور ستم ظریفی ——— یہ تھی کہ اس سلسلے میں بختاور کی تربیت بھی شروع کر دی گئی تھی۔ شروع شروع میں تو ممی کی ناراضگی کے پیش نظر وہ ممی کے ساتھ جانے پر مجبور تھی مگر پھر اپنی اسٹڈی کے سبب یہ مجبوری بھی ختم ہو گئی۔

اولیول اس نے فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا البتہ نادیہ نے پوزیشن لی تھی مگر ممی کو اس کے فرسٹ ڈویژن لینے کی بھی بے انتہا خوشی ہوئی تھی اور اگلے

روز بختاور کو ان کی خوشی کا جواز بھی سمجھ میں آگیا تھا شام سے ان کے گھر میں شارٹ بلاؤز اور سلیو لیس کپڑوں میں ملبوس خواتین کا تانتا سا بندھ گیا تھا وہ مارے باندھے اس نمائشی ماحول کا حصہ بنی مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ مبارک باد وصول کر رہی تھی۔ مگر درحقیقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ یہ نمائشی ماحول چھوڑ کر اپنے کمرے کی راہ لے جیسے دادو نے لی تھی۔ دادو کو یہ شور شرابا اور نمائشی ماحول قطعی پسند نہ تھا۔ اس چیز کا اظہار وہ درجنوں بار ممی کے سامنے کر چکی تھیں۔ ممی کو ویسے بھی ان کے اعتراضات کی کوئی خاص پروا نہ تھی۔ وہ اپنے طور طریقوں سے زندگی گزارنے کی قائل تھیں۔ کسی کی بھی مداخلت وہ کبھی برداشت نہیں کرتی تھیں اور وہ ایسا ہی کر رہی تھیں دادو بھی وہی کر رہی تھیں جو انہیں پسند تھا۔ مگر بختاور کے لیے ایک مشکل تھی اور وہ یہ کہ وہ اپنی مرضی چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

ایک ہی اسکول سے اولیول کرنے کے بعد ان دونوں نے انٹر کے لیے ایک ہی کالج میں ایڈمیشن لیا تھا مستقبل کے حوالے سے بختاور کا ایک ہی خواب تھا کہ وہ آئی بی اے سے ایم بی اے کرنا چاہتی تھی جبکہ نادیہ نے ابھی کوئی خواب نہیں بنا تھا۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ وہ وہی کرتی تھی جو اس کی امی چاہتی تھیں۔ غالباً ابھی اس کی امی نے اس کے لیے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی تھی۔ مگر انٹر کے رزلٹ کے بعد نادیہ کے دماغ میں ایک عجیب کیڑا کلبلایا تھا۔ وہ آرکیٹکٹ بننا چاہتی تھی۔ بختاور نے اس کی اس ہوائی کو زیادہ سیریس نہیں لیا۔ مگر جب اس نے نادیہ کو اپنی اس ضد پر بدستور اڑے پایا تب اسے اندازہ ہوا کہ نادیہ اس کے ساتھ مذاق نہیں کر رہی۔

بختاور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ آخر نادیہ کے ذہن میں آرکیٹکٹ بننے کی بات آئی کیسے۔ جبکہ نادیہ کا خیال تھا کہ اسے بچپن سے ہی آرکیٹکٹ بننے کا شوق تھا۔ بالفرض اگر شوق یہیں تک محدود رہتی تو بھی قابل اطمینان تھی مگر وہ بختاور کو بھی ——— ایڈمیشن لینے کے لیے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بختاور کو اس کی اس بے جواز ضد پر ڈھیروں غصہ آرہا تھا مگر حتی الامکان اس نے اپنے لہجے کو پرسکون رکھنے کی سعی کی تھی۔

"نادیہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں آرکیٹکٹ بننا ہی نہیں چاہتی تو میں پھر کیوں ایڈمیشن لینے کے بارے میں سوچوں۔ تم مجھے اس بارے میں قائل کرنے کی کوشش مت کرو۔ میری تو یہ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ بے ہودہ خیال تمہارے ذہن میں آیا کیسے۔"

"بہت سی چیزوں کے بارے میں ہم اکثر نہیں سوچتے لیکن ہمیں کرنا پڑتی ہیں۔" وہ پرسوچ انداز میں کہتے ہوئے پرسکون دکھائی دے رہی تھی۔

"جیسے کبھی تم نے سوچا تھا کہ تمہاری منگنی ثاقب بھائی سے ہو جائے گی نہیں نا۔ اس لیے مائی ڈیئر فرینڈ سوچ کا تعلق دماغ سے تو ہو سکتا ہے لیکن مستقبل سے نہیں۔" وہ اس وقت مکمل طور پر بحث کے موڈ میں دکھائی دے رہی تھی۔ اب بختاور کا اسے خاموش کروانا تقریباً ناممکن تھا۔

"اور جہاں تک شوق کا سوال ہے تو تم نے انٹر تک کون سا اپنے شوق کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی اسٹڈی میں انٹرسٹ شو کیا تھا اور تم اسے بے ہودہ خیال کیسے کہہ سکتی ہو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم میرے ماموں اور سعد کو بے ہودہ کہہ رہی ہو۔" نادیہ کی بحث کا رخ ایک غلط نکتہ کی جانب مڑ گیا تھا۔ لہٰذا اسے خاموش کروانا از حد ضروری ہو گیا تھا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا میں تو یہ کہنا چاہ رہی تھی۔" مگر نادیہ اس کے کسی بھی استدلال پر کان دھرنے کے موڈ میں نہیں دکھائی دے رہی تھی۔

"تمہارا جو بھی مطلب تھا اس نے مجھے بہت تکلیف پہنچائی ہے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میری دوست میرے ماموں کو۔"

"شٹ اپ نادیہ۔" وہ اسے ٹوکتے ہوئے ایک دم چیخ پڑی۔

"تم اگر ——— ایڈمیشن لینا چاہتی ہو تو

بڑے شوق سے لو مگر مجھے قائل کرنے کے لیے یہ اوچھے ہتھکنڈے استعمال مت کرو۔" کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا اور جواب میں نادیہ کا ردعمل بھی اس کی توقعات کے برعکس نہ تھا۔ وہ اس دوستی پر لعنت بھیجتے خاصے مشتعل انداز میں اس کے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اگرچہ کہ ماضی قریب میں کئی بار نادیہ کی ناراضگی عمل میں آئی تھی مگر ہر بار یہ ناراضگی اور خفگی محالی دل تقریر محیط ثابت ہوئی تھی۔ بختاور بھی بھی نادیہ کی کسی بھی دھمکی سے مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ اس بار بھی اس کا ایسا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

اگلے دو روز تک وہ غیرارادی طور پر نادیہ کی آمد کی منتظر رہی۔ نادیہ نے اسے فون کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ بختاور کے فون کرنے کے جواب میں بھی اس نے ایک بار بھی فون اٹینڈ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ایک تو اس کے جی میں آیا کہ وہ نادیہ کے گھر جا کر اس کی خوب خبر لے مگر دوسرے ہی لمحے اسے اپنے اس خیال کو رد کرنا پڑا۔ جب سے اس کی منگنی ثاقب کے ساتھ ہوئی تھی وہ غیردانستہ طور پر نادیہ کے گھر جانے سے گریز کرنے لگی تھی۔

ثاقب سے اس کی منگنی فرسٹ ایئر میں ہوئی تھی۔ ثاقب ان دنوں ایم بی ایس کر رہا تھا۔ اس منگنی کے ہونے میں سو فیصد ثاقب کی پسند کا عمل دخل تھا۔ نجانے کب اور کیسے اس کی نگاہوں نے بختاور کو کسی اور رشتہ کی نظر سے جانچا تھا کہ بختاور کو معلوم ہی نہ ہو سکا۔ البتہ کبھی کبھار اس کی آنکھوں سے نشر ہوتے پیغامات اسے موصول ہو جایا کرتے تھے مگر یہ پیغامات مبہم تھے۔ وہ کبھی کبھی ثاقب کی ان پراسرار حرکتوں پر جی بھر کر حیران ہو جایا کرتی تھی اور اکثر اپنی حیرانگی میں وہ نادیہ کو بھی شامل کر لیتی اور جواباً نادیہ بالکل کسی فلمی کردار کی طرح غیرت میں آتے ہوئے اس کی تصحیح کرانے کی کوشش کرتی۔

"دیکھو بخت! میرے معصوم اور ڈیسینٹ سے بھائی پر الزام لگانے کی کوشش مت کرو۔" مگر اس کے معصوم بھائی کی معصومیت کا پردہ اس روز فاش ہو گیا جب اس نے اپنے گھر والوں کے سامنے بختاور سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا اور کسی بھی مخالفت سے پہلے یہ دھمکی بھی دے ڈالی کہ اگر اس کی شادی یہاں نہ کی گئی تو وہ پھر کبھی شادی نہیں کرے گا۔ لہٰذا اس دھمکی میں پنہاں سچائی کے عنصر کو محسوس کرکے اور ثاقب کی سنجیدگی سے مرعوب ہو کر بختاور کے گھر پروپوزل بھیجا گیا۔

بختاور کے گھر والے تو جیسے تیار ہی بیٹھے تھے۔ فوراً منگنی کی رسم ادا کر دی گئی۔ وہ حیرانگی سے پہلی بار ممی اور دادو کو بیک وقت اس رشتے پر متفق ہوتے دیکھ رہی تھی۔

منگنی کے بعد ثاقب اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلا گیا۔ بختاور نے سکون کا سانس لیا تھا۔ کم از کم وہ اس کی ہر وقت کی نظروں کے حصار سے بچ گئی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اسے ثاقب برا لگتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل شخص تھا۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ، اس کی ظاہری شخصیت، اس کی تعلیم ہر چیز پرکشش تھی۔ مگر ان تمام تسکین آمیز باتوں کے باوجود وہ اپنے اندر وہ احساسات پیدا نہیں کر پائی تھی جو ثاقب کے دل میں اس کے حوالے سے تھے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور فوری ہوا تھا کہ وہ ذہنی طور پر ثاقب کو قبول نہیں کر سکی تھی مگر یہ بھی نہیں تھا کہ وہ ثاقب کے علاوہ مستقبل میں کسی اور کو اپنے ساتھ دیکھنے کی خواہش مند ہوتی۔

پچھلے روز نادیہ کا چہرہ اسے دکھائی دیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کالج کے دو ہراسپکٹس تھے۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے تاثرات کو بھی محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"بی ایس سی میں مجھے میتھس اور اسٹیٹس پڑھنا ہے۔ یہ بات کان کھول کر سن لو تم۔" بختاور کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"کیوں؟ تمہیں آرکیٹیکٹ نہیں بننا۔" وہ شرارتی لہجہ میں کہہ رہی تھی۔

"بننا تو مجھے آرکیٹیکٹ ہی تھا۔ مگر خیر اب مجھے M.B.A کرنا ہے۔ کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی

ضرورت نہیں ہے۔ میں M.B.A تمہاری خاطر نہیں بلکہ اسی کی خاطر کر رہی ہوں۔" وہ بے نیازانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔

"مگر تم اپنے بچپن کے خواب کو یونہی ادھورا چھوڑ دو گی تو تمام عمر بے چین رہو گی۔" بختاور مسلسل زیر لب مسکراتے ہوئے شرارت پر مائل تھی۔ نادیہ اس کی ہنسی کو نظر انداز کیے کبابوں سے بھرپور انصاف کر رہی تھی جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ملازم چائے کے لوازمات کے ساتھ رکھ کر گیا تھا۔

پھر یوں ہوا کہ ایف ایس سی کے وہ دو سال انہوں نے کسی نہ کسی طرح گزار دیے۔ ہمیشہ کی طرح ان کی دوستی میں کوئی تیسرا شریک نہیں ہو سکا۔ جب انہوں نے کالج کو خیرباد کہا تو وہ دو ہی تھیں۔ البتہ ایک عدد دشمن کا اضافہ ضرور ہوا تھا۔ اس دشمنی میں زیادہ تر ہاتھ نادیہ کا تھا۔ لیکن چونکہ کالج کو خیرباد کہہ چکے تھے اس لیے اس دشمنی کے پنپنے کے امکانات بھی تاریک تھے۔ مگر یہ تاریک امکانات اس وقت روشن ہوئے جب ان دونوں نے مائرہ اور اس کے گروپ کو IBA میں قہقہے بکھیرتا دیکھا۔ نادیہ کے چہرے پر جس قسم کے تاثرات تھے اس نے بختاور کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تمہیں ہنسی آ رہی ہے اور یہاں میرا خون کھول رہا ہے۔ پتا نہیں کیسے میں نے اس لڑکی کو دو سال برداشت کیا تھا اور اب مزید دو سال!" کڑوے لہجے میں کہتے ہوئے آخر میں اس کے انداز میں افسردگی در آئی تھی۔

یہ نہیں تھا کہ مائرہ کے ساتھ اس کی کوئی لڑائی تھی۔ بظاہر ان دونوں کے تعلقات خاصے نارمل تھے۔ مگر بختاور اچھی طرح جانتی تھی کہ نادیہ کے دل میں مائرہ کے خلاف کس قدر کینہ اور مخاصمت کا جذبہ تھا۔ البتہ مائرہ کے متعلق کچھ بھی کہنا محض اندازہ یا قیاس آرائی ہو سکتی تھی۔ وہ خود پسندی جیسے مرض میں مبتلا ایک ایسی لڑکی تھی جو یہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے اردگرد رہنے والے لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ بختاور کے نزدیک اس کی خود پسندی کی عادت کوئی ایسی قابل گرفت بھی نہ تھی۔ وہ نہ صرف پڑھائی میں بلکہ دیگر سرگرمیوں میں بھی آؤٹ اسٹینڈنگ پرفارمنس دیا کرتی تھی۔ اس کے بولنے کا بولڈ انداز، اپنی ذات اور صلاحیتوں پر بھرپور اعتماد اور سب سے بڑھ کر اس کی خوب صورتی متاثر کن حد تک پرکشش تھی اور اپنی خوب صورتی کو کیسے نمایاں کیا جا سکتا ہے اس سے بھی وہ بخوبی واقف تھی۔

آئی بی اے میں ایڈمٹ ہوتے ہی اس کی خوب صورتی اور ذہانت کا چرچا دوسرے ڈیپارٹمنٹ تک پھیل چکا تھا۔ اس کے یہ تمام اوصاف بختاور سمیت یونیورسٹی کے تمام اسٹوڈنٹس قبول کر چکے تھے اور جو نہیں کر سکی تھی وہ فقط نادیہ تھی۔ نادیہ کی ناپسندیدگی کی وجہ مائرہ کا حاکمانہ انداز اور خود کو سب سے بالاتر سمجھنا تھا۔ پڑھائی کے معاملے میں تو وہ کسی کی بالادستی قبول نہیں کرتی تھی مگر اب تو وہ دیگر سرگرمیوں میں بھی مائرہ کی شمولیت کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھ رہی تھی۔

آئی بی اے میں آنے کے بعد اب وہ دو نہیں رہی تھیں۔ سارہ سے دوستی میں پہل نادیہ نے کی تھی۔ ایک جیسے مشاغل اور شوق نے سارہ کو ان کے گروپ کا مستقل ممبر بنا دیا تھا۔ اب نادیہ مائرہ کی برائیاں بختاور کی بجائے سارہ سے ڈسکس کرنے لگی تھی۔ سارہ جس مدبرانہ انداز میں اس کی ہاں میں ہاں ملایا کرتی تھی بختاور کو اس کی حالت دیکھ کر ہنسی آنے لگی تھی۔ کبھی کبھار اسے سارہ پر ترس بھی آتا مگر بہرکیف نادیہ کو اپنا کتھارسس شیئر کرنے والا ساتھی مل گیا تھا۔

اپنی تمام تر شوخیوں اور لاپروائیوں کے ساتھ وہ تینوں اپنی اسٹڈی میں بھرپور دلچسپی لے رہی تھیں اور نادیہ کے لیے تو یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ مقابلہ مائرہ سے تھا، مسابقت کی دوڑ میں مائرہ نے اسے چیلنج دیا ہو یا نہیں نادیہ نے اسے چیلنج دے دیا تھا علی الاعلان نہ سہی۔

☼ ☼ ☼

میں نے چیلنج دے دیا تھا علی الاعلان نہ سہی لیکن

پھر بھی میں پاپا کو شکست دینا چاہتی تھی۔ صبح جب میں آفس کے لیے تیار ہو کر نیچے آئی تو میں نے پاپا کے ماتھے پر پڑی شکنوں میں مزید ایک شکن کا اضافہ دیکھا۔ اب نہ تو مجھے ان شکنوں کی پروا تھی اور نہ ہی فکر۔ اب جب مجھے اپنی ہی پروا نہیں تھی تو میں کسی اور کی پروا کیوں کرتی۔

درحقیقت میرے اور پاپا کے مابین فقط ایک رشتہ تھا' باپ بیٹی کا نہیں بلکہ حاکم اور محکوم کا اور ایک محکوم کی حیثیت سے فرماں برداری اور سعادت مندی کا مظاہرہ میرے لیے ازحد ضروری تھا۔ کسی نے کہا ہے نا کہ فرمانبرداری ایک ربڑ کی مانند ہوتی ہے' ربڑ کو جتنا کھینچو یہ کھنچتا چلا جائے گا۔ مگر پھر ایک ایسا وقت آتا ہے جب اس کے کھینچنے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے نتیجتاً" وہ ٹوٹ جاتا ہے۔ میری سعادت مندی اور فرماں برداری کی حد بھی ختم ہو چکی تھی۔ اب یہ میرے لیے محض دھندلا سا ہیولا تھا جس کے نقوش تو تھے مگر واضح نہیں۔

پاپا کو نظرانداز کر کے جب میں پورچ میں آئی تو میں نے ارتضیٰ کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا۔

"تم خود ڈرائیونگ کرو گی؟" وہ اچنبھے سے مجھے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھولتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"ڈونٹ وری ارتضیٰ! مجھے ڈرائیونگ آتی ہے۔" میں نے ارتضیٰ سے زیادہ خود کو تسلی دی تھی۔

"وہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ معیز نے تمہیں کیسے ڈرائیونگ سکھائی تھی۔ معیز اسے اپنی زندگی کا سب سے زیادہ صبر آزما دور کہتا ہے۔ مائی ڈیئر سسٹر! تم گھر کے سامنے گاڑی چلانے نہیں جا رہیں۔ ٹریفک کس چڑیا کا نام ہے جانتی ہو تم؟ چلو شاباش! بیٹھو میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" وہ مجھے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اگر وہ ایسا دو تین ماہ پہلے کہتا تو شاید میں اس کی شکر گزار ہوتی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ میں کس قسم کے انقلابات کی زد میں تھی۔

"ارتضیٰ! پلیز مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"پتا نہیں بھئی! مجھے کیوں لگ رہا ہے کہ تم کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ضرور کرو گی۔" ارتضیٰ سے زیادہ میں خود مختلف اندیشوں اور وسوسوں کی لپیٹ میں تھی۔ لیکن آج میں اپنی زندگی کی اس تبدیلی کو اپنے ہر عمل پر لاگو کرنا چاہتی تھی۔

کافی عرصے بعد میں ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ تبھی اسٹارٹ میں نے قدرے سست انداز میں کیا۔ میری نظریں ونڈ اسکرین سے زیادہ بیک ویو مرر پر جمی ہوئی تھیں۔ اور کانوں میں بس ایک آواز گردش کر رہی تھی۔

"تھوڑی دیر کے لیے بھول جاؤ کہ تم قرۃ العین ہو دیکھنا پھر تم کیسے جہاز کی طرح گاڑی اڑاتی ہو۔

جس دن تم ارتضیٰ کے بغیر ڈرائیونگ کرتی ہوئی میرے آفس آؤ گی' میں تو مر ہی جاؤں گا۔ پلیز ایسا مت کرنا۔" میرے ہاتھوں کی کپکپاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ میں معیز کو نہیں بھول سکتی تھی میں ایسا کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میری زندگی کے ہر عمل پر معیز کی ناصحانہ گفتگو کی چھاپ تھی۔ میں زندگی کے ہر عمل سے بھی ناتا توڑ لیتی تب بھی معیز سے ناتا نہیں ٹوٹ سکتا تھا۔ ہاتھوں کی کپکپاہٹ کے ساتھ اب آنکھوں میں بھی دھند اترنے لگی تھی۔

"ہاں میں قرۃ العین نہیں ہوں' نہیں ہوں میں پرانی قرۃ العین' مار دیا ہے میں نے اسے۔" معیز کے کہنے کے مطابق میں بھول گئی تھی اپنے آپ کو مگر اس کے باوجود میرا خوف میرے ساتھ تھا اور بیک ویو مرر سے جھانکتی وہ گاڑی جو مسلسل میرے تعاقب میں تھی میں اسے نظرانداز نہیں کر سکی تھی۔ اپنے خوف کو زائل کرنے کی خاطر میں نے کئی بار دانستہ اپنا دھیان بیک ویو مرر سے ہٹا دیا تھا۔ مگر کئی سگنلز پر اسی گاڑی کو اپنے قریب کھڑے دیکھ کر مجھے اپنا ہر اندیشہ زندہ ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نا چاہتے ہوئے بھی سست رفتاری سے گاڑی نہ چلا سکی تھی۔ فل اسپیڈ سے گاڑی دوڑاتے ہوئے آر اے کمپنی کے پارکنگ لاٹ میں گاڑی پارک کرتے ہوئے میں نے اپنے خوف کے

پیش نظر ایک بار پھر ڈرتے ڈرتے بیک ویو مرر میں جھانکا تب مجھے اپنا خون خشک ہوتا محسوس ہوا۔ وہی گاڑی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی تھی۔ میں بڑی تیزی سے گاڑی سے باہر نکلی' ادھر ادھر دیکھے بغیر ریسپشن پر اپنا مختصر تعارف کرواتے ہوئے ایم ڈی آفس کا معلوم کرکے بڑی سرعت سے لفٹ میں داخل ہوئی لیکن لفٹ میں پہلے سے موجود اس شخص پر نظر پڑتے ہی میرے برداشت کی آخری حد بھی ٹوٹ گئی۔

"آپ کے ساتھ مسئلہ کیا ہے۔ کیوں میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہیں۔" اس شخص کے ساتھ کھڑے دونوں افراد نے بھی حیرت سے مجھے دیکھا۔

"واٹ ڈو یو مین بائے دیٹ؟" تعاقب کرنے والے شخص نے متحیر انداز میں مجھے دیکھا میں اس کی حقیقت سے قریب تر ایکٹنگ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ وہ ایسے حیرانگی ظاہر کر رہا تھا جیسے تمام تر حقیقت سے ناواقف ہو۔

"مسلسل ایک گھنٹے سے میرا پیچھا کرنے کے بعد آپ مجھ سے یہ پوچھ رہے ہیں کہ میری بات کا کیا مطلب ہے۔" اپنے اندرونی خوف کو چھپانے کی خاطر میں بہت تیز تیز لہجہ میں بول رہی تھی اور مقصد یہ بھی تھا کہ اس شخص کے اردگرد کھڑے ان دونوں افراد کی ہمدردی کو سمیٹا جائے۔ مگر میری اتنی صاف اور واضح بات سن کر بھی ان دونوں کی غیرت پر کسی قسم کی کاری ضرب نہیں پڑی' بلکہ ان کے ہونٹوں پر پھیلتی مسکراہٹ نے میرے رہے سہے اوسان بھی خطا کر دیئے تھے۔ یقیناً" میں کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے جا رہی تھی۔

"دیکھیے محترمہ! میں سمجھ نہیں پا رہا کہ آپ کہنا کیا چاہتی ہیں۔ میں آپ کا پیچھا کر رہا ہوں اور وہ بھی ایک گھنٹے سے لیکن کیوں؟" متعجب انداز میں سوال کرتا لہجہ خود میرے لیے بھی حل طلب تھا۔ مجھے اس کے اس لاعلمی کے اظہار پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ وہ یقیناً" ان دونوں افراد کے سامنے ڈرامہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں اسے اس ڈرامے میں کامیاب ہونے نہیں دینا چاہتی تھی۔

"زیادہ انوسینٹ بننے کی کوشش مت کریں' اب آپ یہ بھی کہہ دیں کہ آپ میری گاڑی کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک نہیں آئے' لیکن اگر آپ یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں کوئی بزدل لڑکی ہوں جو آپ کی اس فضول سی حرکت کو اگنور کر دے گی تو یہ آپ کی خام خیالی ہے۔" میں مزید کچھ اور بھی دھمکیاں دینا چاہتی تھی جب مقابل نے میری بات کاٹ دی تھی۔

"آپ جس قسم کی خوش فہمی کا شکار ہیں بہتر ہے کہ اس سے نکل آئیں۔ میں نہ تو آپ کا تعاقب کر رہا ہوں اور نہ ہی مجھے ایسا کوئی شوق چرایا ہے۔" لفٹ کے رکتے ہی وہ باہر نکل آیا۔ مجھ پر ایک کڑی نظر ڈالنے کے بعد وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دائیں جانب مڑ گیا۔

آفس میں اسی شخص کو ایم ڈی کے روپ میں دیکھ کر مجھے شدید صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ در حقیقت مجھے ذہنی دھچکا لگا تھا مگر اس کے باوجود میں اپنے جاب کرنے کے فیصلے پر مستقل مزاجی سے جمی ہوئی تھی۔

ایک ہفتے کے دوران جہاں میں آفس ورک سے کسی نہ کسی طرح واقف ہو چکی تھی وہیں مسز شیرازی جیسی مخلص خاتون سے دوستی بھی ہو گئی تھی۔ پورے آفس میں ایک وہی تھیں جو مجھے مخلص اور صاف گو لگی تھیں۔ وہ پچھلے دس سال سے اکاؤنٹس کے شعبے سے منسلک تھیں' ان کے ہزبینڈ بھی اسی فرم میں کمپیوٹر سیکشن میں بطور کمپیوٹر انچارج اپنی ڈیوٹی نبھا رہے تھے۔

اس جاب نے مجھے اعصابی طور پر تھکا سا دیا تھا۔ گھر میں بیٹھ کر میں نے اپنے لیے زندگی کو اس قدر مشکل بنا دیا تھا کہ باہر کی اعصاب شکن مصروفیت نے میرے اوسان ہی خطا کر دیئے تھے۔ اپنے کام سے تو میں کسی نہ کسی طرح مطمئن تھی مگر اس شعبے کے دیگر افراد کی کارکردگی پر چیک رکھنا مجھے دشوار لگ رہا تھا اس پر مستزاد فراز بشیر کا بار بار میرے آفس میں آنا۔ شروع شروع میں تو میں اس کی اس آمد کو آفس ورک کا حصہ

سمجھتی رہی تھی مگر پھر اس کی عجیب سی نظروں نے مجھے اچھا خاصا ڈسٹرب کر دیا تھا گو کہ بظاہر میں اسے نظر انداز کر کے اپنے کام کی جانب متوجہ رہنے کی سعی کیا کرتی تھی مگر ہر کوشش میرے ازلی خوف کو ہوا دینے کی موجب بن جایا کرتی تھی۔

"کیا بات ہے کچھ ڈسٹرب ہو؟" مسز شیرازی نے لنچ کے دوران مجھ سے دریافت کیا۔ میں بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگی۔

"اچھا بھئی تم اگر مجھے بتانا نہیں چاہتیں تو مت بتاؤ مگر کھانے سے تو ناراضگی مت برتو۔" انہوں نے نہایت بے تکلفی سے چیز سینڈوچ میری پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

تب مجھے احساس ہوا تھا کہ فراز کی اس حرکت کو چھپانا عقلمندی کی دلیل نہ تھی۔ مختصراً" فراز کی اس دیدہ دلیری کے بارے میں بتاتے ہوئے مجھے ایک بار پھر اپنے خود ساختہ اندیشوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

"ڈونٹ وری قرۃ العین! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں بجائے خود کو ڈسٹرب کرنے کے تمہیں یہ بات زیاد آفاق کے علم میں لانی چاہیے اس طرح تو اس کی دلیری بڑھتی جائے گی۔ وہ شاید تمہاری اس خاموشی کو مثبت اشارہ سمجھ رہا ہو۔" وہ بہت سنجیدگی سے مجھے سمجھا رہی تھیں مگر زیاد آفاق کے حوالے سے جو وہ مشورہ دے رہی تھیں وہ اس قدر آسان نہیں تھا۔ پہلے ہی روز جس طرح میں نے اس پر چڑھائی کی تھی آج تک وہ شرمندگی زائل نہ ہو سکی تھی کہ ایک اور مسئلہ اپنے لیے کھڑا کر لیتی۔ وہ نجانے میرے بارے میں کیا سوچے گا اور ہو سکتا تھا کہ وہ فراز کو سرے سے قصور وار ہی نہ مانتا۔ وہ بھی تو بے قصور تھا اور میں نے اس پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی تھی۔ فراز کو بے قصور سمجھنے کے لیے اس کے پاس اچھی خاصی توجیہ موجود تھی۔ تب میں نے اس ضمن میں خاموش رہنے کو ہی ترجیح دی اور شاید میں چند روز تک فراز کی حرکتوں کا ایک بار پھر جائزہ لینا چاہتی تھی ہو سکتا تھا کہ میرے محسوسات ہی غلط ہوں۔

زیاد آفاق میرے کام اور حاضر دماغی سے مطمئن ہوا تھا کہ نہیں یہ تو معلوم نہیں تھا لیکن اب اس کے چہرے پر ناگواری اور بے زاری کے تاثرات بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جو میرے لیے کسی نہ کسی حد تک اطمینان بخش تھے۔ اب بھی وہ میری دی گئی فائل کا تفصیلاً" جائزہ لیتے ہوئے خاصا مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

"اس سے پہلے آپ کہیں اور بھی جاب کرتی رہی ہیں۔" فائل کے صفحات سے نظر ہٹاتے ہوئے اس نے استفسار طلب نظروں سے میری جانب دیکھا۔ جواباً" میں نے محض نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

"اوکے اب آپ جا سکتی ہیں۔" وہ شاید میری خالی الذہنی کیفیت کو بھانپ گیا تھا۔

آفس کی جانب سے ورکرز کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت دی گئی تھی۔ تبھی میں بڑی عجلت میں قدم اٹھاتی ہوئی پارکنگ میں کھڑی آفس وین کی جانب لپکی۔ خود سے ڈرائیونگ کرنے کا ابال بیٹھ چکا تھا۔ اور ویسے بھی میرے لیے اس جاب کی ٹینشن ہی کافی تھی۔

"بڑی جلدی فری کر دیا سر نے تمہیں۔" جب میں مسز شیرازی کے ساتھ اپنی مخصوص سیٹ پر بیٹھی تب مجھے اپنے عقب سے روا کی خفیف سی ناگواری لی ہوئی آواز سنائی دی۔ میرے لیے اس کا یہ طنزیہ انداز ناقابل فہم تھا۔ گزشتہ چند روز سے روا کا رویہ میرے ساتھ خاصی ناراضگی لیے ہوئے تھا۔ شروع شروع میں تو میں نے اپنی جاب کی مصروفیت کی بوکھلاہٹ میں محسوس نہیں کیا تھا مگر اب بات محسوسات سے بہت آگے نکل چکی تھی۔ اسٹاف بھی روا کے اس قسم کے رویے کے بارے میں چہ میگوئیاں کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

میں جواب دیے بغیر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی ویسے بھی روا کی اس بے تکی بات کا کوئی جواب بھی نہ تھا۔

"کیا ہوا؟ زیاد آفاق نے تمہیں ڈانٹا ہے۔" مسز شیرازی نے سرگوشی نما آواز میں دریافت کیا۔ میں نفی

میں بڑبڑانے لگی۔

"نہیں، لیکن روائیہ سے اس انداز میں گفتگو کیوں کرنے لگی ہے۔" میرے انداز میں الجھن تھی۔

"وہ شاید تمہیں اپنا رقیب سمجھنے لگی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ میں نہ سمجھ میں آنے والے انداز میں انہیں دیکھنے لگی مگر مسز شیرازی نے کچھ بھی مزید کہنے سے گریز برتا تھا اور میں نے بھی کریدنا مناسب نہ سمجھا۔

گھر میں داخل ہوتے ہی گہری خاموشی نے میرا استقبال کیا تھا اور یہ خاموشی کوئی ایسی بھی نامانوس نہ تھی میرے لیے۔ میں تو اس خاموشی کی بچپن سے ہی عادی تھی۔ لاؤنج میں مومو کارپٹ پر بیٹھی جگسا پزل کھیلنے میں مصروف تھی۔ جگسا پزل کھیلتے ہوئے اس کے چہرے پر تناؤ کی سی کیفیت تھی۔ شاید وہ تصویر کو مکمل نہیں کرپا رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم میری جانب متوجہ ہوئی تھی۔

"دیکھو عینی! ارتضیٰ نے میرے سارے جگسا پزل پارٹ ادھر ادھر کردیے اب یہ جڑ نہیں رہے۔" وہ روہانسی سی کہہ رہی تھی۔ اپنے کمرے کی جانب بڑھتے قدم اب مومو کی جانب بڑھ گئے تھے۔ جتنی بھی تھکن اور مصروفیت ہوتی مومو کی ایک آواز مجھے سب کچھ بھلادیتی تھی۔ مومو کو مطمئن کرنے کے بعد اب میں اپنے کمرے کی جانب بڑھنا ہی چاہتی تھی تب میں ایک دم چونک سی گئی تھی۔ میرے چونکنے کی وجہ سائیڈ کارنر ٹیبل پر رکھا وہ سجا سجایا مٹھائی کا ٹوکرا تھا۔ میں سمجھ نہیں پائی تھی کہ میری پہلی نظر اس پر کیوں نہیں پڑی تھی؟ حالانکہ اسے کمرے کے اس نمایاں حصہ میں رکھا گیا تھا جہاں پر کسی کی پہلی نظر پڑنے کا امکان سو فیصد تھا۔ بدترین اندیشے میرے دماغ میں سرسرا رہے تھے۔

"مومو! یہ مٹھائی کون لایا ہے؟" اندیشوں نے لفظوں کا روپ دھارا۔

"پھوپھو۔" مختصراً کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر گیم میں مصروف ہوچکی تھی۔ میرا چہرہ یقیناً تاریک ہوگیا تھا۔ کسی بھی قسم کی خوش فہمی اور خوش گمانی کی گنجائش ختم ہوچکی تھی۔ غیر ہموار قدموں سے چلتی ہوئی میں اپنے کمرے میں آگئی۔ تھوڑی دیر پہلے محسوس کیا جانے والا سناٹا اب میرے اپنے اندر گونج رہا تھا۔

"انسان اپنے مقدر کو کبھی نہیں بدل سکتا تدبیر بھی کرے تب بھی مقدر کا اٹل وجود اپنا آپ منوا کر دم لیتا ہے۔ میرے مقدر میں معیز نہیں ہے اور اب مجھے معیز کے بغیر زندگی گزارنے کی جان لیوا کوشش کرنی ہوگی۔" میں دل گرفتگی کی اس منزل پر کھڑی تھی جہاں ہوش و حواس جیسے الفاظ مجھے اپنے معانی بھلا رہے تھے۔ آنسوؤں نے اپنا اپنا راستہ دیکھ لیا تھا۔ نجانے کب تک میں ایسے آنسو بہاتی رہی تھی کہ مجھے اپنے کمرے میں پھیلتے اندھیرے کا بھی احساس نہیں ہوا تھا۔ معاً دروازے پر ہلکی سی دستک سنائی دی اسی کے ساتھ مما کی ملائمت آمیز انداز میں پکارا گیا میرا نام میری سماعت سے ٹکرایا۔

"قرۃ العین!" میں نے یونہی بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر اندھیرے میں ابھرتے ہوئے اپنی ماں کے ہیولے کو دیکھا۔ میں ان کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی اور وہ بھی اس عالم میں جب میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی۔ مگر میری ماں میرے دل میں ابھرتی خواہشات سے ہمیشہ ناواقف رہی تھیں اور اب بھی وہ میری اس خواہش کو سمجھ نہیں پائی تھیں۔ اچانک تیز روشنی نے اندھیرے کی جگہ لے لی۔ اندھیرے میں وہ میرے کرب کا اندازہ نہیں لگا سکتی تھیں اور روشنی سب کچھ عیاں کردینے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں نے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری جانب کرلیا۔

"کیا بات ہے تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے۔" ان کے پاس شاید ہر کسی سے کچھ بھی پوچھنے کے لیے ایک یہی سوال ہوتا تھا۔

"آفس سے آنے کے بعد نہ تو تم نے کھانا کھایا اور نہ ہی مومو کے ساتھ واک پر گئیں۔" سوال کی نوعیت

بدل گئی تھی مگر اس کے عقب میں موجود ارادہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ وہ یقیناً "یہ دیکھنے آئی تھیں کہ معیز کی شادی کی خبر سے میری کیا حالت ہوئی ہے۔ میری تلخی مزید بڑھنے لگی تھی۔

"جی میں ٹھیک ہوں!" میں نے خود کو نارمل کرنے کی سعی کی۔

"تو پھر ایسے اندھیرا کیے کیوں بیٹھی ہو؟" ان کے لہجے میں اب بھی تشویش تھی۔

"آپ کو اندھیرا کرنے پر اعتراض ہے یا پھر میرے اس طرح بیٹھنے پر۔" چڑچڑے انداز میں کہتے ہوئے میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"قرۃ العین!" وہ بے یقینی سے میری جانب دیکھنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں اچنبھا تھا وہ شاید یہ توقع نہیں کر رہی تھیں کہ میں ان سے اس انداز میں گفتگو کروں گی۔ مگر توقعات تو میری بھی پوری نہیں ہوئی تھیں۔ درحقیقت توقعات کے برعکس حالات میرے سامنے تھے جن کا سامنا کرنے کے نام سے ہی میرے اعصاب تھکن ـــ کا شکار تھے۔ میں انہیں نظر انداز کر کے واش روم میں گھس گئی۔ اپنے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے مجھے کسی قسم کی تسکین کا احساس نہیں ہوا تھا۔

"دیکھنی! اچھا ہے تمہارے ساتھ کیا مسئلہ ہے 'تمہارا مسئلہ تمہاری بزدلی ہے' اسی بزدلی کو آج تم نے میرے لیے مسئلہ بنا دیا ہے۔" معیز نے یہ سب اس روز کہا تھا جب میں نے اس کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیا تھا۔ معیز کے اس خیال کی میں نے کبھی تردید نہیں کی تھی حالانکہ اس بار نہ تو میری بزدلی نے مجھے یہ سب کرنے پر مجبور کیا تھا اور نہ ہی میرے خوف نے کوئی کردار ادا کیا تھا۔ میں اسے بتانا چاہتی تھی کہ بعض اوقات ہمارا ہر عمل ہماری محبت کی دلیل بن جاتا ہے۔ یہی دلیل ہمیں کسی کے بھی سامنے جوابدہ ہونے پر مجبور نہیں کرتی۔ مگر میں اسے کچھ نہیں بتا پائی۔ اکیلے ہی اس دوزخ میں جل رہی تھی جس میں فقط میرے لیے بے چینی تھی باقی سب کے لیے اطمینان تھا، سکون تھا۔

اگلے روز آفس میں سب سے پہلے مسز شیرازی نے میری آنکھوں کے متعلق استفسار کیا تھا۔

"کیا بات ہے کل رات تم روتی رہی ہو؟" وہ بہت گہری نظروں سے میری جانب دیکھ رہی تھیں۔ میری مسکراہٹ کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے ان کی توجہ کا مرکز میری آنکھیں تھیں۔

"نہیں دراصل رات بھر مجھے نیند نہیں آئی اس لیے۔" جھوٹ بولنا میرے لیے اتنا آسان کام نہیں تھا۔

"بتانا نہیں چاہتیں! چلو کوئی بات نہیں میں تمہیں مجبور بھی نہیں کروں گی۔" اپنے مخصوص نرم لہجے میں کہتے ہوئے وہ اپنے کیبن میں چلی گئیں۔

لنچ کے وقفے کے دوران میں نے مسز شیرازی کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ جواز کے لیے میرے سامنے رکھی فائلز کا ڈھیر تھا۔ انہوں نے بھی سوال جواب کر کے زبردستی لے جانے کی کوشش نہیں کی بظاہر میں اپنے کام میں منہمک تھی مگر دھیان اب بھی معیز اور فارینہ کی جانب مرتکز تھا۔ بے دھیانی سے فائل دیکھنے کی بجائے میں نے فائلز سے نظر ہٹاتے ہوئے اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ نجانے کتنی دیر تک میں اسی حالت میں سر ٹکائے بیٹھی رہی تھی معاً مجھے احساس ہوا جیسے کوئی مجھے پکار رہا ہو۔ میں ایک دم اپنے خیالوں سے چونکتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنے سامنے زیاد آفاق کو کھڑے دیکھ کر مجھے شدید خجالت کا احساس ہوا۔

"میں کبھی بھی اس شخص کے سامنے اپنی شخصیت کا مثبت پہلو نہیں لا سکتی۔" میں نے شرمندگی سے سوچا۔

"کیا بات ہے آج آپ لنچ کرنے نہیں گئیں۔" وہ نہایت نرم لہجے میں دریافت کر رہا تھا اور مجھ سے اس کا یہ اجنبی انداز ہضم نہیں ہو رہا تھا۔ میں تحیر زدہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے بھوک نہیں تھی۔" وہ منتظر نظروں سے

میری جانب دیکھ رہا تھا اور مجھے جواب دیتے ہی بنا۔

"آپ کو بھوک کیوں نہیں تھی۔" عجیب جرح کرتا انداز تھا۔ مجھے اس کا ہر انداز چونکا رہا تھا۔ وہ نہ صرف لایعنی گفتگو میں مصروف تھا بلکہ برابر مسکرا بھی رہا تھا۔

"ضروری تو نہیں ہے سر! بھوک نہ لگنے کی کوئی وجہ بھی ہو۔" سنجیدہ لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے میں نے قدرے لاتعلقی کا انداز اپنایا تھا۔

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے فوراً" میری رائے سے اتفاق کیا۔

"اور کیسی جا رہی ہے آپ کی یہ جاب؟" اب میں نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے مختصراً" جواب دیا۔ وہ تھوڑی دیر تک بے مقصد انداز میں میرے کیبن کو ناقدانہ انداز سے دیکھتا رہا اور پھر شانے اچکاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اسی پل مسز شیرازی مسکراتے ہوئے میرے سامنے آبیٹھیں۔

"ہوشیار رہنا! روا کی توپوں کا رخ تمہاری سمت ہوا ہی چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے بھنویں اچکائیں۔

"اس نے زیاد آفاق کو تمہارے کیبن سے باہر نکلتے ہوئے جو دیکھ لیا ہے۔ ویسے آپس کی بات ہے محترم مسکرا کس خوشی میں رہے تھے؟" وہ شرارتی انداز میں دریافت کر رہی تھیں۔

"میں نہیں جانتی آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" میں واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ پہلے ہی میں ایم ڈی صاحب کے اس رویے پر کم پریشان نہیں تھی۔ ابھی مسز شیرازی کوئی جواب دیتیں معاً" روا تیر کی طرح میرے کیبن میں داخل ہوئی تھی۔

"سائیٹ کے لیے جو نئے پلانٹ پرچیز کیے گئے ہیں ان کی بیلنس شیٹ تم نے تیار کر لی؟" وہ بہت تیکھے انداز میں مجھ سے دریافت کر رہی تھی۔

"لیکن وہ بیلنس شیٹ فراز نے تیار کرنی تھی، سائٹس کی بیلنس شیٹ وہی تیار کرتا ہے۔" میں نے حتی المقدور اپنے لہجے کو بے تاثر رکھنے کی سعی کی۔

"یہ تمہاری ذمہ داری تھی کہ تم اس سے بیلنس شیٹ تیار کرواتیں۔" مجھے اس کے اس غصے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی تھی مگر اس کے اس انداز نے مجھے مشتعل کر دیا۔

"لیکن میں اس کے لیے تمہارے سامنے جوابدہ نہیں ہوں۔" وہ چند لمحوں تک مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہی اور پھر کوئی جواب نہ ملنے پر پاؤں پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

"واہ بھئی! میرا تو خیال تھا کہ تمہیں صرف گھبرانا اور خاموش رہنا آتا ہے لیکن تم اتنے اچھے طریقے سے جواب دینا بھی جانتی ہو یہ معلوم نہ تھا مجھے۔" مسز شیرازی مجھے سراہ رہی تھیں۔

"مسز شیرازی! میں بڑی سنجیدگی سے یہ جاب چھوڑنے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" حقیقت بھی یہی تھی۔ فراز بشیر کی آر پار کرتی نظریں، روا آفاق کا غصیلا انداز اور اب زیاد آفاق کا مشکوک رویہ یہ سب مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کر رہے تھے۔

"ارے!" مسز شیرازی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "اتنی جلدی گھبرا گئیں۔ ارے ابھی زندگی کا سامنا کرنا ہے تو پھر ایسے لوگوں کو تو فیس کرنا ہی پڑے گا چاہے دل کرے یا نہ کرے۔" ان کا اشارہ یقیناً" روا کی جانب تھا۔

"دراصل قرۃ العین! جس سیٹ پر زیاد آفاق کام کر رہا ہے اس سے پہلے اس سیٹ پر اس کا بڑا بھائی عباد آفاق بیٹھا کرتا تھا جب سے عباد آفاق نے اپنی نئی فرم لانچ کی ہے تب سے زیاد آفاق نے اس فرم کی تمام تر ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی ہوئی ہے۔ چونکہ تعلیم سے فراغت کے فوراً" بعد ہی اس نے آفس کو جوائن کر لیا تھا تبھی وہ اسٹاف کے تمام ممبران سے غیر معمولی نرمی روا رکھے ہوئے ہے۔ شاید اس کی فطرت ہی ایسی رہی ہو۔ وہ سختی کا قائل نہیں ہو گا۔ روا نے اس کی اس نرمی کا کچھ غلط ہی مطلب نکالا ہوا ہے۔ بیچاری روا!" مسز شیرازی نے زیاد آفاق کی ہسٹری

کنگالتے ہوئے ردا کا نام خاصے متاسفانہ انداز میں لیا۔

"ردا کا بھی کوئی قصور نہیں' اس نے پسند بھی ایک ایسے بندے کو کیا ہے' جو یہ جاننا ہی نہیں چاہتا کہ اس کے پیچھے کون پاگل ہو رہا ہے۔ خاصا لاپروا قسم کا لڑکا ہے یہ زیاد آفاق۔" میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مسز شیرازی کو دیکھ رہی تھی۔ اب مجھے اصل معنوں میں ردا کی خفگی کا اور اک ہوا تھا۔ ردا میرے بارے میں کیا سوچ رکھتی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اسے اس پر غصہ آنے لگا تھا' ہمیشہ کی طرح وہ اس بار بھی نادیہ کے دس منٹ کے انتظار کے جھانسے میں آ کر مسلسل آدھے گھنٹے سے کاریڈور کی بیرونی سیڑھیوں پر کھڑی اس کی منتظر' کوفت و بے زاری کا شکار ہو رہی تھی۔ وہ اسے دس منٹ کا کہہ کر بی بی اے ڈیپارٹمنٹ کی طرف گئی تھی۔ آج تو سارہ بھی غیر حاضر تھی ورنہ ہو سکتا تھا کہ اس کی موجودگی میں وہ نادیہ کی اس لاپروائی کو نظر انداز کر دیتی مگر اب سارہ کی عدم موجودگی میں وہ نادیہ کی اس حرکت کو سرسری سا نہیں لے سکتی تھی۔ اپنے غصے کو کسی نہ کسی طرح کنٹرول کرتے ہوئے وہ سیمینار لائبریری میں آ کر اپنی نامکمل اسائنمنٹ مکمل کرنے لگی۔

سر عباسی کا دیا گیا یہ اسائنمنٹ حقیقتاً" اسے رلوا رہا تھا۔ اب نادیہ کی طرح اس کے کسی بھائی نے ایم بی اے تو کیا ہوا نہیں تھا کہ وہ ان سے ہی کوئی مدد لے لیتی۔ جو کرنا تھا اسے خود ہی کرنا تھا۔ پچھلے دو روز سے وہ اسی اسائنمنٹ پر کام کر رہی تھی' کام کیا کر رہی تھی خوار ہو رہی تھی۔ نادیہ اور سارہ کو اس لیے بھی اس اسائنمنٹ کی فکر نہیں تھی کہ وہ کام کو آخری لمحات تک تکمیل کرنے کی عادی تھیں۔

سر عباسی نے جب انہیں مینجمنٹ اسٹریٹیجک کا یہ اسائنمنٹ دیا تھا تو انہوں نے حسب توقع اپنے پسندیدہ اسٹوڈنٹ کا نام لینا از حد ضروری سمجھا تھا۔

"جتنے بھی اسٹوڈنٹس نے مجھے اس ٹاپک پر اسائنمنٹ سب منٹ کروائے ہیں ان سب میں اب تک سلجوق عمر کا اسائنمنٹ سب سے اچھا اور امپریسو رہا ہے۔ بہت کم اسٹوڈنٹس ایسے ہوتے ہیں جو کبھی بھی اپنا آپ اپنے ٹیچرز کو بھولنے نہیں دیتے۔ لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ کم از کم کوئی ایک تو ایسا اسٹوڈنٹ ہو جس کا اسائنمنٹ سلجوق عمر سے بہتر ہو۔" سر عباسی نے مسکراتے ہوئے کھلا چیلنج ان سب کے سامنے رکھ دیا تھا' جسے حسب توقع سب سے پہلے مائرہ نے قبول کیا تھا۔

"سر اس بار یہ ریکارڈ میں توڑوں گی اور آپ بھی اب سلجوق عمر کا نام بھول کر میرا نام یاد رکھنے کی پریکٹس کریں۔" وہ بڑے یقین سے کہہ رہی تھی۔ جواباً" سر عباسی مسکرانے لگے۔

اس روز نادیہ سر عباسی کی کلاس لیٹ ہو جانے کی وجہ سے نہیں لے سکی تھی ورنہ امکان غالب تھا کہ وہ مائرہ سے پہلے اس چیلنج کو قبول کرتی۔ ویسے بھی چیلنج قبول کرنا اور شرطیں لگانا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔

وہ جب سے آئی بی اے میں آئی تھی اس نے ہر ایک کی زبان پر سلجوق عمر کا نام ایک کلمہ کی طرح سنا تھا' نہ صرف ٹیچرز' اس کی ذہانت اور صلاحیتوں کے معترف پائے جاتے تھے بلکہ لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد بھی اس کے لیے آہیں بھرا کرتی تھی۔ حالانکہ وہ اسی سال I.B.A سے پاس آؤٹ کر گیا تھا۔ خود ان کی اپنی کلاس کی لڑکیاں سلجوق عمر کی دیوانی تھیں۔ بختاور یہ نکتہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ فریش اسٹوڈنٹس اسے کیسے جانتے تھے اور دوسرے اسٹوڈنٹس پر ہی کیا موقوف خود نادیہ کئی بار اسے دیکھنے کی سعادت حاصل کر چکی تھی۔

"وہ چیز ہی ایسی ہے' تم دیکھو گی تو تم بھی اس کے عشق میں گرفتار ہو جاؤ گی۔" ایک بار اس نے نادیہ کے سامنے لڑکیوں کی اس قدر دیوانگی کا استعجاب سے تذکرہ کرتے ہوئے استفسار کیا تھا تب نادیہ نے آنکھیں بند

کرتے ہوئے گویا اس کی شخصیت کا تصور کرتے ہوئے جواب دیا۔

"ونجی سے کیا مراد ہے؟" بختاور نے کڑے انداز میں نادیہ کی کا!اس بات کی جواب" نادیہ کھسیانے سے انداز میں ہنسنے لگی۔

"چلو آؤ میں تمہیں سلجوق عمر کو دکھاتی ہوں پھر تم خود فیصلہ کرنا کہ وہ کس قابل ہے۔" نادیہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے وہ کسی نمائش میں لگی پینٹنگ کے بارے میں بات کر رہی ہو۔

"مجھے کسی ایسے لڑکے کو دیکھنے کا قطعی شوق نہیں ہے جو اپنی پرسنالٹی کیش کروانے کی خاطر یہاں آتا ہو۔ تمہاری جیسی لڑکیاں بھی ایسے لڑکوں کو سر پر چڑھا لیتی ہیں اور وہ اپنے آپ کو نامعلوم کون سی دنیا کی مخلوق سمجھنے لگتے ہیں۔" وہ جلے کٹے انداز میں بولی جواب میں نادیہ کا انداز صفائی دینے والا تھا۔

"ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے' سلجوق عمران تمام لڑکوں سے مختلف ہے جن کا تم ذکر کر رہی ہو۔"

"مختلف!" بختاور نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ سارہ ان دونوں کی بحث سے قطع نظر اپنے سامنے رکھے نوٹس پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔

درحقیقت بختاور کو سلجوق عمر کا نام سن سن کر' اس کی پرسنالٹی کے قصے سن سن کر اس نادیدہ شخص سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ پورے I.B.A میں اس شخص کا ذکر ایک وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا اور نادیہ کا یہ آتش شوق اسے زچ کر گیا تھا۔ زچ تو وہ اب بھی ہو رہی تھی۔ اس کا اسائنمنٹ مکمل ہو چکا تھا اور نادیہ کی دور دور تک کوئی خبر نہیں تھی۔ وہ نئے سرے سے کھولنے لگی۔

سیمینار لائبریری سے اب اس نے کیفے ٹیریا کی راہ لی تھی غالباً" یہ امید بھی ہمراہ تھی کہ شاید نادیہ کو یاد آ ہی جائے کہ وہ اس کا انتظار کر رہی ہے۔ کینٹین والا لڑکا پیپسی کا کین اس کے سامنے رکھتے ہوئے مزید آرڈر لینے لگا۔

"نہیں! اور کچھ نہیں چاہیے۔" وہ بدستور سامنے دیکھتے ہوئے بولی۔ معاً" اس کی نظر دور سے آتی عجلت میں قدم اٹھاتی نادیہ پر پڑی۔ اپنے چہرے پر لاتعلقی کے لوازمات سجاتے ہوئے وہ دوسری سمت دیکھنے لگی۔

"تم یہاں بیٹھی مزے اڑا رہی ہو اور میں تمہاری تلاش میں نجانے کہاں کہاں کی خاک چھانتی پھر رہی ہوں۔" الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے' فوری طور پر بختاور کے ذہن میں اس محاورے کا مطلب پوری صحت کے ساتھ آشکار ہوا تھا۔

"جانتی ہو آج میں تمہارے لیے ایک ایسی خبر لائی ہوں جسے سن کر تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔" اس کی آواز تمام تر جوش و خروش لیے ہوئی تھی مگر نادیہ کے جوش و خروش سے بے نیاز وہ اپنے ہینڈ بیگ کو متلاشی انداز میں کھنگال رہی تھی۔

"تم سن رہی ہو نا؟" نادیہ کو اس کا انداز کھٹکا۔ جواب اب بھی ندارد تھا۔ تب پہلی بار نادیہ کو بختاور کی خفگی کا ادراک ہوا۔

"آئی ایم سوری بخت!" اس نے معذرت خواہانہ انداز اپنایا۔ جواب میں وہ ایک دم طنزیہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔

"اوہو! تو دس منٹ گزر گئے' مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" نادیہ اس کے اس انداز پر خجالت آمیز انداز میں مسکرانے لگی۔

"دراصل سمیرا کے ساتھ باتوں میں یاد ہی نہیں رہا کہ میں تمہیں انتظار کرنے کا کہہ کر آئی ہوں' وہ تو سمیرا کی کلاس شروع ہونے والی تھی تب مجھے یاد آیا۔"

"کہ میں اب بھی کسی ڈفر کی طرح تمہارا انتظار کر رہی ہوں گی۔" نادیہ کا نادِل دیتا لہجہ اسے اندر سے سلگا گیا تھا۔ I.B.A میں آنے کے بعد نادیہ کے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے تھے۔ پڑھائی کے علاوہ آج کل وہ نئی نئی دوستیاں پالنے میں مصروف تھی کہاں تو اس کی کسی کے ساتھ بنتی نہیں تھی اور اب ہر روز ایک نئی لڑکی کا نام اس کی زبان پر ہوا کرتا تھا۔ نادیہ بختاور کی اس قدر ناراضی پر پریشان سی ہو گئی تھی تاہم وہ ایک بار پھر معذرت کرنے لگی اور پھر نادیہ کو زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ اگلی بار ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہ کرنے کا وعدہ

لے کر بختاور نے اس کی معذرت قبول کی تھی۔

"توبہ ہے بختاور! تم کتنی اسمارٹ ہو گئی ہو' ایک لمحہ کے لیے تو تم نے مجھے پریشان ہی کر دیا تھا' خیر چھوڑو ان باتوں کو' آج کی تازہ خبر ملاحظہ کرو اور ہاں بھی ذرا کلیجہ تھام کر ہو سکتا ہے اس کے بعد تمہارے ہوش اڑ جائیں۔" بختاور بغیر کسی تجسس میں مبتلا ہوئے اسے غیر دلچسپی سے دیکھنے لگی۔

"آج کل مائرہ بڑی اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔" نادیہ تمہیدی انداز میں گویا ہوئی۔ بختاور نے اسے متاسف نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کی سوئی مائرہ سے آگے کہیں جاتی ہی نہیں تھی۔ اب تو اسے مائرہ کے نام سے بھی چڑ ہونے لگی تھی۔

"محترمہ مائرہ گردیزی کو عشق کا بخار چڑھ گیا ہے۔" اس بار بختاور نے بے یقینی سے نادیہ کو دیکھا تھا یہ انکشاف ایسا نہیں تھا جو اسے حیرت سے دوچار نہ کرتا اور اس بات کا یقین کرنا دشوار ہی نہیں دشوار ترین بھی تھا۔ مائرہ جیسی لڑکی کو کسی سے عشق ہو سکتا تھا یہ ایک ناممکن سی بات تھی۔ اس نے پورے آئی بی اے کے لڑکوں کو مائرہ کے پیچھے پاگل ہوتے دیکھا تھا اور یہ بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکے کوئی ایسے ویسے تھے۔ مگر شاید مائرہ کے نزدیک ان لڑکوں کی کوئی ویلیو بھی نہیں تھی۔ جو اس نے کبھی انہیں گھاس تک نہیں ڈالی تھی۔ حالانکہ بختاور کو وہ لڑکے اچھے خاصے لگا کرتے تھے اور اب مائرہ کا کسی کے عشق میں گرفتار ہو جانا' بختاور کے لیے باعث اچنبھا تھا' یقیناً" وہ کوئی زمینی مخلوق کے عشق میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔

بختاور پیپسی کے سپ لیتے ہوئے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں کیوں مجھے اس بات پر یقین نہیں آ رہا۔"

"یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا۔" نادیہ پرجوش لہجہ میں بولی۔ "لیکن پورے آئی بی اے میں یہ بات پھیلی ہوئی ہے اور تو اور سیمرا نے مجھے حیرت سے دیکھا تھا' بقول اس کے کہ میں اس کی کلاس فیلو ہونے کے باوجود اس بات سے بے خبر ہوں اور اس کے بعد اس نے ایک محاورہ بھی بولا تھا جس میں کچھ چراغ کا ذکر تھا۔"

"ہائے واوے یہ قرعہ کس خوش نصیب کے نام کھلا ہے۔" بختاور نے ایک بار پھر پیپسی کا سپ لیا۔

"سلجوق عمر کے۔" نادیہ نے مختصراً کہا۔ اسے ایک دم اچھو لگ گیا۔

* * *

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر کھانسنے لگی۔ میں جو بے دھیانی سے اپنے کارن فلیکس کے باؤل میں مسلسل چمچہ چلا رہی تھی ایک دم اٹھ کر مومو کی پشت سہلانے لگی۔ چند سیکنڈز کھانسنے کے بعد مومو کا سانس اپنے اعتدال پر آ چکا تھا۔ مومو کی غیر متوقع کھانسی نے بابا اور ارتضٰی کے مابین ہونے والی گفتگو میں ایک پل کا تعطل پیدا کیا تھا مگر پھر یہ گفتگو ایک بار پھر وہیں سے شروع ہو چکی تھی۔ وہ مجھے مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھے اور میں ان کے اس دانستہ گریز سے جی بھر کر محظوظ ہو رہی تھی۔

وہ ارتضٰی سے اس کی پڑھائی کے متعلق استفسار کر رہے تھے' ارتضٰی بڑی سنجیدگی اور محتاط انداز میں جواب دے رہا تھا۔ حالانکہ میں بخوبی جانتی تھی کہ آج کل اس کا دھیان پڑھائی کے علاوہ ہر چیز پر مرتکز تھا۔ بی بی اے بھی اس نے ایسے ہی لاپروا انداز میں بمشکل کلیئر کیا تھا۔ اسے اپنی پڑھائی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی یہ تو میں تھی جو اس کے غم میں گھل رہی تھی۔ کل رات بھی میں نے پوری رات جاگ کر اس کی اسائنمنٹ مکمل کی تھی جسے اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی وہ بڑے مزے سے سوتا رہا تھا۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے میری طبیعت پر عجیب سی کسل مندی طاری تھی' آفس جانے کا بالکل موڈ نہیں بن رہا تھا۔ ناشتا بھی میں اسی سستی کے ساتھ کر رہی تھی۔ مگر پھر کچھ سوچ کر میں نے آفس جانے کی تیاری شروع کر دی۔

آفس آنے کے چند منٹ بعد ہی میرا بلاوا آ گیا تھا' اب مجھے زیاد آفاق کا سامنا کرنا تھا۔ گزشتہ چند روز سے مجھے زیاد آفاق کا رویہ چونکا رہا تھا۔ وہ جس طرح میری

کارکردگی کو سراہنے لگا تھا' بلاوجہ میرے روم میں آنے جانے لگا تھا اور کئی نہیں کئی بار اپنے ساتھ لنچ کی دعوت دے چکا تھا۔ میری چھٹی حس بار بار الارم دے رہی تھی۔ ریوالونگ چیئر کے ساتھ ٹیک لگائے' اپنے چہرے پر نرم تاثرات سمیٹے وہ یقینی طور پر میرا منتظر تھا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ مسکراتے ہوئے مجھ سے دریافت کر رہا تھا اور میں حتی الامکان اپنے لہجے کو تلخ ہونے سے روکنے کی سعی میں مبتلا تھی۔

"ٹھیک ہوں۔"

"مس قرۃ العین! سائٹس کی بیلنس شیٹ مجھ تک نہیں پہنچی' کیا کوئی پرابلم ہے؟" وہ بدستور نرم لہجہ اپنائے ہوئے تھا۔

"وہ سر!" مجھے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں کیسے اپنی پرابلم اس سے شیئر کروں۔ اب وہ معیز تو تھا نہیں جو میرے ہر احساس کو میرے چہرے سے پڑھ لیتا۔ مگر اب اس مسئلے کے بارے میں اس سے ڈسکس کرنا بھی ناگزیر ہو گیا تھا۔ اب توفراز نے مجھے انٹرکام پر بھی تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے رپورٹ طلب کیا کرتی میں تو اس سے چھپتی پھر رہی تھی۔ پتا نہیں یہ میرے بارے میں کیا سوچے لیکن اب میں اس لوفر شخص کی حرکتوں کو برداشت کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ میں نے پرعزم انداز میں سوچا اور پھر بغیر کسی تمہید کے سب کچھ اس کے سامنے گوش گزار کر دیا اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

"یہ بات آپ نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟" وہ فہمائشی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں اضطراری انداز میں اپنی انگلیاں مسل رہی تھی۔ میرے پاس اس بات کا کوئی جواب تھا ہی نہیں۔

"خیر اب آپ اپنے آفس میں جائیں!" وہ ایک دم اپنی چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر سرخی دکھائی دی تھی۔ اپنے آفس کا رخ کرتے ہوئے میں اپنے اس کارنامے پر خاصی طمانیت محسوس کر رہی تھی۔ کافی دیر تک میں آفس میں کسی غیر متوقع واقعے کی منتظر رہی۔ اس سلسلے میں سوچ سوچ کر میرا دماغ کافی دیر تک پراگندہ رہا۔ مگر پھر اپنے سامنے رکھیں فائلز پر نظر پڑتے ہی میں نے دانستہ ہر خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میری مصروفیت کے پیش نظر مسز شیرازی نے لنچ ٹائم میں لنچ میرے آفس میں ہی بھیج دیا تھا۔ میں نے ممنون نظروں سے انہیں دیکھا اور وہ مسکراتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

مسلسل کمپیوٹر کے سامنے بیٹھ کر مجھے گردن میں تناؤ کا احساس ہوا تھا۔ اس تناؤ کو رفع کرنے کی خاطر میں نے میز سے سر ٹکا دیا تھا۔ ایک پل کے لیے مجھے سکون کا احساس ہوا۔ رات بھر کی شب بے داری اور آج کے پورے دن کی مصروفیت کب نیند میں ڈھلی مجھے پتا ہی نہیں چلا اور جب پتا چلا تو میں نے اپنے سامنے زیاد آفاق کو بیٹھے پایا تھا۔ میں بوکھلاہٹ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ ابھی بھی اپنے دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں کو اپنی ٹھوڑی کے نیچے جمائے دلچسپ نظروں سے میری جانب دیکھنے میں مصروف تھا۔

"ارے! آپ تو اٹھ گئیں۔" مجھے اٹھتے دیکھ کر وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "ویسے میں نے پوری کوشش کی تھی کہ آپ کی نیند میں کوئی خلل پیدا نہ ہو۔ پچھلے دو گھنٹوں سے میں اسی پوزیشن میں بیٹھا رہا تھا۔ جس پوزیشن میں آپ نے مجھے دیکھا۔"

"دو گھنٹے!" زیر لب جنبش کرتے ہوئے میں نے بے اختیار اپنی رسٹ واچ میں جھانکا۔ شام کے پانچ بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ میں مسلسل چار گھنٹوں سے سو رہی تھی۔ میں نے بے یقینی سے گلاس وال کے پار جھانکا' تمام اسٹاف کب کا جا چکا تھا۔ اب مجھے مسز شیرازی پر بھی غصہ آنے لگا' وہ تو ہر پانچ منٹ بعد میرے کیبن میں آیا کرتی تھیں کیا وہ مجھے جگا نہیں سکتی تھیں۔ خجالت آمیز انداز میں اپنی چیزیں سمیٹتے ہوئے میں اپنے اس عمل میں مسز شیرازی کو بھی غیر دانستہ طور پر شامل کر گئی تھی۔ وہ اب بھی مسکراتی نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔

"شاید تمہیں میرا اس طرح' تمہارے کیبن میں

آنا ناگوار گزرا ہے۔ اینجولی' تم سو رہی تھیں اور تمام اسٹاف جا چکا تھا اور اگر میں یونہی نہ آتا تو ..... خیر فارگیٹ اٹ' اگر تمہیں میرا یہ طرز عمل برا لگا ہے تو آئی ایم سوری۔'' میرے سپاٹ چہرے نے اسے سنجیدہ کر دیا تھا۔ آپ سے تم تک کا سفر اس نے کتنی جلدی طے کر لیا تھا میں صرف حیران ہی ہو سکتی تھی۔

''سوری فار واٹ سر! آپ کا آفس ہے اور آپ کبھی بھی کہیں بھی جا سکتے ہیں۔'' دھیمے انداز میں کہتے ہوئے میں دروازے کی اور بڑھی۔

''چلو میں تمہیں تمہارے گھر تک ڈراپ کر دیتا ہوں۔'' عاونا'' اپنی پینٹ کی جیبوں کو تھپتھپاتے ہوئے اس نے پیشکش کی۔

''نو سر! آپ کو تکلیف ہو گی' میں چلی جاؤں گی۔'' متذبذب انداز میں کہتے ہوئے میں دانستہ اس سے نظریں چرا رہی تھی۔

''تکلیف کی کیا بات ہے' میں تمہیں گاڑی میں لے کر جا رہا ہوں۔'' وہ متبسم سا گویا ہوا۔

''لیکن سر میرا گھر آؤٹ آف دا وے ہے۔'' ہم یونہی چلتے چلتے پارکنگ میں آ گئے تھے۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ میں کیسے اسے باز رکھنے کی سعی کروں۔ جو کچھ میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی اور محسوس کر رہی تھی میں اس کے منہ سے سننا نہیں چاہتی تھی میں تو فی الحال یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی اس کی نظروں سے عیاں ہوتے عجیب سے احساسات سے دور مگر نجانے کیوں وہ میری ہر کوشش پر پانی پھیر رہا تھا۔

''مس قرۃ العین! اگر میں آؤٹ آف دا وے جانا چاہتا ہوں تو اس میں آپ کو کیا تکلیف ہے۔'' وہ زچ ہوتے ہوئے بولا۔ میں اب مزید اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔

''میں آپ کے ساتھ جانا نہیں چاہتی۔'' دو ٹوک انداز میں منع کرتے ہوئے میں نے ..... اس کے چہرے کو ایک دم سنجیدہ ہوتے دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ اب میں آرام سے ٹیکسی سے چلی جاؤں گی لیکن اس کے جرح کرتے انداز نے میرے متحرک قدم ساکت کر دیے تھے۔

''کیوں؟'' میرے سامنے اس وقت زیاد آفاق کی بجائے معیز آ کھڑا ہوا تھا۔

''کیوں تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتیں۔'' وہی لب ولہجہ' وہی انداز' وہی تیور۔ میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ مجھے اپنا چہرہ تاریک ہوتا محسوس ہوا تھا۔

''کیا تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں ہے یا پھر تمہارا خیال ہے کہ میں کوئی راہ چلتا شخص ہوں جو تمہیں بلاوجہ لفٹ کی آفر دے رہا ہے۔'' زیاد آفاق کی آواز مجھے کرب کی گہری دلدل سے کھینچ لائی تھی مگر حقیقت یہ تھی کہ سامنے کھڑا یہ شخص بھی میرے کرب اور اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ اس کا جرح کرتا انداز میرے لیے پل صراط بن گیا تھا۔ کیوں ہر کوئی میرے لیے میرے راستہ میں پل صراط حائل کر دیتا ہے؟ اس پل صراط سے نجات کا بس ایک ہی ذریعہ تھا کہ میں اسے اگنور کروں اور اب میں وہی کر رہی تھی۔

''تم نے جواب نہیں دیا؟'' وہ مستفسرانہ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گہرا سانس خارج کرتے ہوئے زیاد آفاق کو دیکھا۔

''مجھے کسی پر بھی اعتبار نہیں ہے نہ آپ پر اور نہ ہی اپنے آپ پر۔'' دھیمے انداز میں کہتے ہوئے میں نے اپنے قدم آگے کی طرف بڑھا دیے۔

''اس ٹیکسی ڈرائیور پر اعتبار ہے تمہیں۔'' میرے قدم رک گئے میں ایک بار پھر مڑ کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔

''میں اعتبار کے رشتے بنانے کے لیے نہیں' بلکہ گھر جانے کے لیے ٹیکسی پر جا رہی ہوں۔ کم از کم وہ ٹیکسی ڈرائیور مجھ سے میرے بارے میں کوئی سوال تو نہیں کرے گا' مجھ سے یہ دریافت تو نہیں کرے گا کہ میری ہابیز کیا ہیں۔ مجھے کیا پسند ہے' کیا ناپسند ہے' میرا اسٹار کیا ہے' میرے گھر میں کتنے افراد ہیں اور۔''

''اور یہ کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔'' میری بات قطع کرتے ہوئے اس نے بڑی سنجیدگی سے اس ایک فقرہ کا اضافہ کیا تھا۔ میں ایک دم چونک کر پھٹی پھٹی

آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔
"تمہیں یقین ہے نا وہ تم سے یہ نہیں کہے گا' ان لیکٹ میں تم سے یہی کہنے والا تھا۔" میں ہونٹ بھینچ کر اپنی اندرونی کیفیات پر قابو پانے کی سعی کر رہی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ مجھ سے اس انداز میں اظہار کرے گا۔
"تمہیں نہیں لگتا قرۃ العین! کہ میرے جیسا شخص تم سے محبت کر سکتا ہے۔" وہ غالباً" میری خاموشی کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کر رہا تھا' شاید وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ مجھ پر شادی مرگ کی سی بے یقینی طاری ہو۔ وہ چند قدم اٹھاتا میرے سامنے آکھڑا ہوا۔
"جب پہلی بار تمہاری مجھ سے مڈبھیڑ ہوئی' آئی ایم سوری میں اسے مڈبھیڑ ہی کہوں گا۔ تم نے جس طرح مجھ پر چڑھائی کی تھی' جس طرح مجھ پر الزامات عائد کیے تھے اس وقت مجھے تم پر شدید غصہ آیا تھا۔ مجھے تم خود پسند اور پراؤڈ قسم کی لڑکی لگی تھیں۔ تم نے مجھے کچھ کہنے سننے کا موقع ہی نہیں دیا تھا' یہ تو بہت بعد میں جا کر مجھے پتا چلا کہ وہ تمہاری خود پسندی نہیں بلکہ تمہارا خوف تھا جسے تم خود پسندی کے پردے میں چھپا رہی تھیں۔" وہ یقیناً" فراز بشیر والے واقعہ کی روشنی میں میری ذات کا تجزیہ کر رہا تھا۔
"میں نہ تو خود پسند ہوں اور نہ ہی مجھے کسی قسم کا خوف لاحق ہے۔" میں نے جیسے تردید کرنے کی ہلکی سی کوشش کی تھی۔ مگر زیاد آفاق کی مسکراہٹ اس چیز کی بھرپور دلالت کر رہی تھی کہ وہ میرے اس دعوے سے نہ تو مرعوب ہوا تھا اور نہ ہی متفق۔
"خیر یہ تو بہت بعد میں جا کر مجھے معلوم ہوا تھا کہ میں تمہیں ڈانٹ نہیں سکتا۔" وہ بے بسی سے کہتے ہوئے جیسے اپنی کسی کمزوری کا اظہار کر رہا تھا اور اس کے چہرے پر کسی قسم کی مایوسی کا شائبہ تک نہ تھا۔ میرے لیے جیسے ایک پل بھی ٹھہرنا دشوار ہو گیا تھا۔ میں اسے کسی بھی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ میری زندگی اتنی تلخ ہو چکی تھی کہ اب کسی بھی صورت اس قسم کے احساسات کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔
میں تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ میرے اس طرز عمل نے اسے کس حد تک مایوس کیا تھا میں اس بارے میں ابھی سوچنا نہیں چاہتی تھی' زندگی میں ابھی بہت سی انہونیاں ہونا باقی تھیں۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں ابھی بہت سی انہونیاں ہونا باقی تھیں' ہاں یہ ایک انہونی ہی تو تھی کہ اس نے نادیہ کو مائرہ کے گروپ کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ مائرہ کے ساتھ بڑے ایکٹو انداز میں محو گفتگو تھی۔
"یہ نادیہ کو کیا ہوا ہے۔ یہ مائرہ کے ساتھ کیا کر رہی ہے۔" سارہ اچنبھے کے ساتھ گویا ہوئی۔ اس کے انداز میں سراسر بے یقینی تھی۔ وہ خود اپنی جگہ حیران تھی۔
"زہر لگتی ہے یہ لڑکی مجھے۔" ہر بار مائرہ پر نظر پڑتے ہی نادیہ بے اختیار کہا کرتی تھی اور اب اسی زہریلی لڑکی کے ساتھ بڑے خوشگوار انداز میں گفتگو فرمائی جا رہی تھی۔
"واقعی بعض لوگ کسی معمہ کی طرح ہوتے ہیں کب کیا کہہ دیں' کیا کر دیں آپ ان کے بارے میں کوئی حتمی رائے قائم نہیں کر سکتے۔"
"میری تو یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ وہ مائرہ لوگوں کے ساتھ ایسی کون سی گپیں لڑا رہی ہے کہ اسے ہم تک یاد نہیں آرہے۔" سارہ کی آواز غصہ اور صدمہ کی سی کیفیت لیے ہوئے تھی۔ نادیہ سے اس کی خفگی اس کے چہرے سے ہی عیاں تھی۔
سر عباسی کی کلاس لیتے ہوئے انہیں تھوڑا بہت یقین تھا کہ نادیہ یہ کلاس بنک نہیں کرے گی۔ مگر جیسا کہ آج سب کچھ توقع کے خلاف ہو رہا تھا لہٰذا وہ نہیں آئی اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ مائرہ نے بھی کلاس اٹینڈ نہیں کی تھی۔
"بختاور! اب مجھ سے صبر نہیں ہو رہا۔ چلو اس کے پاس چلتے ہیں' پتا نہیں وہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔"

وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ نادیہ ان کے صبر کو کب تک آزماتی ہے۔ پھر انہیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔
وہ بڑے نارمل انداز میں ان کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔
"کہاں تھیں تم؟" سارہ نے بھنویں اچکاتے ہوئے سوال کیا۔ وہ ان دونوں کی سنجیدگی کے برعکس کسی خوش کن خیال میں ڈوبی ہوئی لگ رہی تھی اور چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اپنی خوشی کا اظہار کرنا ضروری سمجھا تھا۔
"آج میں بہت خوش ہوں۔"
"زیادہ عرصہ خوش نہیں رہ سکو گی۔" بختاور جو بڑی خاموشی اور صبر سے اس کا جائزہ لے رہی تھی اس کے اس اظہار پر جل کر بولی۔
"کیا مطلب؟" نادیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"مطلب یہ کہ مائرہ سے دوستی کسی کسی کو راس آتی ہے۔" سارہ نے جلے کٹے انداز میں کہا۔
"دوستی! اور مائرہ سے، ڈیسیپ کر کون رہا ہے؟" ایک ساتھ ہی اس نے تین لہجے اختیار کیے تھے۔ استعجاب، ناگواریت اور آخر میں معصومانہ سوالیہ استفسار، دونوں کو ہی اس کے اس انداز پر طیش آیا تھا اور پھر سارہ اس پر پھٹ پڑی تھی۔
"اس کے ساتھ بیٹھ کر تم کشمیر اور فلسطین کے مسائل ڈسکس کر رہی ہوگی کیونکہ یہ مسائل اجتماعی تفکر کے متقاضی جو ہیں۔" جواب میں وہ ایک بھرپور قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی اور پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے بولی۔
"اوہو! تو اس کا مطلب ہے تم نے مجھے اور مائرہ کو ایک ساتھ باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔ تبھی میں کہوں مجھے تم دونوں کے چہروں پر جیلسی کیوں نظر آ رہی ہے۔"
"جیلسی مائی فٹ!" سارہ نے دانت کچکچائے۔
نادیہ کی مشکوک قسم کی ہنسی بختاور کی چھٹی حس کو بے دار کرنے کا موجب بنی تھی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے اپنے انجانے خدشات کو لفظوں کا روپ دیا تھا۔
"نادیہ! تم نے مائرہ کے ساتھ کوئی شرط نہیں لگائی نا؟"
بار بار ذہن میں فقط ایک خواہش ابھر اور ڈوب رہی تھی کہ نادیہ اسے جھٹلا دے کہہ دے کہ اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ مگر نادیہ کے جواب نے اس کے بدترین اندیشوں پر مہر ثبت کر دی تھی۔
"میں لگانا نہیں چاہ رہی تھی بخت! مگر اس کا ہر ہر انداز مجھے ایسا کرنے پر اکسا رہا تھا۔" وہ مجرمانہ انداز میں جیسے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہی تھی۔
"میں صرف ایک بار مائرہ کو ہرانا چاہتی ہوں، اسے شکست دیکھنا چاہتی ہوں۔ صرف ایک بار اسے احساس دلانا چاہتی ہوں کہ میرے نزدیک نہ تو اس کی خوب صورتی کی کوئی ویلیو ہے اور نہ ہی اس کی ذہانت کی۔"
مائرہ کا بھوت اس کے سر سے نہیں اترا تھا وہ اب بھی اس کے سر چڑھ کر بول رہا تھا۔
"ہو سکتا تھا کہ میں تمام عمر ایسا نہ کر پاتی اگر وہ ناممکن جیسا لفظ استعمال نہ کرتی جسے غیر ارادی طور پر میں نے اس کے منہ سے سنا تھا اور ارادتاً میں اپنے قدم آگے بڑھا نہیں پائی تھی۔ ایک پل کے لیے میں ٹھٹھک گئی تھی مجھے حیرت ہو رہی تھی لیکن ساتھ ہی مجھے ہنسی بھی آ رہی تھی۔ حیرانگی مجھے اس بات پر ہو رہی تھی کہ میں نے ایک ایسی لڑکی کے منہ سے "ناممکن" جیسا لفظ سنا تھا جو یہ کہتی پھرتی تھی کہ یہ لفظ اس کی ڈکشنری میں نہیں ہے اور آج یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ وہ نپولین جیسا بننا تو چاہتی ہے مگر بن نہیں سکی اور ہنسی مجھے اس بات پر آئی کہ اس نے اپنی شکست کا اظہار کرتے ہوئے ایک پل کا بھی تامل نہیں کیا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ اسے آسانی سے ہرایا جا سکتا ہے۔" وہ دونوں اس بات کی منتظر تھیں کہ وہ انہیں شرط کی نوعیت کے بارے میں بتائے گی مگر اس کی تو یہ تقریر ختم ہونے کا نام بھی نہیں لے رہی تھی۔
"جب میں نے اسے کہا کہ سپر جینئس لڑکی جس نے زندگی میں صرف جیتنا سیکھا ہے، چیلنج قبول کرنا جس کا من پسند مشغلہ ہے، اس کے منہ سے ناممکن جیسا لفظ سننا کچھ..... عجیب سا لگتا ہے، تو پتا ہے اس

نے کیا جواب دیا ہے؟" وہ تائید طلب نظروں سے ان دونوں کی سمت دیکھنے لگی جو اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھیں اور وہ ان نظروں سے بے نیاز اپنی کہے جا رہی تھی۔

"اس نے کہا کہ وہ جھوٹی شیخی نہیں بگھارتی' جو چیلنج قبول کرتی ہوں اسے جیت کر دکھاتی ہوں۔ اور اگر نہ کر سکوں اس کے قریب بھی نہیں جاتی یو نو! وہ کہتی ہے دنیا میں سب کچھ کرنا ممکن نہیں ہے۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔

"اس لیے تو بڑی آسانی سے کہتی پھرتی ہے کہ وہ کبھی نہیں ہاری۔" اس کا لہجہ استہزا کا عنصر لیے ہوئے تھا۔

"خیر ہر شخص اپنے اپنے اصولوں کے تحت زندگی کو متعین کرتا ہے اب مائرہ کا نظریہ میرے نزدیک عجیب اور غیر منطقی ہو سکتا ہے لیکن مائرہ کے لیے نہیں اور بختاور تم تو مجھے بچپن سے جانتی ہو کہ میرے ساتھ معاملہ اس کے برعکس ہے جس چیز کے ساتھ ناممکن لفظ لگ جائے وہ میرے لیے چیلنج بن جاتا ہے اور جب یہ سب میں نے مائرہ کو بتایا تو اس کے چہرے کے رنگ دیکھنے سے تعلق رکھتے تھے' آفٹر آل میں نے اس کی دوستوں کے سامنے اس کا خود ساختہ بھرم جو توڑ دیا تھا۔"

اپنے نظریات کی ترسیل کے بعد نادیہ نے ان کے چہرے پر متوقع جوش و خروش عنقا پا کر حیرت سے دریافت کیا تھا۔

"تم دونوں کو کیا ہوا' تمہاری شکلیں کیوں لٹکی ہوئی ہیں۔"

"یہ تم ہم سے پوچھ رہی ہو کہ ہماری شکلیں کیوں لٹکی ہوئی ہیں۔" نادیہ کے تجاہل عارفانہ اور بدلتے انداز نے بختاور کو تپا دیا تھا۔ نادیہ کا مائرہ سے شرط لگانے کا مطلب تھا کہ اب انہیں اپنی پڑھائی پر توجہ دینے کی بجائے اس لگائی گئی شرط کو نادیہ کے حق میں کرنے کے لیے دن رات محنت کرنا پڑے گی' اس چیز سے بے نیاز ہو کر کہ آخر میں تمام تر کریڈٹ نادیہ کے کھاتے میں جانے والا تھا۔

نادیہ ان دونوں کے غصیلے اور برہم انداز سے مرعوب ہوتے ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"آئی ایم سوری! یہ صرف آخری بار ہے' پر اس کے بعد کوئی شرط نہیں لگاؤں گی۔" بختاور نے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے سارہ کو دیکھا' وہ بھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ تاہم نظروں ہی نظروں میں وہ متفقہ طور پر اس کی معذرت قبول کر چکی تھیں شاید اس لیے بھی کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔

"اوکے! ہم مان لیتے ہیں کہ یہ آخری بار ہے' اس کے بعد تم کوئی اور شرط نہیں لگاؤ گی۔" بختاور نے اسے یقین دلاتے ہوئے کہا جواباً نادیہ کے تاثرات ایک بار پھر خوش گوار ہو چکے تھے۔

"بائی دا وے! تم نے مائرہ سے شرط کیا لگائی ہے؟" سارہ نے برسبیل تذکرہ دریافت کیا۔ جواب میں اس کا رد عمل ناقابل یقین تھا۔

"وہ تو اس نے نہیں بتائی۔" اس نے لاپروائی سے ایسے جواب دیا جیسے یہ کوئی عام بات ہو۔ مگر ان دونوں کے لیے یہ عام بات نہیں تھی۔

"آر یو آؤٹ آف یور سینسز نادیہ؟" سارہ چلائی۔

"نادیہ تم پاگل ہو گئی ہو یا پھر ہمیں بے وقوف سمجھا ہوا ہے۔ تم ایسے کیسے کر سکتی ہو' شرط کی نوعیت جانے بغیر تم شرط لگانے پر کیسے آمادگی ظاہر کر سکتی ہو۔" بختاور کے انداز میں سراسر بے یقینی تھی۔

"میں نے اس سے پوچھا تھا لیکن اس نے کہا کہ وہ مجھے کلاسز آف ہونے کے بعد بتا دے گی۔" وہ صفائی دیتے ہوئے بولی مگر اس صفائی سے بختاور کے بگڑے تیور نہیں بدلے تھے۔ یہی حال سارہ کا تھا۔

"اوکم آن! بختاور' تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہی ہو جیسے مائرہ پتا نہیں مجھ سے کیا کروانے والی ہے۔ دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے بس ہم کبھی کبھی مشکلات کو اپنی کمزور قوت ارادی کے سبب ناممکنات سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔" اس نے اپنی ای کا مشہور زمانہ قول

وہ ہرایا تھا۔

"اور پھر میرا مقصد ہر قیمت پر مائرہ کو ہرانا ہے اور تم دونوں دیکھ لینا میں ایسا کر کے رہوں گی۔" بختاور اور سارہ کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اپنے بال نوچ لیں کم از کم انہیں نادیہ سے اس بچگانہ حرکت کی قطعی امید نہ تھی۔ نادیہ کی بے وقوفی کیا کروانے والی تھی یہ تو کلاسز آف ہونے کے بعد پتا چلنا تھا۔

خارجی گیٹ پر انہیں کافی دیر تک مائرہ کا انتظار کرنا پڑا۔ نادیہ تو خیر خوش آئند جیت کے خوش کن احساسات کے سمندر میں ڈبکیاں کھا رہی تھی جبکہ ان دونوں کا مارے تجسس کے برا حال تھا، تاہم انہیں زیادہ دیر تک انتظار کرنے کی کوفت نہیں اٹھانا پڑی۔ مائرہ اپنی مخصوص لاپروا چال چلتی ہوئی اپنے گروپ کے ساتھ تشریف لا چکی تھی۔ بلیو جینز پر وائٹ ٹاپ پہنے وہ ابھی تک فریش دکھائی دے رہی تھی۔ آتے ہی اس نے نادیہ کو مخاطب کیا

"I am sorry to being a late"

نادیہ نے فوراً" اس کی معذرت کو قبول کر لیا تھا۔ ان دونوں کے پاس نادیہ اور مائرہ کے مابین ہونے والی گفتگو کو سننے کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا اور وہ بادل نخواستہ ایسا کرنے پر مجبور تھیں۔

معاً" مائرہ نے کھلے گیٹ سے جھانک کر متلاشی نظروں سے باہر جھانکا، پھر اس کے چہرے سے اطمینان چھلکنے لگا تھا، چند منٹوں کے توقف کے بعد وہ ایک بار پھر نادیہ سے مخاطب ہوئی۔

"وہ رہا تمہارا چیلنج۔" اس کے ہاتھ کے اشارے کے تعاقب میں نادیہ کے ساتھ ساتھ بختاور اور سارہ نے بھی ایک ساتھ جھانکا تھا۔ کچھ نا سمجھنے والے انداز میں بختاور نے نادیہ کو دیکھا مگر اس کے فق ہوتے چہرے نے اسے ایک بار پھر باہر دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ مائرہ کا اشارہ گیٹ سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی ایک گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے ایک دراز قامت لڑکے کی جانب تھا۔ اس لڑکے کی پشت ان کی جانب تھی۔ لیکن مائرہ اس لڑکے کی جانب اشارہ کیوں کر رہی تھی۔ اس کا کیا مقصد ہو سکتا تھا بختاور کو کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ اس نے ایک بار پھر گاڑی سے ٹیک لگائے اس شخص کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے ایک بار پھر گاڑی سے ٹیک لگائے اس شخص کو دیکھا۔ فرنٹ ڈور کھولے گاڑی سے قدرے تساہل آمیز انداز میں ٹیک لگائے وہ یقینی طور پر میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے مکمل طور پر نظر انداز کر دیا۔ مخصوص گہرے نیلے رنگ کی ہائی روف کی بجائے میں زیاد آفاق کی گاڑی کی ہرگز توقع نہیں کر رہی تھی۔ یہ جاب میرے لیے انتہائی تکلیف دہ بن گئی تھی اور اسے تکلیف دہ بنانے والے کو اس کا احساس تک نہ تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

اس روز اس کے اظہار محبت کے بعد میں اگلے دو روز تک آفس نہیں گئی۔ اپنی دانست میں تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا رہی کہ جاب چھوڑ دینے سے میری مشکلات میں خاطر خواہ کمی واقع ہونا شروع ہو گئی ہے۔ مگر تیسرے روز زیاد آفاق کے فون نے مجھے ایک بار پھر ان مشکلات کے بھنور میں لا کھڑا کیا۔

"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے، دو دنوں سے تم آفس نہیں آئیں تو میں نے سوچا کہ میں تمہاری خیریت ہی دریافت کر لوں۔"

"اُف! یہ انداز تغافل!" پھر میں نے یہ ضروری سمجھا کہ دوسری جانب سے بلند ہوتی غلط فہمی کی دیوار کو ڈھایا جائے۔

"میں جاب چھوڑ چکی ہوں، آپ کو ریزائن نہیں ملا؟ حالانکہ میں نے مسز شیرازی کو یاد دہانی کروا دی تھی، کہ وہ اسے یاد سے آپ تک پہنچا دیں۔"

"اوہو! تو تم اس استعفیٰ کی بات کر رہی ہو، جس کا سرے سے کوئی وجود بھی نہیں، ان فیکٹ میں اسے پھاڑ چکا ہوں۔ تم بہت انوسینٹ ہو قرۃ العین! شاید تم یہ بات بھول گئی ہو کہ جس روز تم نے آفس جوائن کیا

تھا اسی روز تم نے ایک اگریمنٹ بھی سائن کیا تھا جس کے تحت تم چھ ماہ تک استعفیٰ دینے کی مجاز نہیں ہو گی۔ البتہ چھ ماہ کے بعد تم ایسا کر سکتی ہو اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض کہ ابھی آپ کو ہماری اس فرم میں کام کرتے ہوئے صرف دو ماہ ہی ہوئے ہیں' لہٰذا اس اگریمنٹ کی شق کے تحت ابھی چار ماہ باقی ہیں آپ کے ریزائن کرنے میں۔"

دوسری جانب سے وہ غالباً" مسکراتے ہوئے تفصیلی وضاحت دے رہا تھا۔ یکدم مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس معمولی سے اگریمنٹ کو زیاد آفاق اپنے مفاد میں لے آئے گا۔

یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ میں نے ایک ایسا ہی اگریمنٹ سائن کیا تھا' لیکن اس اگریمنٹ میں درج شرائط سے میں قطعاً "ناواقف" تھی اور اگر واقف ہوتی تو بھی مجھے یہ جاب کرنا تھی' ہر حال میں' ایک جنون تھا جو اس وقت میرے سر پر سوار تھا اور وہ جنون تھا پاپا کے حکم کی نفی' ان کے اعتراضات کی نفی' ان کے وجود کی نفی' چھ ماہ تو کیا میں تمام عمر بھی اس سلسلے کو جاری رکھ سکتی تھی۔ مگر اب اس سلسلے کی کڑیاں بکھرنا شروع ہو گئی تھیں۔ زیاد آفاق نے میرے تمام ارادوں کو ملیا میٹ کر دیا تھا اور یہی نہیں اب میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گیا تھا عجیب زبردستی تھی۔

اگلے روز جب میں مارے باندھے آفس گئی تو میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ مجھے مشتاق صاحب سے ہر قیمت پر ملنا ہے' وہ ہی مجھے لیگلی ایڈوائز کر سکتے تھے' یہ بات تو طے تھی کہ مجھے کسی بھی صورت یہ جاب نہیں کرنی تھی۔ مگر مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ مشتاق صاحب جو اس فرم کے لیگل ایڈوائزر تھے' نے مجھے صاف اور واضح لفظوں میں سمجھا دیا تھا کہ مجھے اس معاہدہ کی تمام شرائط کو پورا کرنا ہوں گی کیونکہ میں اسے سائن کر چکی تھی' دوسری قیمت پر مجھے ایک بڑی رقم دینی ہو گی' جس کی کم از کم میں متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ پاپا کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے بہتر تھا کہ میں چپ چاپ اپنی برداشت کو آزماتے ہوئے یہ چار ماہ گزار دوں۔ مشتاق صاحب سے ملاقات کے بعد کسی اگر مگر کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ میں مردہ قدموں سے چلتی ہوئی اپنے آفس میں آ گئی جہاں پہلے سے موجود مسز شیرازی مجھے دیکھ کر مسکرانے لگی تھیں۔

"تو آپ آ گئی تھیں؟" میں خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"مجھے اندازہ تھا کہ زیاد آفاق اتنی آسانی سے تمہیں جانے نہیں دے گا' اسی لیے جب تم نے مجھے ریزائن دیا تو میں نے تمہیں ایسا کرنے سے روکا تھا۔" میں بدستور خاموش تھی۔

"وہ شاید تمہیں پسند کرتا ہے۔" میں نے ایک دم نظریں اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔

"اس طرح زور زبردستی کر کے وہ کیا ثابت کرنا چاہ رہا ہے کہ میں اس کی محبت میں گرفتار ہو جاؤں گی' اس کی یہ کوشش ہمیشہ کوشش ہی رہے گی۔" سرد مہری اور روکھے پن سے کہتے ہوئے میں نے بے زاری سے اپنے سامنے ایک فائل کھسکا لی۔

"قرۃ العین! کیا تم کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" میری ساکت نظریں مسز شیرازی کے چہرے پر جم سی گئیں۔

"ورنہ تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی زیاد آفاق کو ناپسند کرنے کی۔" انہوں نے اپنے سوال کی وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

"پسند!" میں نے ایک گہرا سانس خارج کیا تھا۔ بات پسند تک ہوتی تب بھی قابل اطمینان تھی مگر یہاں تو معاملہ محبت سے بھی بہت آگے کا تھا۔ مگر میرے اس احساس کو کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا' خود معیز بھی نہیں۔ میں نے سوچا لیکن جواب دینے سے گریز برتا۔

"سب جانتے ہیں فراز بشیر تمہیں تنگ کرتا تھا' لیکن سب یہ نہیں جانتے کہ فراز بشیر کو اس کی بری کارکردگی کی وجہ سے نہیں بلکہ تمہاری وجہ سے اس فرم سے بے دخل کیا گیا ہے۔" میں ایک دم چونک کر مسز شیرازی کو دیکھنے لگی۔ اس کے بعد انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بہت خاموشی سے میرے کیبن سے نکل

گئیں۔

اگلے کئی روز تک زیاد آفاق نے نہ تو مجھے اپنے آفس میں طلب کیا تھا اور نہ ہی خود میرے آفس میں آیا جو کہ کسی نہ کسی طور اطمینان بخش تھا مگر میرا یہ اطمینان چند روز ہی مہمان ثابت ہوا۔

میں اپنے سامنے کھڑے زیاد آفاق کو دیکھ رہی تھی۔ آفس وین کو اس نے جانے دیا تھا اور اب اپنی گاڑی کے ساتھ کھڑا وہ یقیناً میرا منتظر تھا۔ میں اسے نظرانداز کرتی ہوئی متلاشی نظروں سے ٹیکسی کو دیکھنے لگی۔

"غالباً تم مجھے نظرانداز کر رہی ہو۔" وہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا میرے نزدیک آ کھڑا ہوا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

"قرۃ العین! میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"لیکن میں آپ کی کوئی بات سننا نہیں چاہتی۔" میں تیز لہجے میں بولی۔ زیاد ہونٹ بھینچے بے تاثر نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔

"تم بہت ضدی ہو۔" میں نے بہت سکون سے اس رائے کو سنا اور بغیر تبصرہ کیے اس کے قریب سے گزر جانا چاہا۔ جب زیاد آفاق نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی۔ میں ابھی بھی یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ وہ ایسی حرکت کرے گا۔

"میں ضدی لوگوں کو ٹریٹ کرنا بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"سر پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔" میں ایک دم روہانسی ہو گئی۔ میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی برابر سعی کر رہی تھی اور وہ بڑے آرام سے میری اس حرکت کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

"آپ میرے ساتھ زبردستی نہیں کر سکتے۔"

"میں سب کچھ کر سکتا ہوں مائی ڈیئر!" وہ میرا ہاتھ تھام کر اسی طرح گاڑی کے قریب لے آیا' زبردستی گاڑی میں مجھے بٹھاتے ہوئے مسلسل مجھے کڑی نظروں سے گھور رہا تھا۔

"تمہارے لیے کوئی پریشان رہے' تمہاری فکر کرے اور تم سے محبت کرے' تمہاری نظر میں اس کی یہ اہمیت ہے کہ تم اسے اگنور کر دو۔" گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ تند لہجے میں کہہ رہا تھا جواب میں میں نے بھی ویسی ہی تندی اختیار کی تھی۔

"کیوں فکر ہے آپ کو میری' کیوں پریشان رہتے ہیں آپ میرے لیے کیا لگتے ہیں آپ میرے؟ آپ نہیں جانتے کہ مجھے آپ کا یہ انداز کتنا برا لگتا ہے لیکن۔۔۔ اگر میں خاموش ہوں اور آپ کی ان فضول حرکتوں کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے اہمیت نہ دینے سے ان حرکتوں کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔"

"ان فیکٹ میں بھی یہی کہنے والا تھا کہ تم میری ان حرکتوں کو اہمیت دو کیونکہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے قائم ہونے کے بعد تم یہ نہ کہہ سکو کہ میں کیا لگتا ہوں تمہارا۔" میرے غصے کی پروا کیے بغیر وہ سنجیدگی سے مدھم لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں تم سے اس موضوع پر تفصیل سے بات کرنا چاہتا تھا' لیکن تمہارے غصے اور غضبناک رویے نے میری راہ میں رکاوٹ کھڑی کر دی لیکن آج اگر میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں تو صرف اس لیے کہ میں اپنی محبت اور جذبات کو تمہارے غصے کی نذر نہیں کر سکتا۔ ٹھیک ہے میرا گزشتہ رویہ تمہیں اچھا نہیں لگا ہو گا اور شاید لگنا بھی نہیں چاہیے' لیکن تم نے مجھے کبھی اپنے قریب آنے کا موقع ہی نہیں دیا کہ میں تمہاری نیچر سے آگاہ ہو پاتا' مجھے اندازہ ہوتا کہ تم کس قسم کے اظہار کو پسند کرتی ہو لیکن آج ایک بات میں تم پر واضح کرنا چاہتا ہوں کہ میں تمہارے ساتھ نہ تو کوئی ڈرامہ کر رہا ہوں اور نہ ہی فلرٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"میں آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔" قطعیت سے کہتے ہوئے میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ مگر چونکہ اسے میرے دو ٹوک انداز کی بھی پروا نہیں رہی تھی جب ہی اس کی مدھم سی آواز ایک بار

پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔

"کیوں؟"

"میں جواب دینا ضروری نہیں سمجھتی۔"

"لیکن میں ضروری سمجھتا ہوں اور جب تک تم میری اس کیوں کا جواب نہیں دو گی میں تمہارا پیچھا چھوڑنے والا نہیں ہوں۔" میرے لیے اب یہ صورت حال ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔

"میں تمہاری زبان سے صرف انکار کی وجہ جاننا چاہتا ہوں' بے فکر رہو اگر تمہارے انکار کی وجہ میں کچھ وزن ہوا تو میں تمہیں کبھی پریشان نہیں کروں گا۔" گاڑی کن راستوں پر محو سفر تھی مجھے خبر نہیں تھی۔ میری سماعتوں پر تو زیاد آفاق کی آواز کوڑے برسا رہی تھی۔ یہ شخص میری زندگی کا بچا کھچا سکون بھی تباہ کر رہا تھا' معاً "نامانوس راستوں پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے اوسان خطا ہوتے محسوس ہوئے تبھی میں ایک دم ہنجی لہجہ میں بولی۔

"سر پلیز! آپ یہاں گاڑی روک دیں۔" میرے التجائیہ انداز سے بے نیاز وہ ہونٹ بھینچے ڈرائیونگ کرتا رہا۔

"تم مجھ سے شادی کرنا کیوں نہیں چاہتیں؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد اس نے ایک بار پھر اپنا سوال دوہرا لیا میرے پاس اس سوال کا جواب تو تھا لیکن میں اپنا آپ اس کے سامنے کمزور کرنا نہیں چاہتی تھی' میں اسے یہ بتانا نہیں چاہتی کہ میں اندر سے کس قدر ٹوٹی پھوٹی لڑکی تھی۔ وہ تو میرا جواب سن کر شاید دوسری راہ پر گامزن ہو جائے گا لیکن میرا کیا ہو گا میں اسی طرح ہر ایک کے سامنے تقسیم ہوتی رہوں گی۔

نجانے کتنی دیر ہو گئی تھی اسے پیٹرول پھونکتے مگر اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا' ایسے جیسے اسے ضد سی ہو گئی ہو' ضد تو مجھے بھی ہو گئی تھی مگر میری ضد کے ساتھ میرا ازلی خوف بھی جڑا ہوا تھا لہٰذا میں اتنی دیر تک استقامت کا مظاہرہ نہیں کر سکتی تھی اور یہی خوف مجھے پریشان کر رہا تھا۔ کافی دیر تک میں اپنی خاموشی کے ساتھ کش مکش کی سی کیفیت میں بیٹھی رہی اور جب وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس ہوا تو جیسے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔

"میں آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتی کیونکہ میں آپ سے محبت نہیں کرتی' میں معیز سے محبت کرتی ہوں۔ میں معیز کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی میں آپ کے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔" میں چلاتے ہوئے بولی تھی' اس دوران کتنی بار میری آواز پھٹی تھی مجھے احساس تک نہیں ہوا تھا۔ گاڑی ایک دم رک گئی۔

"مل گیا آپ کو سکون' ہو گئے ہیں نا آپ مطمئن' جان گئے ہیں نا آپ میرے انکار کی وجہ' یقیناً" آپ کو اس انکار کی وجہ میں وزن بھی محسوس ہوا ہو گا تو پلیز اب مجھے پریشان کرنے کی کوشش مت کریں' چھوڑ دیں میرا پیچھا میری کمزوری کو ہتھیار مت بنائیں۔" وہ پلکیں جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا' اسے جیسے یقین نہ آ رہا ہو' جیسے وہ یہ سب سننا نہیں چاہتا تھا وہ شاید کچھ اور سننے کا متمنی تھا اور غیر متوقع طور پر وہ اعتراف سن رہا تھا جو شاید وہ اپنے حوالے سے سننا چاہتا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ کتنا روکا تھا میں نے انہیں مگر۔

"میری بدقسمتی کی یہ انتہا ہے کہ جسے مجھ سے محبت ہے اور مجھے جس سے محبت ہے وہ میرے مقدر میں نہیں ہے۔" اپنی ہتھیلیاں کھولنے میں اب بھی کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی" وہ جواب میری زندگی سے نکل گیا" یا پھر جسے میں نے خود اپنی زندگی سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد زیاد آفاق نے کوئی اور سوال نہیں کیا تھا۔ گاڑی کے ماحول میں یکدم حبس بڑھنے لگا تھا۔ خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد زیاد آفاق کی آواز نے اس سکوت کو توڑا تھا۔

باقی آئندہ شمارے میں

"وہ تمہارا گھر آگیا ہے۔" میں ایک دم چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگی میرے ذہن میں اچانک یہ سوال ابھرا تھا کہ زیاد آفاق میرے گھر کا ایڈریس کیسے جانتا تھا۔ میں اسے نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

وہ اسے نا سمجھنے والے انداز میں دیکھنے لگی' مائرہ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا رہی تھی۔ بختاور کے لیے اس کی ہنسی سے زیادہ نادیہ اور سارہ کے فق ہوتے چہرے زیادہ ناقابل فہم تھے۔

"نادیہ وہ رہا تمہارا چیلنج۔" مائرہ نے ایک بار پھر کچھ فاصلے پر کھڑے اس لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے نادیہ کو مخاطب کیا جس کے چہرے پر اب بھی سراسیمگی اور خجالت کے آثار نمایاں تھے۔

"تمہارا چیلنج یہ ہے کہ تمہیں اس سے فلرٹ کرنا ہوگا۔" اس وقت بختاور کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی' اسی کیفیت کے احساس نے اسے نادیہ اور سارہ کے فق ہوتے چہرے کی حقیقت کا ادراک ہوا تھا۔ ان دونوں کا یہی انداز اسے معاملے کی سنگینی کا احساس دلا رہا تھا۔

"ویل نادیہ! میری تو ویل وشز تمہارے ساتھ ہیں خیر اب آتے ہیں شرائط کی جانب۔" مائرہ کی طمانیت اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے سے بھی عیاں تھی اور ان تینوں کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔

"تمہارے پاس تیس دن ہیں مطلب ایک ماہ' کافی لمبا عرصہ ہوتا ہے یہ' ہے نا اور پھر تمہاری جیسی ناممکنات سر کرنے والی لڑکی کے سامنے شاید یہ دن' بہت زیادہ ہوں لیکن خیر اگر تم نے یہ شرط قبول کی ہے تو تھوڑا بہت ایڈوانٹیج بھی تو ملنا چاہیے۔ تم اس تیس دنوں میں سلجوق عمر سے فلرٹ کرو گی اور اگر نہ کر سکیں تو پھر بقول تمہارے تمہیں پوری کلاس کے سامنے اس بات کا اقرار کرنا ہوگا کہ آئی ایم دی بیسٹ' آئی ایم مطلب مائرہ رضا گردیزی۔"

"لیکن مائرہ! تمہیں کیسے پتا چلے گا کہ اس نے سلجوق عمر کو فلرٹ کیا ہے۔" اس کی کسی دوست نے استفسار کیا تھا۔

"ویری سمپل! اگر نادیہ' سلجوق عمر کو اپنے ساتھ کسی ریسٹورینٹ میں لے جانے میں کامیاب ہو گئی تو میں سمجھوں گی کہ اس نے اس سے فلرٹ کر لیا ہے اور نادیہ! مجھے اس ریسٹورنٹ میں بلانا مت بھولنا پھر ہی تو میں پوری یونیورسٹی کے سامنے اعتراف کروں گی کہ نادیہ افتخار مجھ سے بہت آگے ہے' وہ مجھے ہرا سکتی ہے۔" اس کی مسکراہٹ اس کی متوقع کامیابی کا پتا دے رہی تھی۔ اسے یقیناً اپنی جیت کا سو فیصد یقین تھا اور اس چیز کا اظہار اس کے جسم کا رواں رواں کر رہا تھا۔

نادیہ کے چہرے سے کچھ دیر پہلے کی طمانیت' سرشاری اور خود اعتمادی بھاپ کی طرح اڑ چکی تھی۔ مائرہ اپنے گروپ سمیت انہیں بائے کہتی ہوئی پارکنگ

لاٹ کی جانب مڑ گئی۔ وہ تینوں ـــــ ساکت نظروں سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں۔ مائرہ کے منظر سے غائب ہوتے ہی جیسے وہ تینوں ہوش کی دنیا میں لوٹ آئیں۔ سب سے پہلے اپنے رد عمل کا اظہار بختاور نے کیا تھا اور وہ بھی کڑے اور سرد لفظوں کے ساتھ۔

"دیکھ لیا تم نے اپنی جلد بازی کا نتیجہ' اب تو تمہیں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ دنیا میں اب بھی بہت سی چیزیں ناممکنات کی قطار میں کھڑی ہیں' جن کا کرنا اب بھی تمہارے اور میرے لیے ناممکن ہے۔ تم کر سکتی ہو کسی کو فلرٹ' اتنے گٹس ہیں تم میں کہ تم کسی لڑکے کو اپنی جانب مائل' بجا متوجہ کر سکو اور وہ بھی اس لڑکے کو جسے مائرہ جیسی بولڈ لڑکی اپنی جانب مائل نہ کر سکی۔ تم اچھی طرح جانتی تھیں کہ مائرہ تم سے شطرنج کی بیسٹ آف تھری کی بازی نہیں لگائے گی' تمہاری زندگی پڑھائی اور کھیلوں سے کبھی آگے نہیں گئی' اگر ایسا ہوتا تو تم از کم تم یہ ضرور جان لیتیں کہ مائرہ کسی اور میدان کی کھلاڑی ہے۔ پتا ہے مجھے نہ تو تم پر غصہ آ رہا ہے اور نہ ہی طیش' مجھے صرف تم پر ترس آ رہا ہے وہ بھی اس لیے کہ جیت جیسی چیز کا یقین ہونے کے باوجود تمہیں اس سے محروم ہونا پڑے گا۔ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ تم مائرہ سے شکست کھا گئی ہو ان فیکٹ تم اس سے کبھی جیت ہی نہیں سکتیں۔" لفظوں سے بھی اس کی بھڑاس نکل نہیں پا رہی تھی' تبھی وہ سارہ کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے ڈراپ کر دو گی۔" سارہ کے جواب دینے سے پہلے وہ پارکنگ میں کھڑی اس کی گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔ چند ثانیوں بعد اس نے سارہ کے ساتھ نادیہ کو بھی آتے دیکھا۔ اس نے اپنا رخ دوسری جانب پھیر لیا۔

گاڑی کو مین روڈ پر لاتے ہوئے سارہ نے گاڑی میں تنی خاموشی کو توڑنے کی سعی کی۔

"اب اس طرح خاموش رہنے اور غصہ کرنے سے کیا ہو گا ہمیں اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل سوچنا ہو گا۔" مگر یہ خاموشی جوں کی توں برقرار رہی دونوں کے مابین خاموشی الگ الگ رویے کا اظہار تھی' نادیہ کی خاموشی میں شکستگی' کرب اور اضطراب پنہاں تھا جبکہ بختاور اس لیے خاموش تھی کہ وہ اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی سعی میں مصروف تھی۔

"بختاور! پلیز اس طرح ناراض مت ہو پلیز کچھ کرو۔ میں مائرہ سے ہارنا نہیں چاہتی۔" روہانسی آواز میں کہتے ہوئے اس نے بختاور کو مخاطب کیا تھا اور جواب میں بختاور نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"میں کچھ کروں؟" اس نے متحیر نظروں سے ایک بار پھر نادیہ کو اور پھر سارہ کو دیکھا' جو نظروں ہی نظروں میں اسے پرسکون رہنے کی التجا کر رہی تھی۔ وہ پرسکون کیسے رہ سکتی تھی۔

"مائرہ کے گروپ کے سامنے جب تم نے یہ فضول چیلنج قبول کیا تھا تو اس وقت تم نے ہماری حقیر رائے جاننے کی کوشش کی تھی' ان فیکٹ تمہیں تو ہمارا خیال تک نہیں آیا تھا اب تم ہم سے یہ امید کر رہی ہو کہ ہم تمہیں اس لغو سے باہر نکالیں۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔

"اب تو صرف تمہارے پاس ایک راستہ ہے۔" نادیہ کے چہرے پر یکایک ایک بشاشت سی آ گئی تھی۔

"اور وہ یہ کہ تم ان تیس دنوں کے گزرنے کا انتظار کرو اور جب یہ گزر جائیں تو چپ چاپ مائرہ کے سامنے جا کر یہ قبول کر لینا کہ تم اسے کبھی نہیں ہرا سکتیں۔" نادیہ کے چہرے کی بشاشت غائب ہو گئی۔ وہ مردنی سی حالت میں تقریباً" رونے والی تھی اور پھر اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے' جنہیں نظر انداز کرنے کی بختاور بظاہر کوشش کر رہی تھی۔ سارہ' نادیہ کو تسلی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ جب سارہ نے اسے اس کے گھر ڈراپ کیا تب بھی وہ قصداً" نادیہ کو نظر انداز کر کے گیٹ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ نادیہ کے آنسو اب بھی اسے بے چین کیے ہوئے تھے۔ اس نے پہلی بار نادیہ کو اس طرح روتے دیکھا تھا۔ مگر دل میں کہیں یہ خیال بھی موجود تھا کہ کم از کم نادیہ اس کی اس تجویز کے بارے میں ضرور غور کرے گی کوئی دوسرا راستہ تھا بھی تو نہیں۔

نادیہ کے لیے یہ عمل ویسے بھی سارہ اور اس کے مقابلے میں دشوار ترین تھا۔ اس کی تربیت میں زیادہ تر قدامت پرستی کا ہاتھ شامل تھا۔ لاکھ اس کی فیملی پڑھی لکھی اور ماڈرن سہی' لیکن اس معاملے میں ان کا خاندان اب بھی قدامت پسند تھا' اب بھی ان کے خاندان میں لڑکوں کے ساتھ دوستی کو معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود وہ اپنے کزنز سے کسی بھی قسم کی بات چیت کرنے سے گریز کرتی تھی' بقول نادیہ کے کہ اس کی امی یہ سب پسند نہیں کرتیں مگر اس کے مقابلے میں سارہ اور وہ اس معاملے میں خاصی ڈھیل کا شکار تھے' لیکن کچھ اخلاقی پابندیوں کا اطلاق بہرحال ان پر بھی ہوتا تھا۔ سارہ کے پیرنٹس میں علیحدگی ہو چکی تھی اس لیے وہ اپنے تمام معاملات میں آزاد تھی۔ I.B.A میں بھی اس کی لڑکوں سے اچھی خاصی ہیلو ہائے تھی۔ مگر بختاور نادیہ کے ساتھ رہ رہ کر اس کے رنگ میں رنگتی چلی گئی تھی۔

گھر آنے کے کافی دیر بعد تک وہ نادیہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ مگر باوجود کوشش کے وہ اس مسئلہ کا کوئی حل نہیں نکال پائی تھی الٹا مزید خدشات نے اسے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ اگر نادیہ کی امی کو اس کی اس شرط کے بارے میں ہلکی سی بھی بھنک پڑ جاتی تو نادیہ کا تعلیم کو خیرباد کہنا تقریباً" یقینی تھا۔

شام کی چائے وہ دادو کے ساتھ ان کے پورشن میں پیا کرتی تھی۔ ملازم ابھی ابھی چائے کے لوازمات رکھ کر گیا تھا' معاً" دادو نے کارڈلیس اسے تھماتے ہوئے کہا۔

"تمہارا فون ہے۔" کارڈلیس کان سے لگاتے ہی اسے نادیہ کی امی کی آواز سنائی دی تھی۔ اس نے فوراً" سلام جھاڑا۔ بختاور کے سلام کا جواب انہوں نے پریشان کن انداز میں دیا تھا۔

"بیٹا! کیا بات ہے آج یونیورسٹی میں کچھ ہوا تھا کیا؟"

"کیا مطلب آنٹی! میں کچھ سمجھی نہیں۔" لکنت زدہ لہجے میں کہتے ہوئے وہ گھبرا گئی تھی آنٹی کو یہ سب کیسے پتا چلا۔

"نادیہ جب سے یونیورسٹی سے آئی ہے پریشان سی ہے' میں نے محسوس تو کیا لیکن پھر میں نے سوچا کہ سمسٹر بالکل نزدیک ہیں شاید اس کی ٹینشن لے رہی ہو مگر۔" انہوں نے چند ساعتوں کا توقف کیا۔

"مگر اب مجھے لگتا ہے معاملہ کچھ اور ہے' سعد بتا رہا تھا کہ اس نے نادیہ کو روتے دیکھا ہے اور اب اسے ٹمپریچر بھی ہو گیا ہے۔ غنودگی میں کیا کچھ بڑبڑا رہی ہے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھے لگ رہا ہے جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو تم تو اس کے ساتھ ہی تھیں نا تم مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے۔" ازلی ماؤں والے تفکر کے ساتھ وہ جس قسم کی تشویش میں تھیں ایسی حالت میں انہیں مطمئن کرنا اتنا سہل نہ تھا۔

"نہیں آنٹی! ایسی تو کوئی بات نہیں بس کچھ اسائنمنٹ ہمیں بہت جلدی سب منٹ کروانے ہیں شاید اس چیز کی اس نے ٹینشن لی ہو گی۔ یونیورسٹی میں بھی وہ ان کے لیے بہت پریشان تھی' حالانکہ میں نے اور سارہ نے اسے تسلی بھی دی تھی۔" جھوٹ بولتے ہوئے مجھے اپنا لہجہ بے ربط ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

"آر یو شیور؟ یہی بات ہے نا۔" ان کے انداز میں سراسر بے یقینی تھی اور وہ ایک بار پھر انہیں یقین دلانے کی کوشش کرتی رہی۔ ان کے فون رکھنے کے بعد بختاور نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔ بختاور کو نادیہ سے اس قسم کے طرز عمل کی قطعی امید نہیں تھی مگر اب اسے اندازہ ہوا تھا کہ مائرہ کے ساتھ لگائی گئی شرط اس کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی تھی۔

دادو عادتاً" اس سے یونیورسٹی اور اس سے متعلق مصروفیات کے بارے میں پوچھتی رہیں اور وہ یونہی غائب الدماغی سے ان کے ہر سوال کے جواب میں ہوں

ہاں کرتی رہی۔ اس کا دماغ اس وقت نادیہ کی جانب اٹکا ہوا تھا۔ اسے رہ رہ کر اپنے وہ الفاظ یاد آرہے تھے جو اس نے طیش کے عالم میں نادیہ سے کہے تھے۔ اپنے ان الفاظ کی سختی اور درشتی کا اندازہ اسے اب ہو رہا تھا۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ اس کے اس قدر غصیلے اظہار کے سبب ہی نادیہ کی طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو اور پھر بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر اس کے دماغ نے نہایت فیصلہ کن انداز میں ایک سوچ کی جانب رسائی کی تھی۔

اگلے روز یونیورسٹی آتے ہوئے اس کے ذہن میں تھا کہ نادیہ نہیں آئے گی لہٰذا اس کی غیر موجودگی میں ہی اسے وہ کام کرنا تھا جس کے بارے میں وہ سوچ چکی تھی مگر نادیہ کو سارہ کے ساتھ دیکھ کر اسے اپنی منصوبہ بندی ناکام ہوتی دکھائی دی تھی۔ وہ جب سے آئی تھی نادیہ مسلسل منہ لٹکائے بیٹھی تھی جبکہ سارہ کی حالت بھی قدرے مختلف نہ تھی۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ نادیہ کی خاموشی بختاور کو زچ کر رہی تھی۔ اس سے قبل اس کا باتونی پن اسے زچ کیا کرتا تھا۔ سر عباسی کی کلاس کے دوران ان تینوں میں سے کسی نے بھی کوئی سوال نہیں پوچھا تھا اور نہ ہی لیکچر نوٹ کرنے کی کوشش کی تھی جبکہ دوسری رو میں بیٹھی مائرہ کا غیر معمولی طور پر چہکنا ان تینوں کو کھل رہا تھا۔ مائرہ جس طرح ہنستے ہوئے سر عباسی کے ساتھ عادتاً" بحث کر رہی تھی وہ تینوں اپنی اپنی جگہ پہلو بدلنے پر مجبور تھیں۔

سر عباسی کے کلاس سے جاتے ہی مائرہ روسٹرم پر آ کھڑی ہوئی اور لگی سب کو مخاطب کرنے۔

"آپ سب کو یہ سن کر حیرت ہو گی کہ نادیہ افتخار نے مجھ سے شرط لگائی ہے اور اس کا دعوا ہے کہ وہ یہ شرط جیت کر دکھائے گی۔" جو اسٹوڈینٹس کلاس سے باہر نکل رہے تھے ان کے قدم تھم گئے جو کھڑے تھے وہ بیٹھ گئے۔ ہر اطراف سے چہ میگوئیاں اور سرگوشیاں کرتی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی شرط کی نوعیت کے بارے میں دریافت کر رہا تھا کوئی نادیہ کی اس ہمت کی داد دے رہا تھا اور کسی کو نادیہ کی ناکامی کا سو فیصد یقین تھا جتنے لوگ تھے اتنی ہی آوازیں اور اتنے ہی خیالات سامنے آرہے تھے' نادیہ کی حالت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں والی تھی۔ مائرہ طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ نادیہ کو دیکھ رہی تھی جیسے نادیہ کی موجودہ حالت اس کی توقع کے عین مطابق ہو۔ بختاور سے نادیہ کی یہ حالت برداشت نہیں ہو رہی تھی' وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی' وہ کیا کرنے والی تھی نادیہ اور سارہ قطعی طور پر ناواقف تھیں۔ وہ تیز قدموں سے چلتی ہوئی مائرہ کے قریب جا کھڑی ہوئی۔

"مائرہ! تم نے کل جو شرط نادیہ سے لگائی تھی۔"

"وہ نادیہ پوری نہیں کر سکتی' یہی کہنا چاہ رہی ہو نا" مائرہ نے تیزی سے اس کی بات کاٹتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا۔ جیسے بختاور یہ سب ہی کہنے والی تھی۔

"نہیں۔" مختصراً" مگر قطعیت سے کہتے ہوئے اس نے مائرہ کے رنگ بدلتے چہرے کو بغور جانچتے ہوئے کہا۔

"دراصل نادیہ کو کچھ دنوں کے لیے اسلام آباد اپنی کزن کی شادی میں جانا ہے' اسی وجہ سے وہ کچھ پریشان تھی۔ اگر یہ چیلنج میں قبول کروں تو تمہیں کوئی پرابلم تو نہیں ہو گی۔" نادیہ اور سارہ اس عرصے میں اس کے قریب آچکی تھیں۔

"بخت! یہ کیا کر رہی ہو تم' پاگل تو نہیں ہو گئی ہو۔"

"کیا کہتی ہو تم؟" مائرہ سے استفسار طلب کرتی وہ مکمل طور پر سارہ کی سرگوشی کو نظر انداز کر گئی تھی۔ اگر پوری کلاس اس وقت یہاں موجود نہ ہوتی تو شاید مائرہ اس ضمن میں اپنے اعتراضات گنوا سکتی تھی لیکن بختاور کا یہ کھلا چیلنج اسے مانتے ہی بنا یا پھر شاید وہ اس بارے میں زیادہ پرامید یا مطمئن تھی کہ نادیہ یا بختاور یہ کام کسی کے بھی بس کا نہیں تھا۔

"تم نے ایسا کیوں کیا بختاور!" کلاس روم سے باہر آتے ہوئے نادیہ نے تقریباً" روہانسے انداز میں اس سے دریافت کیا تھا۔

"تمہاری وجہ سے' اب میں آرام سے تو تمہیں پریشان ہوتے ہوئے تو نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

"لیکن!" نادیہ نے کچھ کہنا چاہا تب اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

"تم مائرہ سے ہارنا نہیں چاہتیں تو میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔ اب کم از کم تم مائرہ کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچ جاؤ گی اور ویسے بھی میرا مائرہ سے ہارنا میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا' لہٰذا تمہیں افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن بخت! اس نے جو پوری کلاس کو اس معاملے میں گھسیٹ لیا ہے یہ کوئی معمولی بات تو نہیں ہے۔ وہ تو آئی بی اے میں ہمارا سانس لینا بھی دوبھر کر دے گی۔" سارہ بھی اب بالکل نادیہ والی ٹون میں بات کر رہی تھی اور نادیہ کی آنکھوں میں تو اب بھی آنسو چمک رہے تھے۔

"اب کیا تکلیف ہے تمہیں۔" نادیہ کو روتے ہوئے دیکھ کر اب اسے اس پر شدید غصہ آرہا تھا۔

"تمہارا کیا خیال ہے مائرہ کے سامنے تمہاری ہار میں برداشت کر سکوں گی۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"شٹ اپ نادیہ! پتا نہیں تم مطمئن کیوں نہیں ہوتی ہو۔ تمہارے اطمینان اور خوشی کی خاطر میں نجانے کیا کچھ کرتی پھر رہی ہوں اور تم ہو کہ اب بھی آنسو بہا رہی ہو۔" اس نے زہر خند لہجہ میں کہا۔

"جو لوگ دماغ استعمال نہیں کرتے ان کا حال تمہارے جیسا ہوتا ہے' بچوں کی طرح آنسو بہاتے ہوئے وہ خود بھی بچہ بن جاتے ہیں۔" وہ ایک دم اٹھ کر اکیلی ہی لائبریری میں آگئی۔ پتا نہیں کیوں اسے یہ توقع تھی کہ اس کے اس عمل کے نتیجے میں کم از کم نادیہ کے چہرے کا غمگین تاثر زائل ہو جائے گا۔ لاشعوری طور پر وہ نادیہ کی جانب سے ممنونیت کے احساس کی منتظر تھی' مگر جواب میں اسے آنسو بہاتے ہوئے دیکھ کر اس کا پارہ چڑھ گیا تھا۔ اب اسے اس کی اس ضد سے چڑ سی ہونے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

اب مجھے اس کی اس ضد سے چڑ سی ہونے لگی تھی' مجھے غصہ آنے لگا تھا مگر وہ میرے غصے سے قطع نظر اب بھی اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔

"ٹھیک ہے میں تمہیں چاکلیٹس لا دوں گی۔" میرے پاس مومو کو بہلانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔

"نہیں مجھے تمہاری چاکلیٹس نہیں چاہئیں' مجھے معیز کی چاکلیٹ چاہیے اس نے مجھ سے پرامس کیا تھا۔" وہ ہٹیلے انداز میں بولی۔

"وہ بھول گیا ہو گا۔"

"نہیں وہ مجھے کبھی نہیں بھولتا' اس نے مجھے کہا تھا کہ میں اس کے لیے بہت اسپیشل ہوں۔ تم مجھے اس کے پاس لے جاؤ۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے مسلسل ایک بات کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ اس کا یہ انداز میری برداشت سے باہر تھا۔

"شٹ اپ مومو! تم کوئی چھوٹی بچی نہیں ہو۔ پوری انیس سال کی ہو گئی ہو۔ تمہاری عمر کے لوگ اس طرح ضد نہیں کرتے ہیں اور اگر تمہیں معیز کے پاس جانا ہے تو چلی جاؤ لیکن میرا سر مت کھاؤ میں کم پریشان نہیں ہوں' مگر تمہیں میری پریشانی کی کیا پروا' تمہیں تو ہمیشہ اپنی پروا رہتی ہے۔ میں تمہارا کتنا خیال رکھتی ہوں مگر تم نے کبھی میرا خیال نہیں کیا۔" میں ایک دم پھٹ پڑی۔ وہ ساکت نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور پھر چند ساعتوں بعد اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میں نے اسے اس طرح ڈانٹا تھا۔ میں نے کبھی اس سے سخت لہجے میں بات نہیں کی تھی معاً" ارتضٰی کمرے میں داخل ہوا۔

"چلو مومو! میں تمہیں معیز کے پاس لے جاتا

ہوں۔" وہ سنجیدہ انداز میں مومو سے مخاطب ہوا' غالباً" وہ میرے اور مومو کے مابین ہونے والی تلخ کلامی کو سن چکا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیوں کیا تمہیں چاکلٹس نہیں چاہئیں؟" ارتضٰی متحیر ہوا۔

"نہیں معیز بہت برا ہے۔ عینی بھی بہت بری ہے۔" وہ روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

ارتضٰی چند لمحوں تک مجھے متاسف انداز میں گھورتا رہا پھر کمرے سے باہر نکل گیا اب وہ یقیناً "مومو کو منانے گیا تھا۔ میرے دل پر بوجھ آگیا۔ پتا نہیں میں ایسی کیوں ہوتی جا رہی تھی۔ مما اور پاپا کے ساتھ اس رویہ کا ایک جواز موجود تھا مگر مومو کے ساتھ ہاں شاید اس کا بھی جواز تھا اور وہ تھا زیاد آفاق' گزشتہ روز اس نے جس طرح میرا ہاتھ پکڑا تھا اور جس طرح زبردستی مجھے اپنی گاڑی میں بٹھایا تھا' میرا خون اب تک اس کے اس انداز پر کھول رہا تھا' مگر ایک بات میں ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی کہ وہ میرے گھر کا ایڈریس کیسے جانتا تھا۔

اپنے کمرے میں' میں کافی دیر تک زیاد آفاق کے بارے میں سوچتی رہی اور پتا نہیں میری سوچوں میں کب معیز کی آہٹیں دستک دینے لگیں۔ میرا ذہن پیچھے کی جانب گامزن تھا اور اب مجھے ایک بار پھر اپنی ذات کے پاتال میں آرہا تھا۔ میرے اردگرد ان آوازوں کا جمگھٹا تھا جن سے دانستہ مفر بھی ایک ناممکن عمل بن چکا تھا۔

"اعتماد اور اعتبار اپنی ذات پر بھروسے سے آتا ہے' جس روز تم نے یہ دونوں چیزیں پالیں تو پھر میں اس بات کو تسلیم کرلوں گا کہ تم ڈرپوک نہیں ہو۔" میں ان آوازوں سے مفر نہیں چاہتی تھی' زندگی میں اگر کچھ تھا تو صرف ان آوازوں میں پنہاں' چاہت' محبت اور التفات کی وجہ سے' باقی سب کچھ بے رنگ اور سپاٹ تھا۔ درحقیقت میں ان آوازوں کے سہارے ہی متحرک تھی۔ کمرے کی لائٹس آن کیے بغیر میں اندھیرے میں اپنی ذات کی بکھری کرچیاں سمیٹ رہی تھی' مگر میری یہ سعی لاحاصل رہی۔

میں جانتی تھی کہ مجھے محبت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ قرۃ العین کے لیے کسی کے پاس محبت تھی ہی نہیں اور اگر کسی کے پاس تھی تو وہ قرۃ العین کو مل نہیں سکتا تھا' کیونکہ قرۃ العین نے اس محبت کو ناموافق مٹی میں بویا تھا۔ نفرت کی آب و ہوا میں اس پودے کو پروان چڑھایا تھا' نتیجتاً حالات کی تمازت نے اس پودے کو کملا دیا تھا۔ میری اس محبت کی کسی کو بھی پروا نہیں تھی' نہ میرے باپ کو اور نہ ہی میری ماں کو۔

مما اور پاپا نے اپنے اپنے خاندانوں سے ٹکر لے کر اپنی پسند کی شادی کی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے تک شاید وہ دونوں خوش بھی رہے ہوں' مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا' میں نے اپنے والدین کو ایب نارمل زندگی گزارتے دیکھا۔ غالباً" وہ دونوں اس خوش فہمی میں مبتلا رہے ہوں کہ شادی کے بعد وہ اپنے والدین کو راضی کرلیں گے اور شاید مما نے کسی نہ کسی طرح اپنی فیملی کو قائل کرلیا تھا لیکن پاپا ایسا نہیں کرپائے تھے۔ ان کی فیملی نے مما کو قبول نہیں کیا تھا البتہ پاپا سے ان کے تعلقات بہتر تھے' یہی حال بڑی پھوپھو کا تھا۔ انہوں نے مما کو کبھی دل سے قبول نہیں کیا اور اس چیز کا اظہار ان کی آنکھیں' ان کے چہرے کے تاثرات ہی نہیں بلکہ ان کی کڑوی زبان بھی کیا کرتی تھی' البتہ معیز اپنی ماں کے برخلاف مما کے بہت قریب تھا۔ وہ اکثر رات کا کھانا ہمارے گھر کھایا کرتا تھا بقول اس کے کہ "ممانی جیسا کھانا کوئی نہیں بنا سکتا۔" وہ اکثر مما کی خوب صورتی میں رطب اللسان رہتا۔ اس کی یہی لاتعلقی میرے اور اس کے مابین دوستی جیسے رشتہ کا موجب بنی۔ اس رشتے کا احساس بھی معیز نے ہی مجھے دلایا تھا۔ وہ مجھ سے دو برس بڑا تھا۔ کبھی کبھار اس کی دوستی ڈکٹیٹرشپ میں تحلیل ہوجایا کرتی تھی۔ وہ بڑی دھونس سے اپنی ہر بات مجھ سے منوالیا کرتا تھا' یہ نہیں تھا کہ میں اس کی ہر بات بلا ردوکد مان لیا کرتی تھی مگر میری ضد' غصے اور مخالفت کی معیز کی نظر میں کوئی ویلیو نہیں تھی۔

اولیول کے رزلٹ کے بعد میں ایف ایس سی میں پری میڈیکل پڑھنا چاہتی تھی مگر معیز کے اصرار پر مجھے پری انجینئرنگ رکھنی پڑی۔

"جب میں کہہ رہا ہوں کہ تمہارے لیے میتھس اور فزکس زیادہ بہتر ہے تو تمہیں فضول میں ناک بھوں چڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس ضمن میں میرے تمام اعتراضات کو اس نے بغیر کسی دلیل کے رد کردیا تھا۔ پھر ایسا ہونے لگا کہ میں معیز کی ہر بات' ہر مطالبہ بلاچون وچرا ماننے لگی' میری ہر پسند معیز کی پسند میں ڈھلنے لگی۔ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ معیز کے علاوہ کوئی بھی میرے احساسات نہیں سمجھ سکتا' میں بڑی آسانی سے اپنی ہر بات معیز سے شیئر کرسکتی تھی وہ باتیں بھی' جو شاید مجھے اپنے والدین سے کرنی چاہیے تھیں' لیکن چونکہ میرے والدین اپنی زندگی کے تیے گئے ایک فیصلے' بلکہ یوں کہنا چاہیے ایک غلطی کی تلخی میں اس حد تک مگن تھے کہ انہیں میرے وجود کی ذرہ برابر پروا نہیں رہی تھی' ویسے بھی اس گھر میں میرا وجود ایک فالتو چیز کی مانند تھا جسے جہاں بھی رکھا جائے اس کی اہمیت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے' نہ تو وہ کسی کو دکھائی دیتی ہے اور نہ ہی اپنے اندر اتنی کشش رکھتی ہے کہ کسی کی توجہ اپنی جانب مبذول کروا پائے۔ اس سلسلے میں کی گئی میری ہر کوشش ہمیشہ لاحاصل رہی تھی۔ میں اپنے والدین کی توجہ کبھی اپنی جانب مبذول نہیں کروا پائی۔ ہاں کبھی کبھار مما کی خاموش نگاہوں میں مجھے التفات کا عنصر دکھائی دے جایا کرتا تھا مگر پاپا' ان کا ہر انداز اس قدر اجنبی ہوا کرتا تھا کہ مجھے کبھی بھی ان کی آنکھوں میں دیکھنے کی ہمت نہیں ہوسکی تھی۔ بچپن سے لے کر آج تک پاپا کا رویہ میرے لیے مبہم ناقابل فہم رہا تھا' مگر وقت گزرنے کے

ساتھ ساتھ میں نے ان کے اس رویے کے ساتھ سمجھوتا کرلیا تھا۔ ان کے اس طرزِ عمل اور اس گھر کے داخلی ماحول میں عدم توازن نے میری شخصیت میں طلب جیسا ناسور پیدا کردیا تھا اور یہ ناسور صرف پاپا کی موجودگی میں آنچ دیا کرتا تھا۔ آخر میں کب تک ان کے تنفر، سرد اور خشک رویے کے ساتھ سمجھوتا کر سکتی تھی۔

ایف ایس سی کے رزلٹ کے بعد میں بڑی سنجیدگی سے بی ایس سی میں رکھے جانے والے مضامین کے بارے میں منصوبہ بندی کررہی تھی جب میں نے اس سلسلے میں ارتضٰی سے پراسپکٹس منگوانے کی بات کی تو پاس بیٹھیں مما نے مجھے روک دیا۔

"فارم منگوانے کی ضرورت نہیں ہے، تمہارے پاپا، تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے مما کو دیکھنے لگی۔ جس چیز کے بارے میں میں نے کبھی نہیں سوچا تھا، کوئی پلاننگ نہیں کی تھی اور مما نے کتنی آسانی سے یہ سب کہہ دیا تھا، میری رائے جانے بغیر وہ مجھے مطلع کررہی تھیں۔ اپنی حیرت کے اظہار کے سوا میں کچھ اور نہیں کرسکتی تھی، ایسا کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ مما وہی کہتیں اور کرتی تھیں جو پاپا کہا کرتے تھے۔ میں جانتی تھی کہ اب بھی وہ محض پاپا کے حکم کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ سب کہہ رہی ہیں۔ شاید اس سلسلے میں ان کی ذاتی رائے تھی ہی نہیں اور اگر تھی تو پاپا کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ میں خاموشی سے ان کے سامنے سے ہٹ گئی۔

اگلے روز جب میں نے حسبِ معمول معیز کو اس تمام معاملے سے آگاہ کیا تو اس کا ردعمل میری توقع کے برعکس تھا، وہ میرے دکھ میں برابر کا شریک ہونے یا اس مسئلے کا حل ڈھونڈنے کی بجائے قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"تمہارا مطلب ہے، انکل تمہاری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" میرے کڑے تیوروں سے بے نیاز وہ تائید طلب انداز میں نمک پاشی کررہا تھا۔

"تو بالآخر، ہماری عینی اتنی بڑی ہو ہی گئی کہ انکل اس کی شادی کی فکر میں دبلے ہوئے جارہے ہیں۔" اس کی ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں پاؤں پٹختی اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ میں اگلے کئی روز تک صدمے کی سی کیفیت میں گرفتار رہی۔ میری افسردگی کی وجہ میں پاپا کے فیصلے کے علاوہ معیز کا مذاق اڑانے کا انداز بھی شامل تھا۔

مگر اگلے روز کے بعد مما نے مجھے مژدہ جانفزا سنایا کہ میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتی ہوں۔ پاپا کا یہ فیصلہ کیونکر تبدیل ہوا تھا اس سلسلے میں کسی بھی قسم کی قیاس آرائی کرکے میں اپنا ذہن مزید پراگندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بی ایس سی میں بھی مجھے وہی مضامین رکھنے پڑے، جو معیز چاہتا تھا۔

"تمہیں آگے چل کر ایم بی اے کرنا ہے، یہ مضامین تمہیں ایم بی اے میں ہیلپ کریں گے۔" بڑی آسانی سے اس نے مجھے راضی کرلیا تھا۔ گریجویشن کے وہ دو سال میں نے کسی نہ کسی طرح گزار دیے تھے اور ان دو سالوں کے ہر ہر دن معیز مجھے باور کرواتا رہا تھا کہ مجھے ہر حال میں ایم بی اے کرنا ہے۔ کسی نہ کسی طرح میں قائل بھی ہوگئی تھی مگر چند خدشات کا مجھے اب بھی سامنا تھا، یہ خدشات پاپا کی ذات سے وابستہ تھے، نجانے پاپا میرے آئی بی اے میں ایڈمیشن لینے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں مگر میرا یہ خوف اس روز بے بنیاد ثابت ہوا جب معیز کی چھوٹی بہن حوریہ پھوپھو کے ہمراہ پاپا سے ملنے آئی تھی اور اس نے بڑے جوش و خروش سے پاپا کو اطلاع دی تھی کہ اس کا این ای ڈی میں ایڈمیشن ہوگیا ہے۔ پاپا نے مسکراتے ہوئے اسے سراہا تھا۔ لڑکیوں کی پروفیشنل فیلڈ سے وابستگی کو انہوں نے ناگزیر قرار دیا تھا۔ پاپا کے اس آزادانہ اظہار کے بعد میرے تمام خدشات مٹ چکے تھے۔

جب بی ایس سی کے رزلٹ کے بعد میں نے اس سلسلے میں پاپا سے بات کی تو مجھے اندازہ نہیں ہو پایا کہ میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے۔ جس نے پاپا

کے ماتھے کی شکنوں میں اضافہ کردیا تھا۔ جب وہ بولے تو مجھے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔ اس بار مما نہیں، بلکہ پاپا براہِ راست مجھ پر اپنا حکم صادر کررہے تھے۔

"تمہیں مزید تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں، تمہارے لیے گریجویشن ہی کافی ہے۔" میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے پاپا کی ڈپلومیسی کو بغور دیکھ رہی تھی، اب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ان کی محدود ذہنیت اور تنگ نظری صرف میرے لیے تھی دوسروں کے لیے وہ براڈمائنڈڈ تھے۔

"تم اپنے ذہن سے ایم بی اے کے بھوت کو اتار دو، میں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں اور ویسے بھی تم نے جاب تو کرنی نہیں ہے، اس لیے اس پروفیشنل تعلیم کو ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں اپنے سامنے کھڑے اس شخص کو کبھی نہیں جان سکتی تھی، کوشش کرتی تب بھی پاپا میرے لیے ایک معمہ تھے، کم از کم میرے معاملے میں تو وہ ایک برف کی مانند تھے، سخت اور کٹھور۔ اگر میں ان کے اس رویے کو ان کی اس تلخی کے پس منظر میں دیکھتی، جو ان کی پسند کی شادی کے بعد ان کی زندگی میں زہر کی طرح گھل گئی تھی تو پھر یہ زہر صرف میری ہی زندگی میں کیوں گھولا جارہا تھا۔ ان کا یہ رویہ محض میرے ساتھ تھا، مومو اور ارتضٰی کے تو وہ حقیقی پاپا تھے۔ ان دونوں سے محبت ان کے چہرے پر دکھائی دیتی تھی، اس محبت کی چمک ان کی آنکھوں سے چھلکتی تھی، آج تک میں اپنے اندر کے خلا کو اس دلیل سے پر کرتی آئی تھی کہ ارتضٰی ان کا بیٹا تھا ان کی نسل آگے چلانے والا، ان کا نام آگے بڑھانے والا، جبکہ مومو سے محبت کی ایک ہی وجہ ہوسکتی تھی اس کی ایب نارملٹی۔ میں بھی ان کی بیٹی تھی، وہ میرے سگے باپ تھے لیکن میں محض ان کی محبت اور التفات پانے کی خاطر صرف یہی دعا کرسکتی تھی کہ کاش میں بھی مومو جیسی ہوتی کم از کم ان کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ تو ہوتا۔

اگلے کئی روز تک معیز نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن فی الحال میں معیز کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

مومو کی سالگرہ والے روز میں دانستہ معیز سے چھپتی پھر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ معیز سب کے سامنے مجھ سے بازپرس کرے، خاص طور پر پھوپھو کے سامنے۔ پھوپھو کسی بھی صورت اپنے بیٹے کا مجھ سے اس قدر بے تکلفی کا یہ انداز برداشت نہیں کرسکتی تھیں اور ان کے برداشت نہ کرنے کا مطلب تھا ان کی مما کے ساتھ تلخ کلامی، میں کم از کم انہیں موقع دینا نہیں چاہتی تھی۔

کیک کاٹنے اور ڈنر کی سرونگ کے بعد مہمانوں کی بھیڑ قدرے کم ہونے لگی تھی۔ خود ساختہ مصروفیت طاری کیے میں ادھر سے ادھر گھوم رہی تھی، درحقیقت یہ میری اس تقریب میں خود کو شریک رکھنے کی ادنیٰ سی کوشش تھی۔ مومو کی سالگرہ ہمارے گھر کا ایک ایسا ایونٹ تھا جس میں اس گھر کے مکینوں کے مابین مسکرانے کا ایک مصنوعی مقابلہ ترتیب پاتا تھا، کون کتنی دیر تک اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے رکھ سکتا ہے اور خوش اخلاقی کے متعین کردہ تقاضے نبھا سکتا ہے۔ یہ تھیں اس مقابلے کی شرائط، مگر میں نے ارتضٰی اور مومو کو کبھی بھی اس مقابلے کا فریق تصور نہیں کیا تھا۔ ارتضٰی اس گھر کا ایک نارمل فرد تھا۔ اس کے لیے ہنسنا زبردستی کا سودا نہیں تھا، جبکہ مومو کے لیے ہنسنا اور رونا دو مختلف عمل نہ تھے جب وہ ہنستی نہیں تھی تو روتی تھی۔ اس کی ہنسی کی خاطر ہی اس کی سالگرہ کے فنکشن کا بڑے پیمانے پر انعقاد کیا جاتا تھا۔

اپنی انیسویں سالگرہ کا کیک کاٹتے ہوئے غالباً اسے اس بات کا اندازہ تک نہ تھا کہ وہ کتنے سال کی ہوچکی ہے۔ دماغی طور پر وہ فقط چار یا پانچ سال کی بچی تھی، جس کی دنیا باربی ڈولز، ٹیڈی بیئرز اور چاکلیٹس تک محدود تھی۔

اس گھر کے بقیہ تینوں افراد جن میں، میں خود بھی شامل تھی محض خوش ہونے کی ایکٹنگ کیا کرتے تھے۔ لان میں اب بھی چند قریبی رشتہ دار چیدہ چیدہ میزوں

کے اردگرد بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔معاً" مجھے ایک بے ساختہ قہقہے نے اپنی جانب متوجہ کیا۔

☼ ☼ ☼

معاً" اسے ایک بے ساختہ قہقہے نے اپنی جانب متوجہ کیا۔ جب سے اس نے مائرہ کی وہ شرط قبول کی تھی مائرہ کے گروپ کا کوئی نہ کوئی ممبر اسے دیکھ کر قہقہہ لگانا اپنا فرض تصور کرنے لگا تھا۔ جو فیصلہ وہ کر چکی تھی اس میں کسی بھی قسم کی تضحیک آمیز ہنسی سے دراڑ نہیں پڑ سکتی تھی۔ وہ صرف اس ایک مہینے کے گزرنے کی منتظر تھی۔ سارہ نے اسے اس معاملے میں ایک بار پھر نظرثانی کرنے کو کہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کے نزدیک مقابلے سے پہلے ہار تسلیم کر لینا' نہ تو کوئی قابل ستائش کارنامہ تھا اور نہ ہی طمانیت انگیز احساس۔ لیکن وہ سارہ کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ بھی نادیہ کی طرح اس معاملے میں بالکل کوری تھی۔ لڑکوں کو اپنی جانب متوجہ کرنا ایک ناممکن سا عمل تھا۔

ایک ہفتہ گزر چکا تھا' ہر روز مائرہ کے گروپ کی کوئی نہ کوئی لڑکی انہیں گزرتے وقت کا احساس دلانے ضرور آ جاتی تھی۔ نادیہ کی غیر حاضریاں بڑھنے لگی تھیں مگر سارہ کا اصرار بھی بڑھ رہا تھا جسے ہر روز وہ نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔

"بختاور! تمہیں کم از کم ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے۔" وہ بڑی آسانی سے سارہ کے استدلال کو نظر انداز کر دیتی۔

اس روز نادیہ غیر حاضر تھی' بختاور کے فون کرنے پر وہ بڑی بے زاری سے بولی تھی "بس میرا پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

"پڑھنے کو جی نہیں چاہتا یا پھر مائرہ کو دیکھنے کو؟" اس نے جیسے مستفسرانہ انداز میں اس کی تصحیح کرنا چاہی۔

"کچھ بھی سمجھ لو' اب میں یونیورسٹی نہیں آؤں گی۔ مجھ سے یہ سب کچھ برداشت نہیں ہوتا' رہ رہ کر مجھے اپنی غلطیوں پر غصہ آتا ہے۔" اس نے نادیہ کی بات کاٹ دی۔

"مجھے یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں کیونکہ جتنا غصہ تمہیں خود پر آ رہا ہے نا اس سے زیادہ مجھے تم پر غصہ آ رہا ہے اور ویسے بھی میں نے تمہاری یہ بکواس سننے کے لیے فون نہیں کیا تھا۔"

"تو پھر کس لیے کیا تھا؟" وہ بے زاری سے بولی۔

"میں صرف تمہیں برتھ ڈے وش کرنا چاہتی تھی۔"

"کیا مطلب تم صرف مجھے وش پر ٹرخا دو گی۔" نادیہ کی پریشانی اس کے لہجہ سے صاف ہویدا تھی۔

"تو اس کا مطلب ہے تم مجھے وش کرنے میرے گھر بھی نہیں آؤ گی۔" دوسری طرف اسے ایک اور فکر ستانے لگی۔ مگر بختاور نے کسی قسم کا تسلی بخش جواب نہیں دیا۔

"ثاقب بھائی کی وجہ سے نہیں آ رہیں نا؟" نادیہ نے معنی خیز انداز میں دریافت کیا۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے...... وہ دراصل" اسے جیسے کوئی بہانہ ہی نہیں سوجھ رہا تھا۔

"آجاؤ نا بخت! بے چارے ایک سال بعد لندن سے آئے ہیں اور تم ہو کہ لفٹ ہی نہیں کروا رہیں۔ کل بھی غالباً" تم سے ملنے وہ تمہارے گھر آئے تھے مگر تمہارے ڈیڈی سے کرنٹ افیئرز ڈسکس کرنے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کر پائے' کافی غصے میں واپسی ہوئی تھی ان کی۔" تھوڑی دیر پہلے کی پژمردہ آواز کی جگہ اب شوخ آواز میں نادیہ ہنس رہی تھی۔ جواب میں بختاور نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا۔ حالانکہ چشم تصور سے ثاقب کی حالت دیکھ کر اس کا قہقہہ لگانے کو جی چاہ رہا تھا' مگر نادیہ کی متوقع ناراضی کی سبب وہ ایسا نہیں کر پائی۔ ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ اب وہ سنجیدگی سے نادیہ کے لیے گفٹ لینے کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

نادیہ اپنی برتھ ڈے بہت دھوم دھام سے سیلیبریٹ نہیں کرتی تھی' البتہ اس دن کی یاددہانی کروا کر اپنا گفٹ وصول کرنا وہ کبھی نہیں بھولتی تھی۔

اگلے روز دادو کی ممکنہ ڈانٹ کے پیش نظر وہ بڑی عجلت میں گفٹ شاپ سے باہر نکلی تھی۔ دادو کو اس کا اکیلے باہر جانا پسند نہ تھا۔ بہرحال دادو سے اپنی ہر ضد منوانا اسے باخوبی آتا تھا۔ آدھے گھنٹے کا کہہ کر وہ قریبی مارکیٹ تک نادیہ کے لیے گفٹ کی خریداری کے لیے آئی تھی۔ چونکہ وہ گھر سے خاص طور پر کسی گفٹ کا سوچ کر نہیں آئی تھی اس لیے شاپ میں داخل ہوتے ہی ایک نئی ٹینشن میں مبتلا ہو گئی' تیس منٹ تو اسے گفٹ کے انتخاب میں لگ گئے تھے' اس لیے گفٹ کو پیک کروا کر وہ بڑی عجلت میں گفٹ شاپ سے باہر نکلی تھی اور پھر اسی عجلت میں دائیں بائیں دیکھے بغیر سڑک کراس کرنی چاہی تھی' معاً" اسے اپنے حواس معطل ہوتے محسوس ہوئے تھے۔ اس کی سماعت نے بہت نزدیک سے کار کے پہیوں کی چرچراہٹ کو سنا تھا۔

بختاور کو اپنے سر اور بائیں بازو میں درد کی شدید لہر اٹھتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے خوفزدہ انداز میں' دھندلی آنکھوں کے ساتھ اپنے اردگرد لوگوں کو جمع ہوتے دیکھا تھا۔ بھانت بھانت کی آوازیں ابھر اور ڈوب رہی تھیں۔ ہر آواز اس قیاس آرائی میں مصروف تھی کہ آیا غلطی کس کی تھی۔ کچھ کے نزدیک گاڑی چلانے والا اپنے دھیان میں نہ تھا اور بعض تماشائیوں کی آراء یہ تھی کہ وہ ہی سڑک کراس کرنے کے اصول سے قطعی طور پر نابلد تھی' تبھی نقصان بھی اسی کا ہی ہوا تھا۔

سڑک کے بیچ و بیچ وہ جس انداز میں استراحت فرما تھی' حواس ٹھکانے آتے ہی گہری شرمندگی نے اسے گویا زمین میں گاڑ دیا تھا۔ بے بسی کے احساس نے اردگرد کے ہر منظر کو دبیز دھند میں گم کر دیا تھا۔

"ایکسکیوزمی! اگر آپ کا رونے دھونے کا پروگرام ختم ہو گیا ہو تو کیا میں آپ کو ہسپتال لے جانے کی زحمت کر سکتا ہوں۔" مدھم مگر قدرے بھاری اور کرخت آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی بختاور نے اپنے کانپتے ہاتھوں کو اپنے چہرے سے الگ کرتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا اور پھر جیسے اسے سکتہ ہو گیا۔ وہ لق چہرے پر ملامت نظروں سے اپنے سامنے پنجوں کے بل بیٹھے اس شخص کو دیکھ رہی تھی' جسے ایک بار دیکھنے کی خواہش کبھی کبھار اس کے دل میں ابھرا کرتی تھی۔ وہ شخص اس کے سامنے تھا جس کی خوب صورتی' جس کا دراز قد' جس کی ذہانت' جس کے مغرورانہ اور بے نیازانہ انداز کے چرچے زبان زد عام تھے۔ جس کے پیچھے اس نے لڑکیوں کی ایک بڑی تعداد کو پاگل ہوتے دیکھا تھا۔ یونیورسٹی کی سب سے خوب صورت اور ذہین لڑکی نے بھی اس کے سامنے ہار مان لی تھی۔ محض ایک پل کی نظر نے اسے شدید تکلیف سے بے نیاز کر دیا تھا۔ وہ اپنی مخصوص کرختگی اور مغرورانہ خوسمیت اس کے سامنے موجود تھا اور وہ دم بخود اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ سلجوق عمر کو دیکھ رہی تھی۔

"ہیلو مس! کیا اس وقت آپ مجھے دیکھ اور سن سکتی ہیں۔" استہزائیہ انداز میں کہتے ہوئے اب وہ بختاور کی آنکھوں کے سامنے اپنا ہاتھ ہلا رہا تھا۔ بختاور جیسے ایک پل میں ہی ہوش میں آ گئی تھی' تاہم اپنے شرمندہ تاثرات زائل کرنے کی خاطر وہ دانستہ اسے نظر انداز کر کے از خود اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر پہلی ہی کوشش کے نتیجے میں اس کے چہرے پر شدید اذیت کے آثار نمودار ہونے لگے تھے جسے سلجوق عمر نے بطور خاص نوٹ کیا۔ چند ساعت کے توقف کے بعد اس نے بختاور کا بازو تھام کر اپنے مقابل کھڑا کیا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اب بھی اس تماشے سے محظوظ ہو رہی تھی۔ بختاور ایک جھٹکے سے اپنے بازو کو اس کی سخت گرفت سے آزاد کرواتے ہوئے غرائی "ڈونٹ ٹچ می" انداز اور لہجے میں قطعیت اور ناگواری تھی۔ مگر سلجوق عمر اس کے کسی انداز سے متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس کا بازو تھام کر زبردستی اسے اپنی گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر دھکیل دیا۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے۔" وہ ایک بار پھر چلائی' مگر اس بار بھی سلجوق عمر پر اس کی اس چیخ پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ فرنٹ ڈور ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ بند کرنے کے بعد اس نے بختاور کے سڑک پر بکھرے

شاپنگ بیگز کو عقبی سیٹ پر منتقل کیا اور پھر اسی سکون سے گاڑی اسٹارٹ کر کے لوگوں کے ہجوم سے باہر نکال لایا۔ چند لمحوں بعد اس کی کرخت آواز ایک بار پھر گاڑی میں گونجی تھی۔

"دیکھیے محترمہ! میں جانتا ہوں ہمارے ملک میں فارغ لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے' لیکن میرا شمار آپ جیسے لوگوں میں نہیں ہوتا۔ مجھے دن میں سو کام کرنے ہوتے ہیں' اگر میں وہاں آپ کے نخرے اٹھانے لگتا تا تو مجھے اپنے بہت سے پراجیکٹ سے ہاتھ دھونا پڑتے' جس سے آپ کو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن میرے کیرپیر پر آنچ آسکتی تھی۔" ترش انداز میں وہ اپنے گزشتہ عمل کی توجیہ پیش کر رہا تھا اور بختاور بخوبی جانتی تھی کہ ان سو کاموں میں آئی بی اے کی لڑکیوں کو اپنے پیچھے دیوانوں کی طرح چکر لگاتے ہوئے دیکھنا بھی شامل تھا۔

"اگر کسی زخمی کو ہسپتال لے جانا بے ہودگی ہے تو میرا خیال ہے بحیثیت قوم ہمیں ایسی بے ہودگیاں کرتے رہنا چاہیے کم از کم مجھے تو اپنی اس بے ہودگی پر فخر ہے۔ آپ کو تو میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں آپ کو اس ملک کے نوّے فیصد لوگوں کی طرح زخمی حالت میں چھوڑ کر فرار نہیں ہوا وہ بھی اس صورت میں جب قصور میرا نہیں بلکہ خود زخمی کا ہے۔" وہ شاید بختاور سے یہ توقع کر رہا تھا کہ وہ اس کے اس عمل کو سراہے گی' اس کی ممنون ہوگی اور اسی انداز میں اس کی شکر گزار ہوگی۔ توقع کے برخلاف ایسا کچھ نہ ہونے پر جواباً وہ خود ہی اپنی خوبیوں پر رطب اللسان تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس شخص کی گاڑی سے چھلانگ لگا دے۔ سزا کی حد تک استہزائیہ لہجہ اب بختاور کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

کلینک کے سامنے گاڑی روک کر اس نے جس انداز میں بختاور کو گاڑی میں بٹھایا تھا اسی انداز میں کھینچتا ہوا اس کی شدید تکلیف کی پروا کیے بغیر اندر لے آیا۔

ڈاکٹر نے بغور اس کے ماتھے کے زخم کا جائزہ لیا پھر سلجوق عمر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں' زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔"

"واٹ ربش! ان کے لیے کون پریشان ہو رہا ہے۔" اس کی سرگوشی اتنی بلند ضرور تھی کہ بختاور اسے باآسانی سن چکی تھی۔ اس نے ایک دم اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ ماتھے کے زخم کی بینڈیج کرنے کے بعد اب ڈاکٹر نے اس کے بائیں بازو پر لگی خراشوں کا جائزہ لینے کے لیے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے بے اختیار درد کی شدت کے تحت اپنے ساتھ کھڑے سلجوق عمر کا ہاتھ تھام لیا۔

"اوہو!" ڈاکٹر کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"اینی سیریس پرابلم ڈاکٹر؟" اپنے بازو کو اس کے ہاتھ کی سخت ہوتی گرفت سے آزاد کراتے ہوئے اس نے ڈاکٹر سے دریافت کیا۔

"میرا خیال ہے ان کے ہاتھ میں فریکچر ہے۔" ڈاکٹر نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

"او شٹ!" سلجوق عمر نے بے اختیار کہا تھا۔

جب تک اس کے بائیں بازو پر پلاسٹر چڑھایا جاتا رہا' اس کی نظروں کا ارتکاز کمرے میں پریشانی سے ٹہلتے ہوئے سلجوق عمر پر مرکوز رہا۔ وہ مسلسل کمرے میں ٹہلتے ہوئے اپنی رسٹ واچ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ چند منٹ کے توقف کے بعد اس نے اپنی جیکٹ کی جیب سے سیل فون نکال کر چند بٹن پش کیے تھے بختاور کی تمام تر حسیات اس شخص پر مرکوز تھیں۔

صحیح کہا تھا نادیہ نے وہ واقعی ایک غیر معمولی شخصیت کا مالک تھا اور اگر مائرہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی تھی تو یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہ تھی۔ اس کو اس قدر قریب سے دیکھنے کے بعد وہ یہ حقیقت تسلیم کر چکی تھی کہ اگر یہ شخص مغرور تھا تو بالکل بجا تھا۔ سلجوق عمر خود اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر چکا تھا' تاہم اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے وہ فون پر دوسری طرف سے ابھرتی آواز کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"یار! میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔" بختاور بخوبی جانتی تھی کہ مصیبت کسے کہا گیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ خاموشی سے اسے سن رہی تھی' ایسے جیسے اس شخص نے اسے مسمرائز کر دیا ہو۔ چند منٹ تک سرگوشیوں میں گفتگو کرنے کے بعد اب اس کے چہرے پر کچھ اطمینان جھلکنے لگا تھا۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد اب وہ ڈاکٹر سے دریافت کر رہا تھا۔

"اور کتنی دیر لگے گی؟"

"بس پندرہ منٹ' پھر آپ انہیں لے جا سکتے ہیں۔" ڈاکٹر نے جیسے اسے تسلی دی۔ وہ طمانیت بھرا سانس لیتے ہوئے اب گھڑی کی بجائے اس کا پلاسٹر زدہ ہاتھ دیکھ رہا تھا۔

پے منٹ کرنے کے بعد ڈاکٹر نے اسے میڈیسن سلپ تھمائی جسے اس نے لاپروائی سے تھاما تھا۔ اس سے پہلے کہ ڈاکٹر اسے اس سلسلے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بارے میں کچھ ہدایت دیتا۔ وہ اسی طرح بختاور کا ہاتھ تھام کر کلینک سے باہر نکل آیا۔ وہ اپنی گاڑی کی اور بڑھا مگر وہ متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ سلجوق عمر فرنٹ ڈور کھول کر ناگواری لیے اس کے بیٹھنے کا منتظر تھا۔ معاً اس نے بختاور کو ایک قریب سے گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے دیکھا اور پھر وہ اس ٹیکسی میں سوار ہو کر شاید ڈرائیور کو ایڈریس سمجھا رہی تھی۔ سلجوق عمر نے ٹیکسی کو اپنے قریب سے برق رفتاری سے گزرتے دیکھا تھا۔ اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ میں متحیر انداز میں اجنبی نظروں سے پاپا کو دیکھ رہی تھی۔ وہ جس طرح ہنس رہے تھے اس نے مجھے شاک میں مبتلا کر دیا تھا۔ کرمانی انکل کے ساتھ گفتگو کے دوران انہوں نے کتنے قہقہے لگائے تھے اس کا کوئی شمار نہ تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کرمانی انکل کے ساتھ پاپا نہیں بلکہ کوئی اور شخص بیٹھا ہو جسے میں نہیں جانتی بلکہ اس گھر کا کوئی فرد نہیں جانتا' مگر حیرت کی بات تھی کہ اس چیز کا نوٹس صرف میں لے رہی تھی' مما انیسہ آنٹی کے ساتھ نجانے کن باتوں میں مصروف تھیں کہ وہ پاپا کا وہ روپ نہیں دیکھ پائی تھیں جسے میں نے دیکھا تھا۔ ارتضیٰ' معیز اور دوسرے کزنز کے ساتھ بیٹھا کون سی الجھن سلجھا رہا تھا کہ وہ اس الجھن کی جانب توجہ ہی نہیں دے پایا۔ پاپا کا ہنسنا کوئی عام بات تو نہ تھی۔

میں اب بھی ایک ٹک پاپا کو دیکھ رہی تھی اور شاید پاپا میری نظروں کا ارتکاز اپنے چہرے پر محسوس کر چکے تھے' تبھی یکلخت ان کی گفتگو کا سلسلہ ٹوٹ گیا' مسکراتے ہونٹ اب اپنے سابقہ انداز میں ایک دوسرے میں پیوست ہو چکے تھے۔ چند ساعت بعد مجھے ان کی آواز اپنی سماعت پر کسی چابک کی طرح پڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ بظاہر یہ آواز خوشگوار اور خوش کن لبادے میں ملفوف تھی۔

"عینی بیٹا! خادم حسین سے کہہ کر کافی کا انتظام کرواؤ' میرا خیال ہے سب ہی کو طلب ہو رہی ہوگی۔" انہوں نے اپنے اردگرد بیٹھے افراد کو تائیدی انداز سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ مسکراتے چہرے پاپا کی تائید کر رہے تھے۔ میں مرے مرے قدموں سے چلتی ہوئی کچن میں آگئی۔ خادم حسین کو کافی کا کہہ کر میں وہیں کھڑے ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ میری اس حرکت کو خادم حسین نے بھی محسوس کیا تھا۔

"آپ کو کچھ چاہیے عینی بی بی؟"

"نہیں! تم کافی بناؤ۔" حکمیہ انداز میں کہتے ہوئے میں ہنوز وہیں کھڑی خادم حسین کو کافی بناتے ہوئے دیکھتی رہی مگر درحقیقت میرا دماغ پاپا کے غیر متوقع رویہ کی جانب اٹکا ہوا تھا۔

آج پہلی بار مجھے پاپا کے سامنے اپنی ایکٹنگ بودی اور فضول محسوس ہوئی تھی' لیکن نہیں پاپا ایکٹنگ نہیں کر رہے تھے کوئی ایکٹنگ کرتے ہوئے اتنی جاندار ہنسی ہنس سکتا تھا؟

پاپا کی خاموشی اور ان کے غصے نے میری زندگی کو

خوف کی پرچھائیوں میں دھکیل دیا تھا۔ میں ساری زندگی کبھی ایسے نہیں ہنسی تھی جیسے پاپا ہنس رہے تھے میری زندگی کا ہر لمحہ تو مختلف اندیشوں اور وسوسوں سے مزین تھا اور یہ اندیشے تھے پاپا کی ناراضی اور ان کا غصہ' میرے ہر خوف کا پس منظر پاپا کے رویہ سے وابستہ تھا۔ لیکن میں نے کبھی اپنے اردگرد رہنے والے لوگوں کو اس چیز کی ہوا تک لگنے نہیں دی تھی۔ لگنے دیتی بھی تو کیسے' یہ کوئی مثبت چیز تو نہیں تھی کہ میں اس کا اعلان کرتی پھرتی۔ مگر اس کے باوجود لوگوں کا سامنا کرنے کا خوف پروان چڑھتا رہا اور اسے پروان چڑھانے والا بالکل بے نیاز تھا۔ نجانے کیسے معیز میری شخصیت کا یہ کمزور پہلو جان گیا تھا' یہی نہیں ارتضٰی کے ساتھ مل کر اس نے کئی بار اس حوالے سے میرا ریکارڈ لگایا تھا۔ بظاہر میں نے اس جانب چنداں توجہ نہ دی تھی مگر درحقیقت مجھے معیز کا یہ انداز بہت کھلتا تھا۔

برتنوں کی خفیف سی آواز مجھے خیالوں سے کھینچ لائی۔ خادم حسین ٹرالی میں ٹی سیٹ کر رہا تھا گاہے بگاہے وہ مجھ پر ایک نظر ڈالتا' شاید وہ یہ اندازہ لگانا چاہ رہا تھا کہ میں ٹرالی خود لے کر جاؤں گی یا پھر اسے ایسا کرنا ہو گا۔

"تم یہ ٹرالی لے جاؤ۔" وہ تو جیسے اس حکم کا منتظر تھا۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ کافی سرو کی جا چکی ہو گی تب میں لان میں آئی تھی۔

میں جانتی تھی کہ پاپا میرے منتظر ہوں گے' وہ شاید یہ توقع کر رہے تھے کہ میں ٹرالی لے کر خود آؤں گی ورنہ بطور خاص مجھے کافی کا کہنے کا اور کیا مقصد ہو سکتا تھا' حالانکہ اردگرد کافی ملازمین موجود تھے وہ کسی سے بھی کہہ سکتے تھے۔ وہ یقیناً اپنے امپریشن کو تقویت دینا چاہ رہے تھے۔ جو وہ کئی بار اپنی اولاد کے ساتھ بے تکلفی کا برتاؤ کر کے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں پر ڈال چکے تھے۔ اس امپریشن کی زد میں' میں کئی بار آئی تھی۔ مگر آج دانستہ پاپا کو نظر انداز کرنا میرے لیے تقویت آمیز تھا۔ ان کے رشتہ داروں کے سامنے ان کے مصنوعی محبت بھرے انداز کے اظہار کو برداشت کرنا اب میرے لیے ناقابل برداشت تھا' میرے لیے ان کا حقیقی رویہ ہی کافی تھا' میں اسی رویے کی عادی تھی' ان کی سرد مہری' تنفر' شکنوں سے معمور چہرہ پر ان کی ہنسی کوئی خول نہیں چڑھا سکتی تھی۔

آج پہلی بار میں پاپا کو جان پائی تھی۔ بچپن میں جو اندازے میں نے پاپا کی شخصیت کے بارے میں لگائے وہ محض سطحی نوعیت کے تھے' درحقیقت پاپا ایک نہیں بلکہ کئی سطحوں پر جینے کے عادی تھے۔ اپنے گھر والوں کے سامنے' اپنے رشتہ داروں کے سامنے' اپنے دوستوں کے سامنے' اپنی اولاد کے سامنے' اپنی بیوی کے سامنے۔ ان کے کئی روپ تھے۔ میں جانتی تھی کہ تمام سطحوں کی گہرائی میں کچھ ایسا ضرور تھا کہ جس نے ان کی شخصیت کو میری نظر میں ایک مسٹری بنا دیا تھا۔ فقط اپنی پسند کی شادی انہیں اس حد تک دوغلی زندگی جینے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ پہلے میں محض ان سے شاکی تھی مگر اب اس راز کو جاننے کی متلاشی تھی جو میرے والدین مجھ سے چھپا رہے تھے۔ پہلے میں ان کا ہر رویہ قبول کرتی تھی مگر اب میں ان کا رویہ برداشت کر سکتی تھی مگر قبول نہیں۔

پاپا کا امپریشن کس کروٹ بیٹھا تھا میں نے نہ تو جاننے کی کوشش کی اور نہ ہی ان کی جانب دیکھنے کی۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے لیے کوئی کونا تلاش کر رہی تھی کہ ارتضٰی نے مجھے پکارا۔

"عینی! بس ہو گیا کام اب تم یہاں آ کر بیٹھ جاؤ۔" ارتضٰی نے اپنے ساتھ رکھی کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے ایک طائرانہ نظر اس کے اردگرد بیٹھے افراد پر ڈالی' یہاں تمام ینگ جنریشن براجمان تھی اور ظاہر ہے ہر ایک کے پاس گفتگو کا نہ ختم ہونے والا اسٹاک موجود تھا جسے بے دریغ استعمال کیا جا رہا تھا۔

میں معیز کی مسکراتی نظروں کو نظر انداز کرتے ہوئے خاموشی سے ارتضٰی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ چند منٹ بعد ہی مجھے بوریت اور بے زاری کا شدید احساس ہوا' میں ناچاہتے ہوئے بھی فارینہ اور مہرین کے فیشن پر کیے جانے والے تبصرے سن رہی تھی۔

فارینہ گاہے گاہے مجھے مخاطب کرتے ہوئے مجھ سے اپنے پوائنٹ آف ویو کی تائید لیتی اور پھر دوبارہ مہرین کے ساتھ مصروف ہو جاتی۔ فہد' زین' معیز اور منہاج کے پاس اپنی یونیورسٹی کے چند قصے تھے جنہیں وہ نجانے کب سے شیئر کر رہے تھے اور تو اور مجھے بڑے اصرار سے اپنے پاس بٹھانے والا ارتضٰی مجھے بھول کر ان قصوں پر سر دھن رہا تھا۔ میں کوفت اور بے زاری کے ساتھ پہلو بدل رہی تھی۔

کافی کے ختم ہوتے ہی بتدریج ان چیدہ چیدہ افراد کی محفل بھی اپنے اختتام کی جانب بڑھنے لگی۔ کسی کو اپنا آفس یاد آنے لگا' کسی کو خیال آیا کہ اس کے سونے کا ٹائم ہو چکا ہے۔ کوئی اپنے پیرنٹس کو اٹھتا دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا' کسی کا کل ٹیسٹ تھا۔ مگر ایک شخص ایسا بھی تھا جس کے پاس فرصت ہی فرصت تھی اور وہ تھا معیز حیدر۔

جب میں فارینہ اور اس کی امی کو رخصت کر کے واپس آئی تو موموکو اپنا منتظر پایا۔

"عینی! یہ کھل نہیں رہا' پلیز اسے کھول دو۔" ایک بڑا سا گفٹ تھامے وہ اسے کھولنے کی سعی میں مصروف تھی مگر کھول نہیں پا رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے پاس بیٹھ کر گفٹ ریپر کھولنے لگی۔ حالانکہ ارادہ تو یہی تھا کہ اپنے کمرے کی راہ لوں گی۔ مگر موموکا کہا بھی نہیں ٹالا جا سکتا تھا ایک کے بعد ایک گفٹ کھول کر میں اس کے سامنے رکھتی جا رہی تھی اور اپنی پسند کے گفٹس دیکھ کر موموکی خوشی کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔

معیز اور ارتضٰی آہستہ آواز میں پتا نہیں کیا ڈسکس کر رہے تھے' میں نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر میرے کان اس وقت کھڑے ہوئے جب مجھے معیز کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی۔ وہ بڑی شدومد سے فارینہ کی ذہانت اور اس کی خود اعتمادی کے گن گا رہا تھا اور ارتضٰی اس کی ہر بات کے جواب میں محض ایک فقرے کا ورد کیے جا رہا تھا کہ "تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اور اس کے بعد معیز ایک بار پھر اس توصیفی تقریر میں مصروف ہو جاتا۔ میں بادل نخواستہ اس لن ترانی کو سن رہی تھی' حالانکہ ان دونوں کی جانب سے فارینہ کی شان میں تعریف و توصیف کے جو دریا بہائے جا رہے تھے اسے سن کر خود فارینہ کا اپنی اس بے خبری پر حیران ہونے کا احتمال تھا۔ چونکہ فارینہ یہاں نہیں تھی لہٰذا میں اکیلی ہی حیران ہونے کے تمام تر فرائض ادا کر رہی تھی۔ میں جانتی تھی کہ مجھے بولنے پر اکسانے کی خاطر یہ معیز کی سوچی سمجھی اسکیم تھی اور یقیناً" اس اسکیم سے مشروط میرے رد عمل کا وہ بڑی شدت سے منتظر تھا۔ میں جانتے بوجھتے اس اسکیم کا حصہ بننا نہیں چاہتی تھی' لہٰذا بظاہر بڑے سکون کے ساتھ مگر حقیقتاً" اپنے ضبط کو آزما رہی تھی۔ میں اگر چاہتی تو یہاں سے اٹھ کر ان دونوں کے ارمانوں پر پانی پھیر سکتی تھی مگر اس عمل میں ایک مضائقہ ہو سکتا تھا اور وہ یہ کہ میرے اس طرح اٹھ جانے پر وہ مجھے بدخواہ' جیلس اور نجانے کیا کچھ کہنے والا تھا اور اس کی زبان پر بند باندھنا کسی کے بھی بس میں نہ تھا۔

میں بڑی خاموشی اور صبر کے ساتھ فارینہ کے ان خفتہ پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ سنتی رہی۔ مگر جب یہ لایعنی گفتگو میرے اور فارینہ کے موازنے کی طرف بڑھنے لگی' تب میرے ضبط کی تمام ڈوریں ایک کے بعد ایک ٹوٹتی چلی گئیں۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی' ایسے جیسے کہ کسی نے مجھے زبردستی بٹھائے رکھا ہو۔

"دیکھو معیز! میرا اور فارینہ کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔" میں مزید کچھ کہتی جب معیز نے میری بات کاٹ دی۔

"مائی ڈیئر کزن! میں بھی تو یہ کہنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ بھلا تمہارا اور فارینہ کا مقابلہ ہو سکتا ہے ایک بولڈ اور کانفیڈنٹ لڑکی کے سامنے ایک ڈرپوک اور خوف کی ماری لڑکی کی دال گل سکتی ہے۔" وہ بڑے کاٹ دار لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"میں ڈرپوک نہیں ہوں معیز!" معیز کے دو ٹوک لہجے کے سامنے مجھے اپنا انداز احتجاج کرتا محسوس ہوا۔

”ان فیکٹ عینی! میں تمہارے اس نام نہاد دعویٰ کی تائید نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں تم جو بات سوچ رہی ہوتی ہو میں اسے تمہارے چہرے سے پڑھ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم کس قدر خوفزدہ رہنے والی مخلوق ہو۔ لوگوں کا سامنا کرنے سے تم کتراتی نہیں ' بلکہ خوفزدہ ہوتی ہو۔ ہجوم والی جگہوں پر تمہارے دل میں جس قسم کے اندیشے جنم لیتے ہیں میں ان سے بھی باخوبی واقف ہوں۔ اب بھی تم مجھے جھٹلا کر محض اپنی انا کے علم کو بلند کیے ہوئے ہو ' حالانکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں جو کہہ رہا ہوں اس میں کتنا فیصد سچ ہے۔“

یہ بات تو طے تھی کہ میں کبھی بھی معیز سے نہیں جیت سکتی تھی۔ کسی بھی بحث کے لیے اس کے پاس موافقت اور مخالفت میں ہزاروں دلائل ہوتے تھے ' ان دلائل کا استعمال وہ جس خوب صورتی اور خود اعتمادی سے کرتا تھا۔ مقابل حق پر ہونے کے باوجود اپنے تمام تر ہتھیار اس کے سامنے ڈالنے پر مجبور ہو جاتا تھا اور آج تو وہ حق پر تھا ' لہٰذا میرے پاس اپنی مدافعت میں بولنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ بابا نے کچھ چھوڑا ہی نہیں تھا میرے پاس ان کے بھرم کا پاس رکھتے رکھتے میں آج اس مقام پر آ گئی تھی کہ اپنا بھرم ٹوٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ میرے M.B.A نہ کرنے کی وجہ جان کر ہی میری جان چھوڑے گا۔ وہ بھی اس صورت میں جب میرے پاس تو کیا بابا کے پاس بھی اس کی کوئی وجہ نہ تھی اور اگر تھی تو اس پر سے پردہ اٹھایا جانا باقی تھا اور میں جانتی تھی کہ مجھے ہی یہ کام کرنا تھا۔

موموکا ہاتھ تھام کر کھڑے ہوتے ہوئے میں نے معیز کو مخاطب کیا تھا۔

”پتا نہیں تم کیا کہنا چاہتے ہو ' میں جانتی ہوں تمہاری اس فضول بحث کا کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ تمہاری یہ عادت بن چکی ہے ' تمہارے پاس شاید تسکین حاصل کرنے کا بس ایک یہی ذریعہ ہے۔ لیکن میں فی الحال تمہاری اس تسکین کا ذریعہ نہیں بن سکتی۔ میں تم سے الجھنا نہیں چاہتی۔“ میں موموکا ہاتھ تھام کر اندر کی طرف بڑھنے لگی جب میں نے ایک بار پھر معیز کو سنا تھا۔

”میری بحث کبھی بے مقصد نہیں ہوتی ' مائنڈ یو ' میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں ایم بی اے میں ایڈمیشن نہ لینے کی وجہ تمہارا خوف ہے یا پھر کوئی اور وجہ ہے ' ویسے مجھے نہیں لگتا کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔“

مجھے اپنے اندر کسی چیز کے ٹوٹنے کا احساس ہوا تھا۔ زندگی میں میں نے کبھی اپنے کسی خوف کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے تھے ایسا صرف میں نے بابا کے ساتھ کیا تھا ایک بار نہیں بار بار۔ اپنی آنکھوں کی نمی کو معیز اور ارتضیٰ سے چھپانے کی خاطر میں بے اختیار اپنا سر جھکا گئی لیکن آج معیز کے سامنے ہتھیار ڈال کر میں خود کو مزید خود ترسی میں مبتلا کرنا نہیں چاہتی تھی۔

”ضروری نہیں ہے معیز! تمہاری ہر فضول گفتگو کے جواب میں میری کوئی رائے ہو اور جس کا میرا تمہارے سامنے پیش کرنا بھی ضروری ہو۔ بہتر ہوتا کہ تم یہ ساری گفتگو فارینہ کے سامنے کرتے ' اسے بھی پتا چل جاتا کہ اسے بھی سراہنے والا ہے کم از کم وہ خوش ہی ہو جاتی۔“

”اس کا مطلب ہے تم خوش نہیں ہو۔“ برجستہ کہتے ہوئے وہ گہری اور جانچتی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

”میں تمہاری طرح جیلس نہیں ہوں۔“ صحیح معنوں میں اب مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا۔ ارتضیٰ بڑی خاموشی سے ہم دونوں کے مابین ہونے والی اس تلخ کلامی کو سن رہا تھا مگر اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔

”جیلس۔۔۔!“ وہ حیران ہوا ”اگر جیلس ہوتا نا تو تمہارے ساتھ اتنی مغزماری نہ کر رہا ہوتا بلکہ یہ کہہ کر تم پر لعنت بھیجتا کہ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری رونی صورت۔ اگر تم آئی بی اے میں ایڈمیشن لینا نہیں چاہتیں تو میں کیوں تمہیں انسسٹ کر رہا ہوں؟ اگر تم خود کو زنگ لگانے پر تل گئی ہو تو میں کیوں پریشان ہو رہا

ہوں؟ مگر میرا ایک پرابلم ہے عینی! کہ میں تمہاری پروا کرتا ہوں اتنی ' جتنی تمہیں خود بھی اپنی پروا نہیں ہے۔ میں اپنی فطرت سے نہیں لڑ سکتا۔“ وہ متاسف انداز میں کہہ رہا تھا۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ ایک بار پھر گویا ہوا۔

”کل جب فارینہ میرے پاس آئی تھی کہ میں اسے M.B.A کے لیے Aptitude ٹیسٹ کی تیاری میں مدد دوں تو مجھے فی الفور تم پر غصہ آیا تھا۔ پتا نہیں کیوں میں فارینہ کی جگہ تمہیں ایکسپیکٹ کر رہا تھا۔“ میں شرمندہ نہیں تھی پھر بھی سر جھکائے کھڑی تھی۔ بعض اوقات اپنے کسی بھی عمل کے جواب میں دینے کو ڈھیروں دلائل ہوتے ہیں مگر زبان کچھ کہنے سے قاصر رہتی ہے ' میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہو رہا تھا مگر میری زبان بندی میں جو چیز سب سے زیادہ تکلیف دہ تھی وہ یہ کہ میں خود کو بولنے پر اکسانے کی شعوری کوشش کر رہی تھی مگر پھر بھی کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔

”تمہارے لیے گریجویشن ہی کافی ہے۔“ اس تضحیک آمیز جملے ہی کی تو میں لاج رکھ رہی تھی۔ میں یہ تضحیک معیز سے شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ میں لب بھینچے موموکا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ایک ایشو بن جائے گا۔

☼ ☼ ☼

اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ایک ایشو بن جائے گا۔ مگر حقیقت یہ تھی اس کا ایکسیڈنٹ گھر میں ایک اہم ایشو کی نوعیت اختیار کر گیا تھا۔

وہ جب سلجوق عمر کو نظر انداز کرتے ہوئے قریب سے گزرتی ٹیکسی میں بیٹھی تھی تو اس کے پیش نظر محض ایک چیز تھی اور وہ یہ کہ وہ اس مغرور شخص کا مزید احسان لینا نہیں چاہتی تھی۔ اگرچہ کہ سلجوق عمر کا اسے ہسپتال لے جانا اور پھر اسے ہسپتال چھوڑ کر اپنی راہ لینے کی بجائے وہیں اس کے پاس رہنا شاید اس کے اپنے نزدیک احسان ہی تھا۔ مگر اس کے اس احسان نے بختاور کو حقارت کے علاوہ دوسرا اور کوئی احساس نہیں دیا تھا اسی چیز نے اسے احساس دلایا تھا کہ بعض لوگ کبھی کسی پر احسان نہیں کر سکتے اور اگر کرتے ہیں تو نبھا نہیں سکتے۔ واپسی میں وہ ایک بار پھر اس ذمہ دار شہری کی تلخ باتیں سننا نہیں چاہتی تھی تب ہی اپنے قریب آتی ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اس کے ذہن میں محض اپنی عزت نفس کا خیال تھا۔

کھڑکی سے جھانکتے ہوئے وہ اس شخص کے چہرے کے بگڑے تاثرات کو دیکھ سکتی تھی۔ وہ یقیناً دل ہی دل میں اسے گالیوں سے نواز رہا تھا کم از کم اس کے چہرے سے تو یہی عیاں تھا۔ بختاور کو اس وقت نہ تو اس کے غصے کی پروا تھی اور نہ ہی ۔۔۔ اس کی گالیوں کی۔ وہ فی الحال گھر پہنچنا چاہتی تھی۔

دادو اور ممی تفکر اور تشویش آمیز انداز میں اس کے ہاتھ پر بندھے پلاسٹر کو دیکھ رہی تھیں۔ بختاور کو ایک شرمندگی نے آ گھیرا۔ اسے اندازہ تھا کہ گزشتہ چند گھنٹوں سے ان دونوں پر کیا بیت رہی ہو گی۔

”یہ کیا ہوا بختاور!“ ممی نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کے ہاتھ کو چھوا تھا۔ ان کی ہمدردی پاتے ہی اسے اپنی آنکھیں بھیگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔

”ڈونٹ وری ممی! بس معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔“ جواب میں اس نے ممی کے پریشان چہرے کو یکدم غصے سے سرخ ہوتے دیکھا۔

”یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے کیوں جانے دیا آپ نے اسے اکیلے خدانخواستہ اگر کچھ ہو جاتا تو۔“ جواب میں دادو اسی ترشی کے ساتھ گویا ہوئیں۔

”اگر تم گھر پر ٹک کر بیٹھنے کی عادی ہوتیں تو یہ بھی باہر جانے سے گریز برتتی۔ تمہاری آزادی یقیناً ”اتنی رنگین“ لیے ہے کہ مجھے اس کی تربیت نئے سرے سے کرنی پڑ رہی ہے اور تم ہو کہ الٹا مجھ پر ہی الزام تھوپ رہی ہو۔“ ممی کے چہرے پر یکدم سرخی چھا گئی۔ ان دونوں کو تو ویسے بھی لڑنے کے لیے کسی بہانے کی کبھی ضرورت نہیں پڑی تھی اور آج تو بختاور نے انہیں ایک بھرپور موقع فراہم کیا تھا۔

"ٹھیک ہے میں تو کبھی ٹک کر گھر پر نہیں بیٹھتی آپ تو بیٹھتی ہیں۔ آپ تو اس پر چیک رکھ سکتی ہیں۔ مگر آپ کو تو اپنی ضرورتیں یاد آئی ہیں کیا ضرورت تھی اسے اس طرح مارکیٹ بھیجنے کی اگر خدانخواستہ کوئی سیریس ایکسیڈنٹ ہو جاتا تو۔"

اس سے پہلے کہ دادو' انہیں کوئی منہ توڑ جواب دیتیں وہ درمیان میں ٹوکتے ہوئے چیخ پڑی۔

"ممی اینف از اینف! دادو نے مجھے کہیں نہیں بھیجا ۔ مجھے نادیہ کے لیے برتھ ڈے پریزنٹ لینا تھا ۔ ڈرائیور اگر آپ کے ساتھ نہ گیا ہوتا تو میں کبھی خود نہ جاتی۔" نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے تیز لہجے میں بولنا پڑا تھا۔ مگر ان دونوں کو میری تکلیف کی پروا ہی نہیں تھی۔ ممی اپنی خفت مٹانے کی خاطر پاؤں پٹختی اپنے کمرے میں چلی گئیں جبکہ وہ وہیں دادو کے شانے سے سر ٹکائے صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آئی ایم سوری دادو! پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں بغیر دیکھے سڑک کراس کرنے لگی تھی۔ اب اس کا نتیجہ بھی تو نکلنا تھا۔" دادو واقعی اس سے ناراض تھیں۔

"اب اس سوری کا کیا فائدہ تمہاری ماں تو مجھے سو باتیں سنا کر چلی گئی۔"

"آئی ایم سوری دادو!" اس نے ایک بار پھر معذرت خواہانہ انداز اپنایا۔

"کوئی سوری ووری نہیں۔

اب تم یہاں آرام سے لیٹو میں ابھی تمہارے لیے گرم گرم دودھ میں ہلدی ڈال کر لاتی ہوں۔" اس نے برا سا منہ بنایا۔ وہ اس کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

ان کے کمرے سے جاتے ہی اس نے اپنی آنکھیں موند لیں اور پھر اس نے ایک دم اپنی آنکھیں کھول دیں۔ پتا نہیں یہ اس کے لاشعور میں بسا چہرہ تھا یا پھر شعوری طور پر اپنی آنکھوں کے پردے پر وہ اس شخص کے چہرے کو دیکھ رہی تھی جس سے پہلی ملاقات اس قدر خوشگوار نہ تھی کہ اس کا چہرہ اس کی آنکھوں میں بس جاتا۔ درحقیقت اس شخص کے حوالے سے اس کے دل میں محض تنفر تھا غصہ تھا۔ مگر آنکھیں بند کرنے پر وہ بار بار اس چہرے کو کیوں دیکھ رہی تھی۔ یہ سوال ایک معمہ سا بن گیا تھا۔

"تو کیا میرا شمار بھی I.B.A کی ان لڑکیوں میں ہوتا ہے جو ظاہری شان و شوکت اور خوب صورتی پر مرتی ہیں۔"

اسے یاد تھا کہ اس نے کس زعم سے تفخر آمیز انداز میں نادیہ کو اسی انداز میں جواب دیا تھا جب وہ سلجوق عمر کی توصیف میں آسمان اور زمین ایک کیے دے رہی تھی۔ اسے جیسے اپنے اس عمل پر ملال ہونے لگا تھا اور پھر جیسے یہ ملال ایک مادی وجود بن گیا۔

بعض اوقات اپنے کسی بھی عمل کی توجیہ خود کو دینا کس قدر دشوار کن ثابت ہوتا ہے اس لمحے وہ بھی اسی دشواری کا سامنا کر رہی تھی۔ تب اس نے سوچا تھا کہ کاش یہ سب ایک خواب ہوتا سلجوق عمر کو دیکھنا' یہ حادثہ اور پھر اسے سوچنا یہ سب خواب ہوتا مگر بعض اوقات خواب زندگی میں کتنی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں جیسے کہ یہ حادثہ!

اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں' اسے اپنی آنکھوں میں چبھن محسوس ہوئی تھی۔ مگر اس نے اپنی آنکھوں کو بند ہی رکھا۔ وہ اس وقت کسی کا بھی سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی دادو کا بھی نہیں' بلکہ وہ تو خود اپنے آپ سے نظریں چرانے پر بھی قادر نہ تھی جس کی خواہش اس لمحے شدت اختیار کر گئی تھی۔ اس شخص نے ایک ہی پل میں اس کا غرور توڑ دیا تھا' کتنے مان سے وہ خود کو آئی بی اے کی ان لڑکیوں سے مختلف گردانتی تھی کہ جو ہر وقت سلجوق عمر کی باتیں کیا کرتی تھیں' اسے سوچتی تھیں۔ اب اسے خود سے زیادہ سلجوق عمر پر غصہ آنے لگا تھا۔ معاً" اسے کمرے میں دادو کی آمد کا احساس ہوا۔ مگر اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ انہیں یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ سو چکی ہے۔ غالباً" وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو چکی تھی کیونکہ دادو اس کے ماتھے پر پیار کر کے کمرے کی لائٹ

آف کر کے جا چکی تھیں۔ خود کو کوستے اور ملامت کرتے ہوئے نجانے اس کی آنکھ کب لگی اسے پتا نہیں چلا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو اس کی پہلی نظر راکنگ چیئر پر جھولتی نادیہ پر پڑی تھی' نادیہ کے ساتھ ہی رکھی کرسی پر بیٹھی سارہ کسی میگزین کی ورق گردانی میں مصروف تھی۔ غالباً" وہ دونوں اس کے اٹھنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ ان کے چہرے صاف اس بات کے غماز تھے۔

بختاور کے بیدار ہوتے ہی نادیہ سب سے پہلے اٹھ کر اس کے نزدیک آئی تھی۔

"مجھے اور ثاقب بھائی کو یہ امید نہیں تھی کہ تم میری سالگرہ والے دن ایسی نحوست پھیلاؤ گی۔" وہ ناراضگی سے کہہ رہی تھی۔ جبکہ اس عرصے میں سارہ بھی اس کے قریب آ گئی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" سارہ نے نرم لہجے میں دریافت کیا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے مختصراً" کہا۔ پھر اس نے نادیہ کی روتی صورت پر نظر ڈالتے ہوئے قدرے بلند آواز میں قہقہہ لگایا تھا۔

"تم کتنی ڈھٹائی سے دانت نکال رہی ہو بجنت! جانتی ہو آج کے دن ثاقب بھائی نے صرف تم سے ملنے کی خاطر شیرٹن میں بکنگ کروائی تھی۔ مجھے تو کبھی انہوں نے اتنی لفٹ نہیں کروائی کہ میری برتھ ڈے وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں سیلیبریٹ کرتے۔ کتنے خوش تھے وہ اور میں' میرے اعزاز میں ایسی شاندار پارٹی پہلی بار ہی تو کوئی دے رہا تھا۔ انہیں یقیناً" تم پر شک تھا تب ہی تو بار بار مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ وہ آ تو جائے گی اور میں کتنے یقین سے کہتی رہی کہ بے فکر رہیں وہ کم از کم میری سالگرہ مس نہیں کرے گی اور تم نے کتنے آرام سے میرا مان توڑ دیا۔" وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے اس نے جان بوجھ کر اپنا ایکسیڈنٹ کروایا ہو۔ بختاور نے صفائی اور وضاحت دینا ضروری نہیں سمجھا۔

"ابھی کچھ دیر پہلے وہ تمہیں دیکھ کر گئے ہیں۔" نادیہ نے لاپروائی سے کہا۔ وہ چونک کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"نادیہ! تمہارا مطلب ہے' وہ مجھے دیکھنے میرے کمرے میں آئے تھے۔"

"نہیں! وہ حمزہ بھائی کے کمرے میں گئے تھے تمہیں دیکھنے۔" نادیہ نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

"حد کرتی ہو بختاور' اب ظاہر ہے وہ تمہاری عیادت کے لیے تمہارے پاس ہی آئے ہوں گے نا۔ اور تم کتنے سکون سے نیند کے مزے لوٹ رہی تھیں بے چارے ایک گھنٹے تک تمہارے جاگنے کا انتظار کرتے رہے اور شاید انہیں احساس ہو گیا تھا تم نہیں اٹھنے والی' نجانے کتنے برسوں کی نیندیں پوری کر رہی ہو۔ لہٰذا انکل اور آنٹی کی وجہ سے چلے گئے' حالانکہ موصوف کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ انہیں یوں تم سے ملے بغیر جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا لیکن بے چارے کیا کرتے انکل اور آنٹی نے تکلفاً" بھی انہیں روکنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔" نادیہ کے اس تفصیلی لیکچر کے دوران سارہ مسلسل مسکراتی رہی اور وہ شرمندگی سے چہرہ جھکا گئی۔

"یہ بکے اور کارڈ وہ تمہارے لیے لے کر آئے تھے۔" سائیڈ ٹیبل پر رکھے بکے اور کارڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ اس نے کارڈ اٹھایا۔ وہ متذبذب انداز میں اسے تھامے ہوئے تھی۔

"پڑھ بھی لو' اگر میری وجہ سے شرما رہی ہو تو فارگیٹ اٹ! میں اسے پڑھ چکی ہوں اس لیے بے فکر ہو کر پڑھو۔" وہ بڑے آرام سے کہہ رہی تھی۔

"تم سے اور توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔" بختاور نے بغیر پڑھے کارڈ ایک سائیڈ پر رکھ دیا۔ معاً" دروازے پر دستک ہوئی۔ بختاور کے یس کہنے پر ملازم مؤدب انداز میں اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چند شاپنگ بیگز اور بختاور کا مخصوص ہینڈ بیگ تھا۔

"بختاور بی بی! یہ کوئی سلجوق عمر دے کر گئے ہیں۔" ملازم کے ہاتھ سے شاپنگ بیگز وصول کرتے ہوئے سلجوق عمر کے نام پر نادیہ نے ٹھٹھک کر اسے دیکھا۔ سارہ بھی اس نام پر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم جاؤ!" اس نے مدھم آواز میں ملازم کو جانے کا

کہا۔

"تمہارا ایکسیڈنٹ سلجوق عمر کی گاڑی کے ساتھ ہوا تھا۔" سارہ کی آواز میں اچنبھا تھا۔ وہ اپنا سر جھکا گئی۔ یہ ندامت سلجوق عمر کی گاڑی کے ساتھ ایکسیڈنٹ کے لیے نہیں تھی بلکہ ایکسیڈنٹ کے بعد وہ جس طرح اس کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اسی شرمساری نے اسے سر جھکانے پر مجبور کر دیا تھا اور پھر اسی شرمساری اور ندامت کا احساس ختم کرنے کی خاطر اس نے سر اٹھا کر ان دونوں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا تھا۔

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں سلجوق عمر سے فلرٹ کرنے کی ایک کوشش ضرور کروں گی کیا تم دونوں میرا ساتھ دو گی؟" دونوں کے چہروں پر یکدم مسکراہٹ نے اپنا ڈیرا جمالیا۔ پرجوش انداز میں سر ہلاتے ہوئے سارہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ جبکہ بختاور کی اس بات کے جواب میں نادیہ کے پاس الفاظ ہی نہ تھے۔ وہ حیران تھی مگر پریشان نہیں شاید لاشعوری طور پر وہ ایسا ہی چاہتی تھی۔

اب بختاور سلجوق عمر سے فلرٹ کرنے میں کامیاب ہوتی ہے کہ نہیں یہ ایک الگ معاملہ تھا فی الحال بختاور کا اس طرح راضی ہو جانا ہی تقویت آمیز تھا۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ بنا کوشش کیے مائرہ کے سامنے ہار مان لیتی۔ بختاور نے اپنا آپ جب اس معاملے میں گھسیٹا تھا وہ تھوڑی پرسکون ضرور ہوئی مگر اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ بختاور جتنی بھی ماڈرن بولڈ اور خود اعتماد تھی اتنی ہی اس کے لیے کسی سے فلرٹ کرنے کی کوشش ناگواری لیے ہوئے تھی اور اس چیز کا فوری تاثر بھی وہ دے چکی تھی مگر اب بختاور کو کون سا ڈر درپیش تھا وہ نہیں جانتی تھی اور جاننا بھی نہیں چاہتی تھی فی الحال اس کا راضی ہو جانا اس کے لیے تسکین آمیز تھا۔

پھر یہ ہوا کہ وہ تینوں اپنے سیکنڈ سمسٹر کی تیاری کرنے کی بجائے سلجوق عمر کو اسٹڈی کرنے لگیں۔ سارہ نے مکمل طور پر سلجوق عمر پر چیک رکھنے کی تمام تر ذمہ داری اپنے ذمے لے لی تھی۔ وہ کہاں کہاں جاتا ہے، کہاں کھاتا ہے، کتنے دوست ہیں، کون زیادہ قریبی ہے، آفس میں کتنا وقت گزرتا ہے اور گھر میں کتنا، آفس کے بعد کی کیا مصروفیت ہے۔ وہ اس کی تمام روٹین پر کسی ماہر جاسوس کی طرح نظر رکھے ہوئے تھی جبکہ نادیہ فلموں اور نفسیات کی کتابوں سے اپنے مطلب کا مواد اکٹھا کرنے میں مصروف تھی۔ پورا ایک ہفتہ لگا تھا انہیں اس کی ریسرچ کرنے پر اور پھر بہت غور و غوض اور تحقیق و تدقیق کے نتیجے میں تین نکاتی ایجنڈا تیار کیا گیا تھا جسے اکثریتی رائے شماری یعنی نادیہ اور سارہ کے اتفاق کرنے کے بعد منظور کر لیا گیا اور اب بختاور کا کام شروع ہو گیا تھا۔

"آج کل شیرٹن کی گیلری میں چند آرکیٹیکٹ کی بلڈنگز کے نمونوں کی نمائش ہو رہی ہے۔ اس کا کوئی کزن بھی اس نمائش میں حصہ لے رہا ہے اپنے کزن کی وجہ سے وہ بھی شیرٹن جائے گا۔" سارہ نے اپنی جاسوسی سے حاصل شدہ معلومات اس کے گوش گزار کی۔

"اس کا مطلب ہے کہ ہم بھی اس نمائش کو دیکھنے چلیں گے۔" نادیہ نے پرجوش انداز میں تائید چاہی سارہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ایک بار پھر بختاور کو مخاطب کیا۔

"دیکھو بختاور! تم اس کی طرف بالکل بھی نہیں دیکھو گی، لیکن بار بار اس کے سامنے ضرور آنا اتنا کم از کم وہ تمہیں دیکھ سکے۔" ایجنڈا کا پہلا نکتہ سمجھاتے ہوئے سارہ سنجیدہ تھی۔ ویسے بھی یہ ایک طرح کا جوا تھا جس میں جیتنے اور ہارنے کے برابر کے چانسز تھے۔ نفسیات دانوں کے نزدیک ایسے افراد جنہیں غیر معمولی ٹریٹ منٹ دیا جاتا ہے، انہیں متوجہ کرنے کے لیے انہیں اگنور کرنا ہی سب سے پہلا قدم ہونا چاہیے۔ جن رویوں کے وہ عادی ہوتے ہیں ان کے متضاد رویے اختیار کرنے سے ہی ان کی توجہ حاصل کی جا سکتی ہے۔ شیرٹن کے سامنے گاڑی روکتے ہوئے نادیہ اسے وہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ جس کی

بنیاد پر ہی اس کی دانست میں کامیابی کا دارومدار تھا۔

بظاہر وہ ڈسپلے شوکیسز میں سجے مختلف بلڈنگز کے ماڈل دیکھ رہی تھی مگر تمام تر حسیات اس وقت اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑے سلجوق عمر پر مرتکز تھیں۔ وہ یونہی شوکیس پر نظریں جمائے جمائے بظاہر آگے دیکھے بغیر چل رہی تھی اور اب اسے نادیہ کے مطابق سلجوق عمر سے ٹکرانا تھا اور سوری کہہ کر بغیر کسی تاثر کے آگے بڑھنا تھا گو کہ بہت کچھ سوچ کر وہ اس میدان میں کودی تھی مگر اب اس مقام پر اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ قصداً" سلجوق عمر سے ٹکرائی تھی اور پھر بغیر اس سے نظریں ملائے وہ نادیہ اور سارہ کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں کے مسکراتے چہرے اس بات کے غماز تھے کہ اس نے ٹھیک ٹھاک کام کیا تھا۔

"سلجوق عمر کے چہرے کے تاثرات کے بارے میں سوچ سوچ کر مجھے ہنسی آ رہی ہے۔" واپسی پر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر تقریباً" دراز نادیہ کی طمانیت انگیز ہنسی رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی جبکہ وہ کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے شاید اپنے اندر جھانکنے کی سعی کر رہی تھی۔ "یہ سب کچھ صحیح نہ تھا۔"

"اور کیا ۔۔۔ دیکھا تھا بختاور کے سوری کہنے کے جواب میں اس کے چہرے پر شناسائی کے کیسے تاثرات ابھرے تھے اور بختاور کا ہماری طرف مڑتے ہی اس کا چہرہ کیسے سپاٹ ہو گیا تھا۔" سارہ بھی اس کامیابی پر ضرورت سے زیادہ خوش تھی شاید انہیں اس قدر کامیابی کی توقع نہ تھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟ اتنی خاموش کیوں ہو۔۔۔؟" سارہ نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں! بس میرے ہاتھ میں درد ہے پلیز تم مجھے میرے گھر ڈراپ کر دینا۔" وہ اب بھی کھڑکی سے باہر جھانک رہی تھی۔

"ہاں درد تو تمہیں ہونا ہی تھا تم نے اس بچارے کو ٹکر بھی تو اتنی زور سے ماری تھی۔" نادیہ ایک بار پھر ہنسی۔ وہ دونوں کس قدر خوش تھیں، جبکہ وہ چاہنے کے باوجود خود کو مسکرانے پر مجبور نہیں کر سکی تھی۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ سب غلط تھا مگر جس انداز سے وہ سلجوق عمر کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ اس کے ہاتھوں کا لمس اب بھی اس کے ہاتھوں پر موجود تھا اور رات کی تنہائی میں وہ اس لمس کو چھو سکتی تھی۔ یہ بھی تو غلط تھا۔

"تو اب میں اتنا گلٹی فیل کیوں کر رہی ہوں۔" وہ سوچنے کے باوجود اپنی سوچ کو اس حصار سے آزاد نہیں کر پائی تھی۔

پھر یہ ہوا تھا کہ جہاں سلجوق عمر ہوتا وہاں بختاور کی موجودگی لازمی ہو جاتی مگر ہر بار بختاور اسے نظرانداز کر کے یا تو گزر جاتی یا پھر ارد گرد کی چیزوں کی جانب متوجہ ہو جاتی۔ ابتدا میں سلجوق عمر کے چہرے پر شناسائی کے تاثرات دیکھنے کے بعد اسے اپنے اندر تسکین کا احساس ہوا تھا کیوں؟ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی، مگر اس کے بعد اس نے اس سلجوق عمر کو دیکھا تھا جس کی شخصیت کی اجنبیت، بے گانگی اور لاپروائی مشہور تھی۔ مائرہ کے ساتھ لگائی گئی شرط میں فقط تین دن بچے تھے اور ابھی تک تمام معاملہ مبہم اور نہ سمجھ میں آنے والا تھا۔ نادیہ کی ہنسی اور سارہ کا اطمینان بھی غائب ہو چکا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا ہم لوگ کامیاب ہوں گے۔" نادیہ متاسف انداز میں کہہ رہی تھی جبکہ ان دونوں کی خاموشی بھی اس فقرے کو تقویت دے رہی تھی۔ گزشتہ پندرہ روز سے اس نے وہ سب کیا تھا جو بقول نادیہ کے کامیابی کی کنجی تھا مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ بجائے یہ کہ سلجوق عمر اس کی جانب پیش قدمی کرتا۔ اس کی مشہور زمانہ سنجیدگی اور اجنبیت نے ان کے تمام ارادوں کو ملیامیٹ کر دیا تھا۔ ان کے سامنے وہی سلجوق عمر تھا جس نے مائرہ کو ناممکن جیسا لفظ ادا کرنے پر مجبور کر دیا تھا اور اب اسے بھی مائرہ کی تائید کرنی تھی۔ اسے یہ بتانا تھا سلجوق عمر سے فلرٹ کرنا تو کیا اپنی جانب متوجہ کرنا بھی ناممکن تھا۔ نادیہ اور سارہ کی ضد کے نتیجے میں وہ اسے متوجہ کرنے کی آخری کوشش کر

رہی تھی۔

سلجوق عمر کو جم میں ڈھونڈنے کا اسے زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا تھا۔ ٹینس کورٹ میں وہ پریکٹس کرنے کی بجائے کوئی سنگل میچ کھیل رہا تھا۔ شاید وہ خاصا دلچسپ میچ تھا کہ یہاں پر اچھی خاصی تعداد میں تماشائی بھی موجود تھے۔ سارہ کو گیٹ پر اپنی کوئی پرانی دوست مل گئی تھی جبکہ نادیہ مایوسی کی اس انتہا پر تھی کہ اس نے ان دونوں کے ساتھ آنے میں ذرہ برابر دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

وہ ایسی جگہ بیٹھی تھی جہاں سے سلجوق عمر آرام سے اسے دیکھ سکتا تھا' دیکھ تو وہ بھی اسے سکتی تھی مگر دیکھ نہیں رہی تھی۔ اس کی توجہ کا مرکز تو وہ شخص تھا جو سلجوق عمر سے کورٹ میں مقابلہ کر رہا تھا۔ گو کہ سلجوق عمر کے سامنے وہ اتنا اچھا نہیں کھیل رہا تھا' مگر وہ پھر بھی اس کی حوصلہ افزائی کی خاطر پرجوش انداز میں وسلنگ کر رہی تھی۔ تالیاں بجانے کا وہ رسک نہیں لے سکتی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ اب بھی انڈر آبزرویشن تھا۔ اسی اثنا میں اس نے محسوس کیا تھا جیسے سلجوق عمر نے اسے دیکھا ہو' مگر اس بار بھی اس نے اس کی جانب دیکھنے سے احتراز کیا تھا۔

پہلا سیٹ سلجوق عمر کے نام رہا' مگر دوسرے سیٹ میں شاید بختاور کی حوصلہ افزائی کی بدولت مخالف کھلاڑی کے کھیل میں بہتری آئی تھی' یہ سیٹ ٹائی بریک میں چلا گیا تھا۔ سروس ہو رہی تھی' سروس بریک بھی ہو رہی تھی۔ پوائنٹس بھی سلجوق عمر کے کھاتے میں جا رہے تھے اور کبھی اس کے' تب بختاور کو محسوس ہوا تھا کہ سلجوق عمر کے کھیل میں پہلے جیسا جوش و خروش عنقا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا کھیل متاثر کن نہیں رہا تھا۔ ایسے جیسے گیم میں اس کی دلچسپی ختم ہو گئی ہو۔ وہ بہت آسانی سے یہ سیٹ ہار گیا تھا۔ تماشائیوں کی حیرت بھری آوازوں کی پروا کیے بغیر وہ مزید کھیلنے سے معذرت کرتا ہوا نیٹ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ کر تاول سے اپنا چہرہ پونچھنے لگا۔ اب بختاور کا یہاں رکے رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔

اپنے سر پر ٹکے سن گلاسز کو آنکھوں پر چڑھاتے ہوئے وہ تاسف بھرے انداز میں چلتی ہوئی پارکنگ میں چلی آئی۔ یہ آخری موقع بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ سارہ کی گاڑی تو یہاں موجود تھی مگر سارہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے یہاں کھڑے رہ کر سارہ کا انتظار کرنا تھا۔

معاً" اسے احساس ہوا جیسے کوئی آہستگی سے اس کے قریب آکھڑا ہوا ہو' یہ سارہ ہی ہو سکتی تھی۔ تب اس نے اپنی متاسف آواز کے ساتھ سارہ کو مخاطب کیا تھا۔

"سارہ! بس اب مجھے یہ سب نہیں کرنا' بھاڑ میں گئی مائرہ اور اس کی شرط اور اب تم کان کھول کر سن لو اور بتا دینا نادیہ کو بھی کہ میں اگلے تین دنوں میں کچھ کرنے والی نہیں ہوں۔ یہ سب میرے لیے ناممکن ہے۔"

"کیا ناممکن ہے؟" سارہ کی آواز کی بجائے اس نے ایک مردانہ' مگر مانوس آواز کو سنا تھا۔ اس کا چہرہ ایک دم فق ہو گیا۔ بہت ڈرتے ڈرتے اس نے آواز کی سمت دیکھا اور پھر اسے اپنے حواس بے جان ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

وہ دم سادھے اپنے نزدیک سلجوق عمر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ استفسار طلب نظروں سے اب بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

"ہائے! مجھے سلجوق عمر کہتے ہیں۔" اس کی جانب سے کسی قسم کا رد عمل نہ پا کر اس نے اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا۔ جواباً" یکلخت ہی اس کی محویت ٹوٹ گئی اور پھر وہ دل ہی دل میں اپنی اس حرکت پر خود کو سرزنش کرنے لگی۔

"ہائے داوے! اب تو آپ خوش ہوں گی۔" معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے وہ اس سے نجانے کون سی خوشی کی باتیں کر رہا تھا۔ وہ ناسمجھ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"آئی مین! آپ اسد کو اتنا اپری شیٹ کر رہی تھیں' اس کے جیت جانے کے بعد تو آپ بہت خوش ہوں

گی۔" غالباً" جس کے لیے وہ اتنے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھی' اس کا نام اسد تھا۔ وہ شخص شانے اچکا کر رہ گئی' بولی کچھ نہیں۔ وہ جن نظروں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا اس نے اسے نروس کر دیا تھا' تاہم اپنے اول روز والی پالیسی پر عمل در آمد کیا جا رہا تھا۔ وہ بدستور اس سے نظریں چرائے متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ وہ اس شخص کو اگنور کر ہی نہیں پا رہی تھی بلکہ اس شخص سے وابستہ ہر بات اس کی سوچوں کا ناگزیر حصہ بن چکی تھی۔

بختاور کے اس انداز کو وہ بھی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ "آپ کسی کا انتظار کر رہی ہیں۔" اس نے محض اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"کس کا؟" سوالیہ لہجہ اختیار کرنے کے بعد غالباً" اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اسے جواب نہیں دے گی تب ہی متاسف انداز میں گویا ہوا تھا۔

"آپ یقیناً" مجھے نہیں بتائیں گی' خیر میں تو صرف آپ سے معذرت کرنے آیا تھا۔" بختاور نے اسے ایسے دیکھا جیسے اس معذرت کی وضاحت چاہ رہی ہو اور وہ تو جیسے تیار ہی تھا۔

"ایکچولی! اس روز شاید میں بہت روڈ ہو گیا تھا اپنی دانست میں' میں اس ایکسیڈنٹ کو آپ کی غلطی تصور کر رہا تھا' حالانکہ غلطی میری ہی تھی' شاید میں بہت عجلت میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ اب آپ کا ہاتھ کیسا ہے؟" بختاور آنکھیں پھاڑے اس کایا پلٹ کو ملاحظہ فرما رہی تھی۔ اتنا شستہ اور ملائمت آمیز لہجہ اسے ہضم نہیں ہو پا رہا تھا۔

"تو کیا یہ سب اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ میں نے اسے اگنور کیا۔" اس نے حیرانگی سے سوچا تب اسے نادیہ کا کہا گیا یہ جملہ شدت سے یاد آیا تھا۔

"بعض لوگ سراب نما اس خواہش کی مانند ہوتے ہیں' جن کے پیچھے جتنا دوڑا جائے وہ اتنا ہی آپ

سے دور بھاگتے ہیں اور جن سے دور بھاگا جائے وہ سائے کی طرح آپ کا پیچھا کرتے ہیں۔ بس دعا کرو سلجوق عمر کا شمار بھی ان لوگوں میں ہوتا ہو۔" اس نے کوئی دعا نہیں کی تھی بس اس شخص سے دور بھاگنے کی کوشش کی تھی اور آج اسے لگ رہا تھا کہ نادیہ نے بالکل درست نفسیاتی حربے کا استعمال کیا تھا۔ جب کہ دوسری طرف وہ اس کی سوچوں سے قطع نظر ایک بار پھر اس سے مخاطب ہوا تھا۔

"اسد بہت اچھا کھلاڑی نہیں ہے' مگر آپ کی حوصلہ افزائی کے بعد وہ اچھا کھیلنے لگا اور میں بہت برا' حالانکہ میں بہت برا کھلاڑی نہیں ہوں۔ میں تو اس لیے ہارا تھا کیونکہ میری ہار کسی کی بے انتہا خوشی کا باعث بن رہی تھی۔" وہ اس سے اتنی بے تکلفی سے بات کر رہا تھا' جیسے اپنی پہلی ملاقات فراموش کر گیا ہو۔

"آپ پوچھیں گی نہیں کہ میں کس کے لیے ہارا؟" بختاور کے لیے اس کا یہ انداز ناقابل برداشت ہونے لگا تھا۔

"یہ آپ کا پرسنل میٹر ہے۔" روکھا لب و لہجہ اختیار کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اس بار اس نے کوئی اداکاری نہیں کی تھی۔ حقیقتاً" وہ سارہ کی شدت سے منتظر تھی۔ اس شخص کی پراسرار مسکراہٹ کسی بھی طور قابل اطمینان نہ تھی۔

"لیکن یہ میرا پرسنل میٹر نہیں ہے۔ اب آپ بھی اس میٹر میں شریک ہو چکی ہیں۔" اس نے بہت چونک کر اس کی سمت دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

میں نے بہت چونک کر اس کی سمت دیکھا' مگر وہ مجھے نظر انداز کیے سلائس پر جیم لگا رہا تھا۔ بابا ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔

"ارتضٰی تمہیں I.B.A کا فارم لا دے گا۔ تم مجھ سے سائن کروا لینا۔" میں ہکابکا انہیں دیکھ رہی تھی مگر وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے' شاید وہ مجھے دیکھنا ہی نہیں چاہتے تھے۔

پھر میں نے مما کو دیکھا تھا ان کا چہرہ ان دونوں افراد کی طرح بے تاثر تھا۔ اب مجھے رہ رہ کر اپنے رات والے رویے پر طیش آ رہا تھا۔ رات جس طرح میں ارتضٰی پر پھٹ پڑی تھی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ بابا نے مجھے ایم بی اے میں ایڈمیشن لینے کی اجازت دے دی تھی۔

موموکی برتھ ڈے والے روز معیز سے تلخ کلامی کے بعد جب موموکے ساتھ میں نے اپنے کمرے کی راہ لی تھی تو اس وقت میرا ذہن بابا کے بارے میں سوچ سوچ کر پراگندہ ہو رہا تھا۔ جس طرح بابا کے سامنے میں اپنی خواہشوں کو دبانا جان گئی تھی اور رفتہ رفتہ اس فن میں ماہر ہوتی چلی گئی تھی اسی طرح بابا کا ہر ہر انداز میرے اندر ایک نئی تشنگی کو جنم دینے کا باعث بن رہا تھا۔ آج جس طرح وہ اپنے قہقہوں سے محفل کی جان بنے ہوئے تھے پہلی نظر میں دیکھنے والا شخص کبھی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اور ہنسی دو متضاد چیزوں کے نام تھے۔ وہ احساسات و جذبات سے عاری ایک سپاٹ زندگی گزار رہے تھے۔ اسی روکھی اور سپاٹ زندگی کو تحریک دینے کی خاطر میں نے اپنی ہر خواہش کا گلا گھونٹا تھا۔ محض اس لیے کہ جواب میں وہ بھی اس رشتے سے وابستہ تقاضوں کو اسی طرح نبھائیں' جس طرح دوسرے لوگ نبھاتے ہیں' غصے کے ساتھ ساتھ محبت بھی' خشک رویے کے ساتھ ساتھ شفقت بھی مگر حاصل وصول کیا ہوا تھا۔ ان کا غصہ اور اس سے وابستہ ایک انجانا سا خوف ان کا تنفر آمیز لہجہ ان کے ماتھے کی شکنیں۔ اگر وہ یہ رویہ سب کے ساتھ رکھتے' تب بھی ان کا رویہ قابل گرفت ہرگز نہ تھا' تکلیف دہ بات یہ تھی کہ صرف میرے ساتھ ہی ان کا رویہ اس حد تک روکھا اور بیگانہ ہوا کرتا تھا۔ کب میرا یہ احساس کمتری میری آنکھوں سے بہنے لگا تھا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔

"عینی! تم رو رہی ہو۔" مومو پر تشویش انداز میں دریافت کر رہی تھی۔ میں ایک دم نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہوئی بولی۔

"نہیں! میں رو تو نہیں رہی شاید میری آنکھ میں کچھ گر گیا ہے تب ہی آنسو آ رہے ہیں۔" مصنوعی خوشگوار لہجہ اختیار کرتے ہوئے میں نے مومو سے زیادہ خود کو تسلی دینے کی کوشش کی تھی' ستم ظریفی کی بات یہ تھی کہ مومو کو مطمئن کرنا تو آسان تھا مگر خود کو

واش روم میں جا کر اپنی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد میں واپس کمرے میں آئی تو مومو کے ساتھ ارتضٰی کو بیٹھے پایا۔

"معیز چلا گیا؟" سرسری انداز میں دریافت کرتے ہوئے میں دانستہ اپنی نظریں جھکائے ہوئے تھی۔ جواب میں مجھے صرف اس کی خاموشی سنائی دی تھی۔ میں وارڈ روب کا پٹ کھولے بے مقصد کپڑوں کو ادھر سے ادھر کر رہی تھی جب مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

"تم ابھی روئی تھیں؟" میرے ہاتھ ایک دم ساکت ہو گئے۔

"نہیں تو! عینی رو نہیں رہی اس کی آنکھ میں کچھ گر گیا ہے۔" مومو نے کسی قدر میری مشکل آسان کر دی تھی۔

"عینی! کیا میں تم سے اتنا دور ہوں کہ مجھ سے کچھ بھی شیئر کرنے سے پہلے تمہیں ہزار بار سوچنا پڑے گا۔" مومو کی بتائی گئی توجیہہ پر وہ مطمئن نہیں ہوا تھا۔ اس کا سنجیدہ لب و لہجہ مجھے چونکا گیا تھا۔

"عینی! میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں at least جواب تو دو۔" ارتضٰی نے قدرے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا تھا۔

"ارتضٰی! پلیز مجھے ڈسٹرب مت کرو۔" میں نے کسی قدر چلاتے ہوئے کہا۔ جواب میں اس کا انداز بھی اسی قدر جارحانہ تھا۔

"میں ڈسٹرب کر رہا ہوں تمہیں؟ تم مجھے ڈسٹرب کر رہی ہو عینی اور پتا ہے کیوں؟ بابا نے تمہیں ایم بی اے کرنے سے منع کیا اور تم اس بات کو مجھ سے اور معیز سے ایسے چھپا رہی تھیں' جیسے تم مجھ سے کچھ چھپانے میں کامیاب ہو جاتی ہو۔" وہ اچھے سے کہہ رہا تھا۔

"بابا سے کسی بھی قسم کا جواز لیے بغیر تم ان کا یہ حکم کیسے مان سکتی ہو۔" جواب میں میرے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ ٹھہر گئی تھی۔ مگر جب میں بولی تو مجھے اپنی آواز کسی کنوئیں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"تمہارا کیا خیال ہے بابا کے پاس اس انکار کا کوئی جواز نہیں ہوگا' یقیناً" ہوگا مگر ارتضٰی جب مجھے ان کا حکم ماننا ہے تو پھر میں ان سے جواز کیوں مانگوں۔ میں ان کے سامنے نہ تو اپنے کسی اعتراض کو اٹھا سکتی ہوں اور نہ ہی اپنی کسی رائے کا اظہار کر سکتی ہوں۔ اپنا کوئی بھی نکتہ نظر تب ہی کسی کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جب اسے کوئی سننے والا ہوتا ہے مگر بابا کا تحکم آمیز رویہ اور ان کے لہجے کی قطعیت ان سب چیزوں سے بالاتر ہے' کم از کم میرے معاملے میں تو وہ ایسے ہی ہیں۔"

"یہ بالکل غلط ہے عینی! بابا کے ساتھ اتنا عرصہ گزارنے کے باوجود تم انہیں جان نہیں پائیں اور میں تم سے چھوٹا ہونے کے باوجود انہیں تم سے بہتر جج کر سکتا ہوں۔ تمہیں اپنے سوچنے کے انداز میں تبدیلی لانا ہو گی۔ اس طرح تو تم نفسیاتی مریض بن جاؤ گی۔ تمہیں کیا لگتا ہے بابا میری ہر بات مانتے ہیں۔ نہیں! ایسا نہیں ہے' بلکہ میں ان سے اپنی ہر خواہش منوانا جانتا ہوں۔" وہ مزید کچھ کہنا چاہتا تھا جب میں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"ارتضٰی! کرنے کو تو میں بھی اپنی ہر خواہش کو پورا کر سکتی ہوں' کہہ سکتی ہوں کہ مجھے ان کے رویے سے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن فرق پڑتا ہے ارتضٰی! مجھے پڑتا ہے۔ مجھے ان کے رویے سے تکلیف ہوتی ہے۔ میں ان کے ماتھے پر پڑی شکنوں سے بے نیازی نہیں برت سکتی' جیسے کہ تم کرتے ہو۔ میں تمہارے جیسی نہیں بن سکتی۔ ان کے سامنے غلط کو غلط اور صحیح کو صحیح کہتے ہوئے درجنوں بار میری زبان لڑکھڑائی ہے۔ کاش

کہ تمہاری طرح مجھے بھی اپنی زندگی پر تھوڑا بہت اختیار ہوتا۔ بچپن سے لے کر آج تک میں نے ان کی محبت کے حصول کی خاطر بہت کچھ کیا ہے۔ انہیں میری ہر عادت پر اعتراض تھا۔ میں نے اپنی عادتیں بدل ڈالیں۔ انہیں میرا جینز پہننا پسند نہیں تھا' میں نے جینز پہننا چھوڑ دی۔ انہیں میری بوائز کلاس فیلوز سے دوستی پر اعتراض تھا۔ میں نے ان کا یہ اعتراض بھی دور کر دیا۔ انہیں میرا اکیلا باہر جانا پسند نہ تھا' میں نے اپنی یہ عادت بھی ترک کر دی۔ آج اکیس برس کی ہونے کے باوجود میں باہر جانے سے گھبراتی ہوں۔ معیز صحیح کہتا ہے کہ میں ڈرپوک اور خوف کی ماری ہوئی لڑکی ہوں ہاں میں ایسی ہی ہوں' لیکن میں ایسی جان بوجھ کر تو نہیں بنی۔ پاپا کی خوشی اور اطمینان کی خاطر میں آج اس مقام پر آگئی ہوں کہ لوگوں کو فیس کرنے کے نام سے گھبراتی ہوں اور تم کہتے ہو کہ میں غلط کر رہی ہوں اور میں کیا کروں ارتضیٰ کہ پاپا میری ہر بات ماننے لگیں۔ اب میں مما جیسی تو نہیں بن سکتی بے حس اور اپنی دنیا میں مگن رہنے والی۔" ارتضیٰ مجھے گہری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ میرے اندر اس قدر زہر بھرا ہوا ہے۔ درحقیقت یہ تو اس زہر کے ذخیرے کے ذرات تھے' جن سے وہ واقف ہوا تھا۔ لیکن وہ ہی نہیں کوئی اور بھی تھا جو یہ سب جان گیا تھا۔ دروازے کے بیچ و بیچ ایستادہ معیز کا وجود مجھے ششدر کر گیا۔ وہ لب بھینچے سپاٹ نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔

میری زندگی کا وہ پہلو' جو آج سے پہلے سب کی نظروں سے پوشیدہ رہا' آج اس احساس کمتری میں' میں نے انجانے میں ان دونوں کو شریک کر لیا تھا۔ ویسے بھی معیز کیا نہیں جانتا تھا میرے بارے میں' ایک حقیقت اور سہی۔ اس انجانی سی بے چینی پر قابو پانا میری برداشت سے باہر کیوں ہوتا جا رہا تھا۔ معیز کی نظروں کے سامنے کھڑا رہنا' اب میرے لیے دشوار ترین ہو گیا تھا۔ شاید اسے بھی میری درماندہ کیفیت کا اندازہ ہو گیا تھا' تب ہی سنجیدگی کے ساتھ وہ میرے کمرے سے نکل گیا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد میں کتنی ہی دیر تک خود سے شاکی رہی۔ مجھے خود پر شدید غصہ آ رہا تھا اور اب مجھے اس بات کی فکر تھی کہ ارتضیٰ اور معیز میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہوں گے۔ مجھے معیز کی بھی اتنی پروا نہیں تھی' جتنی کہ ارتضیٰ کی۔ وہ سوچ رہا ہوگا کہ میں پاپا کے بارے میں کتنی منفی سوچ رکھتی ہوں۔ اپنے آپ پر آنے والے غصے کا بہاؤ ارتضیٰ کی اور بڑھ گیا تھا۔ اگر وہ میرے کمرے میں نہ آتا تو مجھے کتھارسس کا موقع بھی نہ ملتا اور میرا کتھارسس معیز کے کانوں میں بھی نہ جاتا۔ زود رنجی کی کیفیت نے مجھے ان دونوں کے سامنے عیاں کر دیا تھا اور یہی چیز مجھے زک پہنچا رہی تھی۔

صبح ڈائننگ روم میں جانے سے پہلے مجھے پہلی بار بے زاری' اندیشوں اور وسوسوں کا سامنا کرنا پڑا تھا' شاید ارتضیٰ نے رات والی میری ساری گفتگو پاپا کے سامنے گوش گزار نہ کر دی ہو۔ میری ہر سوچ اور ہر خیال کی تان محض اسی قیاس پر اٹک گئی تھی۔ مگر پاپا کا خلاف معمول انداز اور لہجہ مجھے حیران کر گیا تھا۔

انہوں نے مجھے ایم بی اے میں ایڈمیشن لینے کی اجازت دے دی۔ میرے اندر کچھ ٹوٹ سا گیا تھا۔ میں نے ایک مضمحل مسکراہٹ کے ساتھ پاپا کو ڈائننگ روم سے نکلتے دیکھا تھا اور پھر میں نے ارتضیٰ کو دیکھا تھا۔ ارتضیٰ نے وہی کیا' جس کا مجھے اندیشہ تھا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟" اس کا لہجہ مدھم مگر سنجیدہ تھا۔ میں نے ایک دم اپنی نظریں ارتضیٰ کے چہرے سے ہٹا لیں۔ "شاید تم سمجھ رہی ہو کہ میں نے تمہارا کل والا کتھارسس پاپا کے گوش گزار تو نہیں کیا۔ بے فکر رہو میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔"

"تو پھر تم نے ایسا کیا کیا ہے کہ۔" الفاظ جیسے میرا ساتھ دینے سے قاصر تھے میں صدمے کی سی کیفیت میں تھی۔

"کل معیز نے اس سلسلے میں پاپا سے بات' میرا مطلب ہے بحث کی تھی تب ہی پاپا نے اتنی آسانی سے اجازت دے دی۔ میں ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ میں ابھی بھی سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنا مقدمہ خود لڑنا چاہیے تھا۔ میں آج ایک بات اور کہنا چاہتا ہوں کہ پاپا کے متعلق تمہارا اندازہ قطعی طور پر غلط ہے۔ زندگی کے متعلق ہر ایک کا زاویہ نگاہ مختلف ہوتا ہے جیسا کہ تمہارا' پاپا کا اور میرا اور میں سمجھتا ہوں کہ پاپا اپنی ذات کو اپنی ذات تک محدود رکھ کر شاید تمام عمر اس بات کی توقع کرتے رہے کہ کوئی انہیں ان کی ذات کے دائرے سے باہر نکالے اور اپنا آپ ان سے منوائے۔ مگر مما نے اس بارے میں کوئی کوشش نہیں کی' انہوں نے جیسا ہے ویسا کی بنیاد پر پاپا کو قبول کیا اور تم بھی مما سے کچھ مختلف ثابت نہیں ہوئیں۔ مما پاپا سے تمام عمر اس لیے شاکی رہیں کہ انہوں نے تمہاری ہر خواہش کو رد کیا تھا۔ تو پھر مجھے بھی ان سے شاکی ہونا چاہیے۔ جو کچھ انہوں نے تمہارے ساتھ کیا وہی کچھ میرے ساتھ بھی کیا' مگر شاید ہم دونوں میں یہی بنیادی فرق ہے کہ میں نے ان کی کسی بات کے سامنے سر نہیں جھکایا' ان کے ہر اعتراض کے جواب میں' میں نے کیوں کی دلیل سامنے رکھی تھی اور اس کیوں کے جواب میں ان کے پاس ایک بودا سا قطعی فقرہ ہوتا تھا کہ "بس میں نے جو کہہ دیا ہے۔" اس کے بعد بھی میں' کبھی خاموش نہیں ہوا۔ میرے پاس ان کے غیر منطقی انکار کے جواب میں کئی قسم کا منطقی مباحثی مواد ہوتا تھا جس کے بعد ان کی مزاحمت ایسے دم توڑ دیا کرتی تھی جیسے کل رات معیز نے کیا تھا اور انہیں معیز کی بات ماننے ہی بنی تھی' کیونکہ وہ خود جانتے تھے کہ ان کے انکار میں کوئی وزن نہیں ہے۔"

میرے لیے ارتضیٰ کی یہ باتیں ناقابل برداشت ہونے لگی تھیں۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ارتضیٰ جو خواب ناک لہجہ اختیار کیے ہوئے تھا اور جو پاپا کی شخصیت کے خفیہ پہلو مجھ سے ڈسکس کر رہا تھا وہ محض اس کی ذہنی اختراع کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اپنی دانست میں وہ جس قسم کی خوش فہمی میں مبتلا تھا میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس خوش فہمی سے نکلے' اسے خود فریبی کا یہ لبادہ اوڑھے ہی رکھنا چاہیے تھا' ورنہ میری طرح اس کی زندگی بھی غیر یقینی انداز میں گزرتی۔

اس روز کے بعد ارتضیٰ اکثر مجھ سے پاپا کی شخصیت کے متعلق بحث کرنے لگا۔ ہلکے پھلکے موضوعات جو کبھی ہم دونوں کے مابین زیر بحث آیا کرتے تھے اب ان کی جگہ پاپا نے لے لی تھی۔ وہ ان کی شخصیت کے حوالے سے اپنے نظریات کا جس جوش و خروش سے اظہار کیا کرتا اس نے مجھے ایک عجیب سے دوراہے پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس روز میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی کہ اپنا آپ ارتضیٰ کے سامنے کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ مجھے ارتضیٰ کا یہ سب کہنا برا لگتا تھا' حقیقت یہ تھی کہ ارتضیٰ جب جب پاپا کے کردار کو خود ساختہ انداز میں مظلوم ظاہر کرتا تھا تب تب مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس بلند ہوتا محسوس ہوتا تھا۔ ارتضیٰ کے محسوسات کی دنیا اتنی وسیع نہ تھی جتنی کہ میری اور میرے محسوسات نے مجھے کبھی بھی پاپا کے متعلق کسی قسم کی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کیا تھا۔

باوجود کوشش کے میں پاپا کی الجھی ذات کا کوئی بھی سرا تلاش کرنے میں ناکام رہی تھی اور پھر میں نے اپنی یہ کوشش بھی ترک کر دی' MBA کے Aptitude ٹیسٹ کے دوران میرا اس جانب دھیان ہی نہیں گیا۔ میری تمام تر توجہ اور تفکرات اس ٹیسٹ کی جانب مبذول ہو گئے تھے جس کی تیاری میں معیز میری مدد کر رہا تھا گو کہ مجھے اپنے اس ٹیسٹ میں ناکامی کا دو سو فیصد یقین تھا مگر معیز میری پریشانی اور حواس باختگی کے برعکس خاصا پرامید تھا۔

جب میں ٹیسٹ دے کر آئی تو معیز کو لاؤنج میں بیٹھے پایا۔

"ڈونٹ وری! دیکھ لینا تم پاس ہو جاؤ گی۔" میری شکل دیکھتے ہی معیز نے مجھے تسلی دینے والے انداز میں کہا تھا۔ حالانکہ جس قسم کے تاثرات میرے چہرے پر تھے اسے دیکھ کر کوئی بھی کم از کم مجھے اس قسم کی تسلی نہیں دے سکتا تھا' مگر وہ معیز تھا جس نے

بچپن سے لے کر آج تک قدم قدم پر میری حوصلہ افزائی کی تھی' حوصلہ افزا باتوں سے مطمئن کیا تھا' اب بھی وہ ایسا ہی کر رہا تھا۔

جس روز میں نے اپنا رزلٹ دیکھا' مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ ٹیسٹ کلیئر کرنے والوں میں میرا نام بھی شامل تھا' میں نے سب سے پہلے یہ خبر معیز کو دی تھی۔ فون معیز ہی نے ریسیو کیا تھا۔

"یہ خبر تمہارے لیے نئی ہو گی' میرے لیے نہیں۔" دوسری طرف شاید وہ مسکرایا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا تھا معیز! مجھے تو ایک فیصد کی بھی امید نہ تھی۔"

"میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ میں تمہیں تم سے بہتر جانتا ہوں۔ تمہاری صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی میں نے تمہیں MBA کے لیے انسسٹ کیا تھا۔"

وہ مجھے اتنی اچھی طرح جانتا تھا اور میں اپنے آپ میں مگن رہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو کبھی نہیں جان سکی' درحقیقت میں نے اپنے اردگرد اتنی مایوسیاں دیکھی تھیں کہ اپنے ہر عمل کے بعد میں نے محض مایوسی ہی کی توقع رکھی تھی' مگر اس بار ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس بار مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے کوئی تیر مار لیا ہو اور یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جو قابل تعریف تھا مگر ار تضی کے بعد میری اس خوشی کو کسی نے بھی محسوس نہیں کیا تھا' مگر اس بار میں کسی قسم کی زود رنجی میں مبتلا نہیں ہوئی تھی۔ یہ کامیابی میرے لیے اتنی بڑی تھی کہ اس گھر کا سرد ماحول اس کے سامنے ہیچ تھا۔

یونیورسٹی میں پہلا دن مجھے بڑا عجیب سا لگا تھا۔ عجیب اس لیے کہ میں اولیول کے بعد پہلی بار کسی مخلوط تعلیمی انسٹی ٹیوٹ میں ایڈمٹ ہوئی تھی۔ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کا انبساط اور تفخر لمحوں میں ہی میرے چہرے سے غائب ہو گیا تھا۔ اب ایک نئی پریشانی نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا کہ دو سال یہاں کیسے گزریں گے۔ فارینہ پر نظر پڑتے ہی مجھے قدرے اطمینان ہوا تھا۔ پہلی بار مجھے فارینہ کا وجود غنیمت لگا تھا' گو کہ میرے نزدیک دوستی کرنا دشوار ہی نہیں دشوار ترین تھا' پہلی بار میں نے یہ دشوار ترین کام کیا تھا اور وہ بھی اپنے مفاد کی خاطر۔ ایک مہینہ گزر جانے کے باوجود میں نہ تو اس ماحول میں سیٹ ہوئی تھی اور نہ ہی فارینہ کے علاوہ میری کوئی دوست بن سکی تھی مگر ایک بات جو ابھر کر سامنے آئی تھی وہ فارینہ کے ساتھ بے تکلفانہ دوستی کا آغاز تھا' اسی دوستی نے مجھے آئی بی اے میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش میں مدد دی تھی۔

شروع شروع میں جو مجھے یونیورسٹی جانے کے نام سے کوفت اور بے زاری کے دورے پڑنے لگتے تھے اب میں نے اپنی اس عادت کو ترک کرنے کی کوشش شروع کر دی اور یہ میری اسی کوشش کی کامیابی تھی کہ میں بادل نخواستہ ہی سہی بہرحال ریگولر یونیورسٹی جا رہی تھی۔ میری ساکت زندگی میں ایک لہر سی پیدا ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی ساکت زندگی میں ایک لہر سی پیدا ہو گئی تھی۔ کب وہ اس لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوا تھا اور کب اس نے اپنی ذات کے تمام ہتھیار اس کے سامنے ڈال دیے اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔

آج وہ اسے تین دن بعد دیکھ رہا تھا' تھوڑی دیر پہلے جو دلچسپی گیم میں تھی وہ اچانک ختم ہو گئی۔ حسب معمول وہ اسے نظرانداز کیے اسد کی حوصلہ افزائی کی خاطر بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ گزشتہ دو ہفتوں سے وہ اس کے سامنے آکر جس قسم کا رویہ اپنائے ہوئے تھی وہ اس کے لیے تکلیف دہ تھا اور اس تمام معاملے میں وہ اسے نہیں بلکہ خود کو قصوروار گردان رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پر چڑھا پلاسٹر اسے بار بار اپنی غلطی کا احساس دلاتا تھا۔

سلجوق عمر کی نظریں صرف اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں' جسے وہ تین دن بعد دیکھ رہا تھا۔ اس نے ایک نگاہ غلط بھی اٹھا کر سلجوق کی جانب نہیں دیکھا تھا اور اگر دیکھ لیتی تو شاید اس کی بے تابی' محبت' سے بے خبر نہ رہتی۔ اسد بھی اس کی خراب کارکردگی پر اسے ٹوکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں' تمہارا دھیان کہاں ہے؟"

جواب میں وہ محض شانے اچکا کر رہ گیا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا کہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے' یا پھر کہیں ایسا تو نہیں کہ تم مجھ سے جیلس ہو گئے ہو؟"

یہ فقرہ کہہ کر اسد نے جس انداز میں سامنے دیکھا تھا۔ سلجوق عمر کو اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ وہ انہیں بے باک نظروں سے بختاور کو دیکھ رہا تھا جن نظروں سے وہ لڑکیوں کو دیکھنے کا عادی تھا۔

"جیلس وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں ہوتا اور میرے پاس بہرحال تم سے زیادہ مصروفیت ہے۔" اپنے تند و تیز لہجے پر قابو پانا اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔

"تم شاید برا مان گئے ہو۔" وہ آہستہ روی سے چلتے ہوئے پارکنگ کی طرف جانے لگے۔ اسد کو اس کے لہجے کی ناگواری کا احساس ہو گیا تھا' مگر یہ ناگواری کس سلسلے کی کڑی تھی وہ کوشش کے باوجود سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسد نے جن نظروں سے بختاور کو دیکھا تھا وہ مسلسل اس کے طیش میں اضافہ کر رہی تھیں۔ وہ اب اسد کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ حالانکہ اسد کے ساتھ دوستی برسوں کی مخلصی کی ڈور سے بندھی ہوئی تھی۔ اسد کافی دیر تک اس کے اس طرح اشتعال میں آنے کی وجہ جاننے کی کوشش کرتا' مگر جواب میں سلجوق عمر کا ناگوار انداز اس کے لیے مبہم ثابت ہوا تھا۔ وہ خاموش نظریں اور کچھ ابہام لیے اس کے سامنے سے ہٹ گیا۔

اسد کے جاتے ہی وہ سوچنے لگا تھا کہ اس نے اسد جیسے شخص سے دوستی بھی کیسے کی۔ حالانکہ اس سے پہلے اسے اسد کی اس عادت پر کبھی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنی گرل فرینڈز اور لڑکیوں کو جس طرح ڈسکس کیا کرتا تھا اس نے کبھی اعتراض کا لفظ نہیں اٹھایا تھا اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے ٹوکنے کی کوشش کی تھی۔ اسد کپڑوں کی طرح گرل فرینڈز تبدیل کرنے کا عادی تھا اسی وجہ سے اسے لڑکیوں کے طبقے سے خاصی چڑ ہو چکی تھی۔ اس کی اسی لاپروائی اور بے نیازی میں لڑکیوں کے لیے کشش تھی جب ہی اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک اس نے درجنوں لڑکیوں کو اپنی جانب قدم بڑھاتے دیکھا تھا اور پھر انہی قدموں کو اس نے اپنے ہتک آمیز اور تحقیرانہ رویے کے سبب پیچھے ہوتے بھی دیکھا تھا۔

لیکن اس معاملے میں اس نے اسد کو کبھی نہیں ٹوکا تھا' حالانکہ جو کچھ اسد کرتا رہا تھا وہ اسے ناپسندیدگی سے دیکھتا تھا۔ سلجوق عمر کے نزدیک یہ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں تھیں' اس کے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہ تھی۔ اس فرق کی کوئی اہمیت نہ تھی جو ان دونوں کے مابین تھا' مگر آج یہ فرق اسے اپنی زندگی کی فاش غلطیوں کا ادراک دے گیا تھا۔ آج اسے اسد پر غصہ آیا تھا اور وہ اس سے اپنی ناگواری پہلے کی طرح پوشیدہ بھی نہیں رکھ پایا تھا۔ وہ اسد کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ بات کرنا تو بہت دور کی بات تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ لڑکیوں کو بری نظر سے دیکھتا تھا' بلکہ اس لیے کہ اس نے بختاور کو بری نظر سے دیکھا تھا۔ جس کی محبت کو وہ گزشتہ ایک ہفتے سے اپنے دل میں کسی خزانے کی مانند چھپائے ہوئے تھا۔

کب ناگواری لیے ہوئی شناسائی محبت میں تبدیل ہوئی' وہ نہیں جانتا تھا۔ مگر وہ تین دن اسے اپنی زندگی کے مشکل ترین اور تکلیف دہ دن لگے تھے' جب اس نے بختاور کو نہیں دیکھا تھا۔ احساسات کے سمندر میں وہ پہلا پتھر پڑا تھا جب بے چینی اور بے قراری نے اس کے تمام احساسات کو اپنے احاطے میں لے لیا تھا اور پھر وہ ہر اس جگہ جانے لگا جہاں اسے بختاور کی موجودگی کا ہلکا سا بھی امکان نظر آتا' مگر ہر بار گمان گمان ہی رہا' یقین ایقان کی سند نہ پا سکا۔

بختاور سے پہلی ملاقات آج بھی اسے جوں کی توں

یاد تھی۔ وہ اس دن کو کیسے بھلا سکتا تھا جب اسے خود پر شدید غصہ آیا تھا، اپنے آپ سے نفرت کا احساس بلند سطح پر پہنچ گیا تھا۔

پاپا چند روز کے لیے پیرس گئے تھے اور اس کے سپرد آفس کے تمام معاملات چھوڑ گئے۔ شاید وہ اس کی خود اعتمادی میں اضافہ کرنا چاہتے تھے۔ حالانکہ وہ ابھی اپنے ایم بی اے کے آخری سمسٹر سے فارغ ہی ہوا تھا، مگر شاید پاپا کو اس پر کچھ زیادہ ہی بھروسہ تھا، تب ہی وہ بڑے آرام سے اسی روز فلائی کر گئے۔ گو کہ بزنس اس کا سبجیکٹ رہا تھا، مگر عملی طور پر بہرحال یہ ذمہ داری خاصی مشکل تھی۔ چند روز تک وہ آفس جاتا رہا اور اپنی دانست میں آفس کے معاملات کو بہتر طور پر ہینڈل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دن غیر ملکی ڈیلی گیشن سے اس کی میٹنگ تھی۔ یہ میٹنگ اسے اپنے کیریئر سیٹ اپ میں مدد دے سکتی تھی۔

پوری رات بیٹھ کر اس نے اپنی پریزنٹیشن کی تیاری کی تھی۔ صبح مقررہ وقت پر اس کی آنکھ نہیں کھل سکی تھی، لہٰذا بڑی عجلت میں وہ تیار ہو کر گھر سے نکلا تھا۔ گاڑی بھی خاصی عجلت میں ڈرائیو کر رہا تھا یا پھر سڑک کراس کرتی اس لڑکی کو زیادہ جلدی تھی، بہرحال کسی ایک کو قصوروار کہنا مشکل تھا۔ سڑک پر اوندھے منہ پڑی اس لڑکی پر اسے شدید طیش آیا تھا۔ بہرحال اس بات کا تو اسے یقین تھا کہ قصور اس کا نہیں تھا لیکن چونکہ وہ گاڑی میں تھا اور ایکسیڈنٹ جس کا ہوا تھا وہ پیدل راہ گیر تھی، لہٰذا اردگرد ہوتی سرگوشیوں میں قصوروار وہی تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی بہت غصے سے گاڑی سے باہر نکلا تھا۔ اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ بالکل بچوں کی مانند بلک بلک کر رو رہی تھی۔ سلجوق نے اسے دیکھ کر سکون کا سانس خارج کیا تھا، کیونکہ بظاہر دیکھنے میں اسے کوئی سیریس چوٹ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

سلجوق عمر نے جب اسے مخاطب کیا تب اس نے اپنے چہرے سے ہاتھ ہٹا دیے۔ سلجوق نے اس کے چہرے پر یک بیک مختلف تاثرات کو امنڈتے دیکھا تھا۔ مگر جس احساس سے وہ آگاہ ہوا تھا وہ حیرت تھی نہ تعجب تھا۔ وہ مسلسل اس کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ سلجوق عمر کو اس کے اس طرح دیکھنے پر کسی قسم کی حیرت نہیں ہوئی تھی اور شاید اس کسی نہ کسی طور خود کو ان نظروں کا عادی بنا چکا تھا۔ اگر اس کا حسن مبہوت کر دینے والا تھا تو اس میں خود اس کا کوئی کمال نہ تھا۔ وہ لڑکی اب بھی اپنی تکلیف سے بے نیاز اسے اپنے سابقہ انداز میں دیکھے چلی جا رہی تھی۔

اسے میٹنگ میں جلد از جلد پہنچنا تھا لہٰذا وہ اس لڑکی کے نخرے اٹھانے کا ہرگز بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس لڑکی کے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ زبردستی اسے قریبی کلینک لے گیا۔ کلینک پہنچ کر اسے ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ اس کے ہاتھ میں فریکچر ہے تو اسے اپنے ہاتھ سے پروجیکٹ جاتا ہوا دکھائی دیا۔ اتنے دن کی محنت پر جیسے کسی نے ایک ہی پل میں پانی پھیر دیا ہو۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے اسد کو فون کرنا پڑا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اسد اس میٹنگ کو بہت اچھی طرح ڈیل کر سکتا ہے۔ فون پر بہت اہم اہم پوائنٹ نوٹ کرواتے ہوئے سلجوق عمر کو اس لڑکی کی نظریں خود پر مرکوز ہوتی محسوس ہوئیں۔ سلجوق کو ان نظروں سے شدید نفرت کا احساس ہو رہا تھا محض اس لڑکی کی وجہ سے وہ اپنی آج کی پریزنٹیشن سے محروم ہو گیا تھا۔

اسد ہنستے ہوئے بار بار اس سے اس لڑکی کے بارے میں استفسار کر رہا تھا کہ وہ دیکھنے میں کیسی ہے، شاید وہ اسے بتا بھی دیتا اگر وہ اس لڑکی کو غور سے دیکھ لیتا۔ موبائل آف کرنے کے بعد اب وہ پہلے کی طرح غصے میں نہیں تھا۔ شاید وہ اس حقیقت کو قبول کر چکا تھا کہ وہ میٹنگ میں نہیں پہنچ پائے گا۔ اس لیے مزید کڑھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر وہ چاہتا تو اس لڑکی کو چھوڑ کر جا بھی سکتا تھا۔ مگر اپنی زندگی میں چند اصول جو وہ اپنے لیے متعین کر چکا تھا، انہیں توڑنے کا مرتکب ہونا نہیں چاہتا تھا۔

وہ بہت خاموشی سے اس کے ہاتھ پر پلاسٹر چڑھائے

جانے کا عمل دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس لڑکی نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ شدید دانستہ طور پر ایسا کر رہی تھی۔ سلجوق کو اب اس پر غصہ نہیں آ رہا تھا۔ شاید وہ تکلیف کے جس احساس سے گزر رہی تھی اس وجہ سے ایسا ہو رہا تھا، مگر چہرے کے تاثرات اب بھی سختی اور درشتی لیے ہوئے تھے۔

پے منٹ کرنے کے بعد وہ ایک ساتھ ہی کلینک سے باہر آئے تھے۔ سلجوق کا خیال تھا کہ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ اس سے معذرت کرے گا۔ معذرت بھی وہ صرف اپنے رویے کی کرنا چاہتا تھا، البتہ اس حادثہ کی ذمہ دار اب بھی اس کی نظر میں وہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اس نے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا — اسے حیرت کا شدید دھچکا لگا تھا۔ جب اس نے اس لڑکی کو قریب سے گزرتی ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ تب تک حیران رہا جب تک ٹیکسی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔ اس کے بعد تنفر کی ایک بھرپور لہر نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصے میں لے لیا۔ وہ کتنی ہی دیر تک غصے میں کھولتا رہا۔

کچھ دیر پہلے جو تھوڑی بہت ہمدردی اس نے اس لڑکی کے حوالے سے اپنے دل میں محسوس کی تھی اب اس کی جگہ محض تلخی، اشتعال اور تنفر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ لڑکی اس کے سامنے ہو اور وہ اسے اس کی اوقات یاد دلائے۔

نجانے کتنی دیر تک وہ سڑکوں پر پیٹرول پھونکتا رہا۔ اس رات وہ یکسوئی سے آفس سے لائی گئیں فائلز کا مطالعہ بھی نہ کر سکا۔ اس کے حواسوں پر جیسے صبح والا واقعہ پنجے گاڑ کر سوار ہو گیا تھا۔ پوری رات اس نے خود سے لڑتے ہوئے گزار دی تھی کہ آخر اسے اس لڑکی سے اس قدر ہمدردی کی کیا ضرورت تھی۔

اگلے روز جب وہ آفس جانے کے لیے گاڑی میں بیٹھنے لگا تو اس کی نظر گاڑی کی عقبی سیٹ پر رکھے چند شاپنگ بیگز اور اس براؤن شولڈر بیگ پر پڑی تھی۔ ایک بار پھر کل کا واقعہ تمام تر جزئیات سمیت اس کی نظروں کے سامنے گھوم گیا، مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ کل والی کیفیت اب نہیں تھی نہ تو اسے اس لڑکی پر غصہ آ رہا تھا اور نہ ہی اپنے آپ پر طیش۔ اسے صرف اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ لڑکی اسے اگنور کیسے کر سکتی ہے۔ کیا کوئی لڑکی سلجوق عمر کو بھی اس طرح نظرانداز کر سکتی ہے جیسے اس نے کیا تھا۔ یہ محض زعم یا تفاخر نہ تھا، بلکہ یہ وہ حقیقت تھی، جو زندگی کے ہر قدم پر اسے باور کروائی گئی تھی۔ مگر کل جو کچھ ہوا وہ بھی حقیقت تھی جسے وہ قبول نہیں کر پا رہا تھا اور جیسے یہ سوال اس کی کل زندگی کی جستجو بن گیا تھا۔

اس نے بہت آہستگی سے عقبی سیٹ سے اس براؤن بیگ کو اٹھایا۔ بیگ کھولتے ہی جو چیز سب سے پہلے اس کے ہاتھ لگی تھی وہ اس کا انسٹی ٹیوٹ کارڈ تھا۔ وہ آئی بی اے سے ایم بی اے کر رہی تھی۔ "بختاور!" زیر لب اس نے اس نام کو دہرایا۔

کارڈ پر لکھے ایڈریس کی مدد سے اس کے گھر پر تمام چیزیں پہنچاتے ہوئے وہ کسی قسم کی کوفت کا شکار نہیں ہوا تھا، بلکہ غیر دانستہ طور پر وہ اس بات کا منتظر تھا کہ یہ تمام چیزیں وہ خود وصول کرے گی۔ تمام چیزیں ملازم کو تھماتے ہوئے وہ متاسف تھا۔ ایسا کیوں تھا وہ خود سمجھنے سے قاصر تھا۔

پھر یہ ہوا تھا اس کے وہ تمام کام جس میں اس کی دلچسپی تھی ان تمام کاموں سے اس کا جی اچاٹ ہونے لگا۔ ایک عجیب سی بے چینی نے اس کے تمام احساسات کو اپنی گرفت میں لیا ہوا تھا۔ اور پھر دل کے بہت سمجھانے کے باوجود وہ آئی بی اے چلا آیا۔ آخری سمسٹر دینے کے باوجود بھی وہ اکثر انکل شیرازی سے ملنے یہاں آیا کرتا تھا اور اسے کبھی کسی قسم کی جھجک کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا مگر آج اسے ایک بے معنی سی جھجک کا سامنا تھا اور پھر اس کی اتنے دن کی بے قراری، بے چینی اور جھجک ایک ہی پل میں ختم ہو گئی۔ کینٹین کے باہر اپنی دوستوں کے ہمراہ بختاور کو ایک نظر دیکھنے کے بعد وہ اپنے دل میں ابھرتے انجانے سے احساسات کی تصدیق کر چکا تھا۔ اسے بختاور سے محبت ہو گئی تھی۔ ایک عجیب سی صورت حال نے اسے

ایک عجیب سی راہ پر گامزن کردیا تھا۔

محبت کرنا اس کے لیے عجیب ہی تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی محبت کرنے کے امکانات کی امید بھی نہیں کی تھی۔ محبت کرنا ایسا قابل گرفت عمل بھی نہیں تھا' مگر شاید اس کے لیے تھا۔ اس نے اس کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا۔ البتہ اس نے یہ ضرور سوچا تھا کہ وہ اپنی پسند کی شادی کرے گا' ایک ایسی لڑکی سے جو اس کی مزاج آشنا ہو' جو خود کو اس کی پسند میں ڈھال لے' جیسا وہ چاہے ویسا ہی کرے' پسند کا اختیار اس کے پاس تھا اور ایک مناسب وقت کا منتظر تھا۔ اس نے اتنی لڑکیوں کو خود پر مرتے دیکھا تھا کہ کسی خاص لڑکی کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا' دوسرے معنی میں مستقبل کے حوالے اس نے خود کو کسی بھی قسم کی پریشانی میں مبتلا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مگر پھر فقط ایک پل کے احساس نے اسے محبت جیسی منزل پر لا کھڑا کیا تھا اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس لڑکی کے معیار پر پورا اترتا ہے یا نہیں۔ کیا وہ لڑکی اسے پسند کرتی بھی ہے' یا نہیں۔ اپنی زندگی میں آج تک وہ درجنوں لڑکیوں کو مسترد کرتا آیا تھا اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہیں بختاور اسے مسترد نہ کردے اور پھر اس سوچ سے آگے وہ کچھ سوچ ہی نہیں پایا تھا یا پھر وہ سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"میں بختاور کے بغیر نہیں رہ سکتا' میں سوچ ہی نہیں سکتا کہ میں اس کے بغیر زندگی گزاروں گا۔" نجانے کیوں اسے ایسا لگنے لگا تھا کہ بختاور اسے پسند نہیں کرتی۔ پہلی ملاقات کے آخری چند لمحات اسے یہ سب باور کروا گئے تھے۔ دوسری بار وہ خود اسے یونیورسٹی دیکھنے گیا تھا اور تیسری بار سلجوق نے اس سے ملنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ یہ اس کی خواہش کی شدت کی انتہا تھی جب اس نے اسے سیرٹن کی آرٹ گیلری میں دیکھا تھا۔ حسب توقع آج بھی وہ اپنی دوستوں کے ہمراہ تھی۔ اس کی تمام تر حسیات اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑی بختاور پر مرکوز تھیں۔ وہ بس اس لمحے کا منتظر تھا جب وہ اس کے قریب آتی اور وہ شناسائی کے ان لمحات کا حوالہ دے کر اس سے چند لمحوں کی گفتگو کرسکتا' جو شاید اس کے لیے خوشگوار نہ ہوں مگر سلجوق کے لیے اس کی زندگی کا حاصل تھے۔

اسد کو اپنی جاننے والی دکھائی دے گئی تھی اور وہ وہیں مصروف تھا۔

"ہیلو سلجوق!" کسی مردانہ آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا۔ وہ ایک دم چونک کر آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ فائق کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے ایک خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ فائق اور اس کی فیملی کے قریبی تعلقات تھے۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی فیملی باہر سیٹل ہوگئی تھی۔ پانچ سال بعد وہ فائق کو دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو!" اس نے گرمجوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس ہیلو ہائے کے دوران اسے ایسا لگا جیسے کوئی اس سے ٹکرایا ہو۔ وہ ایک دم چونک کر مڑا۔ اپنے قریب بختاور کو کھڑا دیکھ کر اس کے چہرے پر نمایاں خوش کن چمک نمودار ہوئی تھی۔ مگر اس کی یہ چمک محض لمحاتی وقفہ پر محیط ثابت ہوئی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر سپاٹ لہجے میں سوری کہہ کر وہ دوسری سمت مڑ گئی۔ سلجوق عمر کا جیسے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا محال ہوگیا۔ وہ اس لڑکی کی بے رخی برداشت نہیں کرپا رہا تھا۔

"کیا تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟" فائق نے اس کی محویت کو توڑتے ہوئے دریافت کیا۔

وہ بے اختیار اثبات میں سر ہلا گیا اور پھر سوال کی نوعیت سمجھتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگا اسے اپنے اعصاب پر کوئی بوجھ گرتا محسوس ہوا تھا۔ فائق سے رسمی دعا سلام کے بعد وہ زیادہ دیر تک یہاں ٹھہر نہیں سکا تھا۔ اسے آج احساس ہوا تھا کہ محبت انسان کو کمزور بنادیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اندر سے ٹوٹتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

بعض اوقات اسے اپنی بے اختیاری پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ وہ قدرے سنجیدہ اور ریزرو قسم کا آدمی تھا۔ اس نے اپنی چوبیس سالہ زندگی میں کبھی خود کو اس قدر کمزور محسوس نہیں کیا تھا۔ جتنا آج وہ خود کو اس لڑکی کے سامنے محسوس کر رہا تھا۔ والہانہ نظروں سے اس نے بختاور کو دیکھا تھا۔ بختاور نے اس پر نگاہ بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار وہ کسی قسم کے خوف میں مبتلا ہوا تھا' بختاور کو کھو دینے کا خوف۔ زندگی میں پہلی بار اس نے اپنی سوچوں میں اپنے علاوہ کسی اور کو پایا تھا' بختاور کو۔ زندگی میں پہلی وہ خود کو کسی سے کم تر محسوس کر رہا تھا' بختاور سے۔ زندگی میں پہلی بار وہ کسی کی سرد مہری اور لاتعلقی برداشت کر رہا تھا' بختاور کی' لیکن کرنا نہیں چاہتا تھا۔

چوتھی بار اس نے بختاور کو مارکیٹ میں دیکھا تھا۔ اس بار بھی بختاور نے اسے اگنور کردیا تھا' پھر وہ اسے اکثر کہیں نہ کہیں دکھائی دینے لگی۔ کبھی کافی شاپ پر' کبھی جم میں' مگر ہر بار لاتعلقی کا مظاہرہ کرتی ہوئی اس کے سامنے سے ہٹ جاتی۔ وہ یقیناً" ایسا دانستہ کر رہی تھی اور اسے کرنا بھی چاہیے تھا۔ وہ اس سے اتنے برے رویے کا مرتکب جو ٹھہرا تھا۔ لیکن بعض دفعہ وہ یہ سوچنے پر مجبور ضرور ہو جایا کرتا تھا کہ وہ اتنی کڑی سزا کا مستحق ہونے کے باوجود معافی جیسے رویے کا بھی حق دار تھا۔

اس روز اسد پر اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے کے بعد نہایت فیصلہ کن انداز میں پارکنگ کی جانب چلا آیا اور اس کی توقع کے عین مطابق' وائیٹ کلٹس سے ٹیک لگائے' وہ شاید کسی کی منتظر تھی۔ سلجوق کے مخاطب کرنے کے جواب میں اس نے متحیر انداز میں اس کی جانب دیکھا تھا۔ ایسے جیسے وہ اس سے اس اقدام کی توقع نہ کر رہی ہو اور پھر سلجوق نے اس سے معذرت کی۔ مگر جواب میں وہ مسلسل اسے اگنور کرنے کی اول روز کی پالیسی پر عمل درآمد کر رہی تھی۔ تب سلجوق نے سوچا کہ اپنے دل کی بدلتی کیفیات میں وہ اسے بھی شریک کرے معاً" بختاور کے چہرے کے بدلتے تاثرات کے سبب وہ سامنے دیکھنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ بختاور کی دوست تھی۔ سلجوق نے کئی بار اسے بختاور کے ساتھ دیکھا تھا۔

"کہاں چلی گئی تھیں تم' جانتی ہو کتنی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔" وہ روہانسی سی اس کی جانب بڑھی تھی۔ سلجوق عمر پر نظر پڑتے ہی اس کی کیفیات بھی بختاور سے مختلف نہ تھیں۔

"دراصل گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی' میں پانی لینے گئی تھی۔" اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی بوتل کو لہراتے ہوئے بظاہر بختاور کو جواب دیا۔ مگر اس کی نگاہوں کا براہ راست مرکز سلجوق عمر تھا' جو اپنی گاڑی سے ٹیک لگائے سینے پر بازو باندھے ان دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔

بختاور قدرے ناراضی لیے ایک سائیڈ پر کھڑی ہو گئی' جب کہ اس کی دوست بونٹ کھول کر اس پر جھک گئی تھی' پانی ڈالنے کے بعد بھی انجن اسٹارٹ نہیں ہوا تھا۔

"میں آپ دونوں کی کچھ مدد کرسکتا ہوں؟" اسی انداز میں کھڑے کھڑے اس نے ان دونوں کو مخاطب کیا۔ بختاور کا چہرہ قدرے سپاٹ تھا' جب کہ اس کی دوست کسی قدر ممنونیت سے سلجوق کی جانب دیکھ کر مسکرائی۔

"شیور!" وہ بونٹ کے سامنے سے ہٹ گئی۔ اپنی آستینیں فولڈ کرتا ہوا وہ بونٹ پر جھک گیا۔ بظاہر وہ وائر کو ادھر سے ادھر کرتا گاڑی کے مرض کی تشخیص کر رہا تھا۔ مگر درحقیقت وہ اس کام سے اتنا ہی لاعلم تھا' جتنا کہ وہ دونوں۔ چہرے کے تاثرات سے اس نے ایسا کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے بونٹ گراتے ہوئے اپنے ہاتھ جھاڑے پھر بختاور کی دوست کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے گاڑی کو سروس اسٹیشن لے جانا پڑے گا۔" جواباً" ان دونوں کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمودار ہوگئے۔

"اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں' تو میں آپ کو ڈراپ کرسکتا ہوں' میرا ڈرائیور آپ کی کار سروس اسٹیشن لے جائے گا۔" وہ دونوں متذبذب انداز میں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔

"ویل! آپ دونوں مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں۔" اس

نے اپنے دونوں بازو سینے پر باندھتے ہوئے خود اعتمادی اور قدرے سنجیدگی سے کہا۔ جواباً" بختاور کی دوست مسکرانے لگی جب کہ بختاور گاڑی سے ٹیک لگائے ان دونوں کی گفتگو سے لاتعلق سامنے گزرتے ٹریفک پر نظریں جمائے ہوئے تھی۔ چہرے پر وہی اجنبیت تھی جس کا وہ ابھی تک عادی نہ ہو سکا تھا۔

بختاور کی دوست تھوڑی بہت متامل دکھائی دے رہی تھی جب کہ وہ بے نیازی سے کہہ رہی تھی۔

"ہمیں اتنی جلدی تو نہیں ہے' ہم ٹیکسی سے چلے جائیں گے۔"

"آپ مجھے ٹیکسی ڈرائیور سمجھ سکتی ہیں۔"

"بختاور! میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے' ٹیکسی کا یہاں ملنا دشوار لگ رہا ہے۔" اس کی دوست نے قدرے بلند مگر ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ جواب میں سلجوق نے بختاور کو شانے اچکاتے ہوئے دیکھا۔ اسے اپنا وجود ہوا میں اڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس سے یہ بے نام سی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

مجھ سے یہ اپنی بے نام سی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی' مگر یہ خوشی مجھے معیز سے ہر حالت میں چھپانی تھی پھوپھی زاد ہونے کے علاوہ جو رشتہ ہم دونوں کے مابین خاصا مضبوط تھا وہ رشتہ دوستی کا تھا۔ اس رشتے کا احساس بھی مجھے معیز نے دلایا تھا۔ ہر قدم پر میرا ساتھ دیتے ہوئے' میرا اعتماد بڑھاتے اس نے اس رشتے کو نبھایا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ معیز کے علاوہ کوئی بھی میرے احساسات نہیں سمجھ سکتا۔ بظاہر جھاڑ پلاتا ہوا لیکن درحقیقت خیال رکھنے والا۔

کب میری پسند معیز کی پسند سے ہم آہنگ ہو گئی' مجھے خبر ہی نہ ہو سکی اور جب خبر ہوئی تو ایک بے یقینی کی سی کیفیت نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ معیز کا میرے بارے متفکر انداز اور کیئرنگ رویے نے مجھے ایسا سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو۔ اب یہ بے یقینی' حقیقت کی جانب مائل ہونے لگی تھی' میں اس حقیقت کو قبول کر چکی تھی کہ مجھے معیز سے محبت ہو گئی ہے۔

پھوپھو کی اپنے بارے میں ناپسندیدگی اور معیز کے متوقع جارحانہ عزائم کے باوجود میں اس حقیقت سے انکار نہیں کر پا رہی تھی۔

ڈھیر سارے نوٹس اپنے اردگرد پھیلائے میں مسلسل معیز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

"ہیلو گائز! کیا ہو رہا ہے؟" معیز کی بھاری آواز مجھے خیالوں سے کھینچ لائی۔ پہلی بار مجھے اپنی دھڑکنیں منتشر ہوتی محسوس ہوئیں۔ ارتضٰی اس سے معانقہ کرتے ہوئے شکوہ کر رہا تھا کہ اس نے کافی عرصے بعد چکر لگایا تھا۔ جواباً" وہ اپنے آفس کا رونا روتے ہوئے مسلسل اپنے والد محترم کو قصوروار ٹھہرا رہا تھا' جنہوں نے اس کے رزلٹ سے پہلے اسے آفس کے دھندوں میں پھنسا دیا تھا۔ ان شکوہ شکایتوں کے بعد اب اس کا رخ میری جانب مڑ گیا۔

"تمہیں کیا ہوا ہے' تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟"

"اس کی شکل ہی ایسی ہے۔ تم نے اسے خواہ مخواہ MBA کرنے پر مجبور کیا ہے' جس قدر یہ یونیورسٹی کے نام سے ڈرتی ہے' مجھے تو لگتا ہے اس کا پاس ہونا بھی مشکل ہے۔" ارتضٰی خفگی آمیز انداز میں کہتے ہوئے باہر نکل گیا۔

"دیکھو! تم ناک مت کٹوا دینا' میں نے تو تمہارے حوالے سے بڑے بڑے دعوے کیے ہوئے ہیں۔"

"معیز! بی ایس سی کے مقابلے میں MBA خاصا مشکل ہے۔" میں نے تقریباً" بسورتے ہوئے اپنے اردگرد بکھرے ہوئے نوٹس کو غیر دلچسپ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"بس۔ اتنی اکڑ اور ہمت تھی تم میں۔ دیکھو عینی! یہی زندگی ہے' ہر لمحہ جدوجہد اور کوشش۔ فارغ رہ کر انسان کے دماغ کو صرف زنگ لگتا ہے اور کچھ نہیں۔"

"لیکن! یہ بہت مشکل ہے۔" میری سوئی جیسے ایک ہی جگہ اٹک سی گئی تھی۔

"مشکل! اس نے تعجب سے مجھے دیکھا۔" بہت آسان ہے' میں نے کر لیا ہے تو تم بھی کر لو گی۔" وہ سابقہ انداز میں پر یقین لہجے میں کہہ رہا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ میں پڑھائی میں کمزور تھی۔ اصل مسئلہ انسٹیٹیوٹ جانا تھا' جہاں لڑکیاں تو کم تھیں مگر لڑکوں کا ہر وقت جمعہ بازار لگا ہوتا تھا۔ ہر بار یونیورسٹی میں داخل ہوتے مجھے ایسا لگتا تھا جیسے ہر لڑکا میری جانب متوجہ ہو۔ مجھے گھور رہا ہو۔ یہ میری فطری جھجک تھی کہ جب کوئی مرد استاد مجھے مخاطب کرتا میں نروس ہو جاتی۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپنے لگتے۔ بظاہر میں اعتماد سے جواب دے رہی ہوتی تھی' اندر سے میں کس قدر گھبراہٹ کا شکار ہوتی تھی اس سے صرف میں ہی واقف تھی۔ بتدریج میں خود کو ہر بار غیر متوقع صورت حال کے لیے تیار رکھنے کی سعی کرتی۔ ایک بار میں نے اپنے اسی خدشے کا اظہار فارینہ کے سامنے کر دیا۔ جواباً" فارینہ کھل کر ہنسی تھی۔

"تو دیکھنے دو۔ اس میں اتنا سیریس لینے والی کون سی بات ہے' لڑکوں کی تو یہ عادت ہوتی ہے۔ وہ عام شکل و صورت کی لڑکی کو گھورنے سے باز نہیں آتے' تم تو پھر بھی اچھی خاصی حسین ہو۔ ویسے وہ کون لڑکا ہے' کلاس کا ہے؟"

"میں کسی ایک لڑکے کی بات نہیں کر رہی۔" میں نے زچ ہوتے ہوئے جواب دیا تھا۔

معیز کو میں اپنے ان خدشات میں شامل کرنے کی غلطی ہرگز نہیں کر سکتی تھی۔ فارینہ نے تو ہلکے پھلکے انداز میں ہی مذاق اڑایا تھا مگر معیز محض مذاق اڑانے پر ہی اکتفا کرنے والا نہیں تھا۔

"معیز! تم کھانا کھاؤ گے؟" اپنے نوٹس سمیٹتے ہوئے میں نے سرسری انداز میں اس سے دریافت کیا۔

"نہیں کھانا تو میں کھا کر آیا ہوں' البتہ کافی ضرور پیوں گا۔" تساہل سے صوفے کی بیک سے ٹیک لگائے' وہ مکمل طور پر فارغ دکھائی دے رہا تھا۔ میں کچن کی طرف بڑھنا ہی چاہتی تھی۔ جب ایک بار پھر اس کی آواز نے مجھے مخاطب کیا۔

"ذرا جلدی آنا' مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"تمہیں مجھ سے کیا ضروری بات کرنی ہے؟" میرے دل میں ایک بار پھر دھکڑ پکڑ شروع ہو گئی تھی۔ کیا یہ میرے بدلتے ہوئے احساسات کے بارے میں تو نہیں جان گیا اور بقول اس کے یہ میرے احساسات میرے چہرے سے ہی پڑھ لیتا ہے۔ نہیں اسے یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ میں اسے پسند کرنے لگی ہوں۔ یہ تو مذاق اڑا اڑا کر میرا جینا دوبھر کر دے گا۔

"تم کافی بنا کر لاؤ۔ پھر بات کرتے ہیں اس بارے میں۔" وہ مکمل طور پر سسپنس پھیلائے ہوئے تھا۔

کافی بنا کر جب میں لاؤنج میں آئی تو معیز کے ساتھ مومو کو بیٹھے پایا تھا۔ وہ اس کے ساتھ جڑی بیٹھی اپنے کسی ٹیڈی بیئر کی خود سے گھڑی گئی کہانی سنا رہی تھی' جسے وہ بڑی دلچسپی اور توجہ سے سن رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے کافی کا مگ لیتے ہوئے اس نے ممنون نظروں سے مجھے دیکھا۔

"تھینکس عینی! اس وقت کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔" وہ کافی کے ہلکے ہلکے سپ لینے لگا۔

"تم کوئی ضروری بات کرنے والے تھے۔" ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے میں مختلف اندیشوں کی لپیٹ میں تھی۔ مگر معیز نے جیسے میری کسی بات کو سنا ہی نہیں۔

"تمہارے پیپرز کب ہو رہے ہیں؟"

"تین ماہ بعد۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کے اس غیر متعلقہ سوال کا جواب دیا تھا۔

"تیاری کیسی ہے؟" اب مجھے معیز پر غصہ آنے لگا تھا۔ مجھے تجسس میں مبتلا کر کے وہ شاید میری موجودہ حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے' میری تیاری کے بارے میں تم مجھ سے زیادہ جانتے ہو اور کیا یہی ضروری بات تھی جو تم

مجھ سے کرنا چاہتے تھے۔" میں نے بھنویں اُچکاتے ہوئے چڑچڑے لہجے میں کہا۔

"بات تو خیر میں تم سے کوئی اور کرنے والا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا کہ مجھے تین ماہ کا انتظار کر لینا چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ میرے تو جیسے سر پہ لگی تھی۔

"لیکن میں تین ماہ کا انتظار نہیں کر سکتی۔"

"تمہیں کیا ہوا ہے، اتنی چڑچڑی کیوں ہو رہی ہو۔"

"یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، مجھے تجسس میں مبتلا کرنے کے بعد۔" معیز سنجیدہ انداز میں میری جانب دیکھ رہا تھا۔

"تمہاری یہی عادت مجھے بری لگتی ہے، کسی بھی بات کے پیچھے۔ ہاتھ دھو کر پڑ جانا۔ ٹھیک ہے ایک نامناسب وقت پر مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہاری اسٹڈی ڈسٹرب ہو۔ تمہیں تو کبھی بھی اپنی اسٹڈی کی پروا نہیں رہی، لیکن مجھے پروا ہے۔ یہ تین ماہ تمہارے لیے کس قدر اہم ہیں شاید تم نہیں جانتیں اور تم جانو بھی کیوں، میں جو موجود ہوں تمہارے ہر غم میں گھلنے والا۔"

"لیکن معیز۔۔۔!" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ اب میں تم سے تمہارے ایگزام کے بعد ہی ملوں گا، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا تم سے رابطہ ختم ہو جائے گا۔ میں تم سے فون پر رابطہ رکھوں گا اور تمہیں اگر اپنی اسٹڈی کے بارے میں کچھ بھی پوچھنا ہو، کوئی بھی مشکل درپیش ہو تم مجھے کال کر سکتی ہو۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

آج اس کا ہر ہر انداز مجھے چونکا رہا تھا۔ وہ جب سے آیا تھا پرسوچ انداز میں گفتگو کر رہا تھا۔ اس کے ہر انداز سے تفکر جھلک رہا تھا۔ وہ چند لمحوں تک، مجھے دیکھتے رہنے کے بعد لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔

میں مومو کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرے حواسوں پر ابھی تک معیز کی سنجیدگی اور پُراسراریت طاری تھی۔ معیز کو سوچتے سوچتے کب میری آنکھ لگی مجھے پتا ہی نہ چلا۔ جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ میں نے لائیٹ آن کر کے جب کلاک پر نظر دوڑائی تو مجھے وقت کے تیزی سے گزرنے کا احساس ہوا تھا۔ شام کے سات بج رہے تھے۔ میں نے متلاشی نظروں سے مومو کو دیکھا۔ وہ وہیں کارپٹ پر اپنے کھلونوں سے کھیلتے ہوئے سو گئی تھی۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد میں نے کمرے کی لائیٹ آف کر دی اور پھر کچن میں جانے کے ارادے سے باہر نکل آئی۔ معیز کے آنے کی وجہ سے میں دوپہر کا کھانا نہیں کھا سکی تھی اور اب آنکھ کھلتے ہی مجھے شدید بھوک کا احساس ہوا تھا۔ گیلری سے گزرتے ہوئے مما کے کمرے سے خفیف سی آواز سنائی دی تھی۔ بہت غور کرنے پر میں پھوپھو کی آواز پہچان گئی تھی۔ اب کچن کی جانب بڑھتے قدم مما کے کمرے کی اور بڑھ گئے تھے پھوپھو کا ترش اور تلخ لہجہ یقینی طور پر مما کے لیے تھا۔ وہ مما سے اسی انداز میں مخاطب ہوا کرتی تھیں۔ بچپن سے لے کر آج تک میں نے پھوپھو کو مما سے اسی انداز میں بات کرتے دیکھا تھا۔ کبھی کبھار انکل مگر اکثر معیز انہیں اس رویّے پر ٹوک دیا کرتا تھا مگر پاپا نے انہیں کبھی نہیں ٹوکا تھا اور غالباً" یہی وجہ تھی کہ ہر بار ان کے جارحانہ تیور مزید تندی لیے ہوتے تھے۔

آج ان کی ناراضی اور تلخی کی کیا نوعیت تھی، یہی جاننے کے لیے میں نے دروازے کو کھولنے کے لیے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تھا مگر پھوپھو کی آواز نے میرے تمام وجود کو ساکت کر ڈالا۔

"زندگی میں کسی نے بھی کسی پر اتنا احسانات نہیں کیے ہوں گے جتنے۔۔۔ ہم لوگوں نے کیے ہیں، میرے بھائی نے کیے ہیں۔ میرے بھائی نے اگر تم سے شادی کی ہے تو یہ تمہاری اوقات نہیں بلکہ احسان ہے ہمارا۔ بات تو میں اپنے بھائی سے ہی کرنے آئی تھی مگر میری قسمت تو یہ ہے کہ جس سے میں شدید نفرت کرتی ہوں اور جس کی شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی اس کا بار بار سامنا کروں۔"

"پلیز آہستہ بولیں۔" مما کا ملتجی لہجہ میری سماعتوں پر سیسے کی مانند گر رہا تھا۔ میں چند ساعت تک اندر جانے اور نہ جانے کی کشمکش میں گرفتار رہی، تاہم کچھ سوچتے ہوئے اپنی سابقہ خاموشی کو برقرار رکھتے ہوئے معاملے کی نوعیت کا اندازہ لگانے لگی۔ ایک بار پھر پھوپھو کی آواز ابھری۔

"میں اسی لہجے میں بات کروں گی، کیونکہ تم اسی کی مستحق ہو۔ تمہاری رونی اور مسکین شکل دیکھ کر نہ تو مجھے تم پر کوئی ترس آ رہا ہے، نہ ہی رحم۔ تیئس سال پہلے تم نے ہم پر رحم کھایا تھا تم نے ہماری فیملی کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔"

تند لہجے میں بولتے ہوئے ان کی آواز مزید بلند ہو گئی۔ شاید انہیں اپنے اس رویّے سے کوئی تسکین حاصل ہوتی تھی۔ لیکن مجھے ان پر غصہ نہیں آ رہا تھا، مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ میری نظر میں قصوروار محض مما کی ذات تھی۔ جن کی عزت نفس اور خودداری غالباً" پاپا سے محبت نبھانے کی خاطر یا تو سو گئی تھی یا پھر انہوں نے اسے مار ڈالا تھا۔ وجہ کوئی بھی رہی ہو میں ان کی خاموشی کو صبر اور ایثار کے نام نہیں دے سکتی تھی۔ شاید ان کی یہی خواہش رہی ہو کہ کوئی انہیں ان ہی القاب سے پکارے۔ کم از کم میں ان کے اس عمل کو محبت سے تعبیر نہیں کر سکتی تھی۔ یہ محبت ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

پھوپھو کی آواز کے بعد ایک طویل خاموشی کا وقفہ آیا تھا۔ پھوپھو کا رویّہ میرے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھا۔ وہ ہر بار مما کو اسی انداز میں طعنے دیا کرتی تھیں۔ ان کے لہجے میں ہر بار تضحیک اور تذلیل کا عنصر دوگنا ہوا کرتا تھا۔ مما کی یہ خاموشی نہ تو پھوپھو کی توقع کے خلاف تھی اور نہ ہی میری توقعات کے برعکس۔ مگر آج پہلی بار میرا جی چاہا تھا کہ میں مما کی جانب سے پھوپھو کو جواب دوں، بالکل اسی انداز میں جیسا پھوپھو اپنائے ہوئے تھیں۔ میرے پاس ضبط کی آزمائش کا ایک لمحہ بھی نہیں تھا۔ میں ایک دم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔ خود پر مما کی نظر پڑتے ہی میں نے مما کے چہرے کو فق ہوتے دیکھا۔ ان کے چہرے کا خوفناک تاثر جیسے میرے دل میں پیوست ہو کر رہ گیا تھا۔

مجھے دیکھ کر پھوپھو کی جو تھوڑی بہت بولنے کی خواہش بچی تھی وہ ختم ہو چکی تھی۔ مگر یہ نہیں تھا کہ ان کے چہرے کا تلخ تاثر ختم ہو گیا تھا۔ ان کے چہرے کا تاثر اب بھی ان کے لفظوں کی عکاسی کر رہا تھا۔

"تم جاگ گئیں؟" مما کا لکنت آمیز لہجہ مختلف اندیشوں کی لپیٹ میں تھا اور وہ اندیشے کیا ہو سکتے تھے۔ وہ میں اچھی طرح جان گئی تھی۔ پھوپھو کی تلخ کلامی جتنی دیر بھی میں نے سنی تھی بہرحال مبہم ہی تھی، اس پر مما کا یہ خدشہ کہ میں نے سن نہ لیا ہو، بے بنیاد ہی تھا۔ مما کے استفسار طلب نظروں کے جواب میں، میں محض شانے اچکا کر رہ گئی۔

"پھوپھو کو سلام نہیں کیا تم نے؟" ان کا لہجہ تنبیہہ لیے ہوا تھا۔ میں مما کو دیکھ کر رہ گئی۔ یہ مما کی اعلا ظرفی نہیں بلکہ انتہا پسندی کا ثبوت تھا۔ مارے باندھے میں نے سلام جھاڑا تھا۔ جواب دینا تو درکنار انہوں نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ خاندان والوں کے اسی رویّے کے سبب میں نے اپنے آپ کو کاٹ کر ایک الگ تھلگ دنیا کا باسی بنا لیا تھا۔ میں دل ہی دل میں مما کے ظرف کی قائل ہو گئی۔

"قرۃ العین! تم اپنے کمرے میں جاؤ، مجھے تمہاری پھوپھو سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

"اب کیا باتیں ہو سکتی ہیں، کہنے کو بچا بھی کیا ہے۔" پھوپھو اکھڑے ہوئے لہجے میں کہتی ہوئی اپنا ہینڈ بیگ اور موبائل سنبھالتی ہوئیں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"پلیز! بیٹھیے وہ آتے ہی ہوں گے۔ ان سے مل کر چلی جایئے گا۔ اتنے دنوں بعد تو آپ آئی ہیں۔" پھوپھو پر ان کے التجائیہ انداز کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا، تب ہی وہ ان کی آواز کو اگنور کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔ میں نے مما کو بھی ان کے پیچھے لپکتے دیکھا تھا۔ چند منٹوں بعد مما پژمردہ انداز میں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کا

مضمحل اور تھکا تھکا انداز مجھے ترحم میں مبتلا کر گیا۔ میں ان کے قریب آ بیٹھی۔ مما ایک دم چونک کر مجھے دیکھنے لگیں۔

"کھانا کھایا تم نے؟" میں بہت غور سے ان کے چہرے کے اضمحلال کو دیکھ رہی تھی۔

"تم فریش ہو جاؤ' میں خادم حسین سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔ ارتضیٰ نے بھی دوپہر میں کھانا نہیں کھایا تھا' نجانے کن مصروفیات ــــ میں گم رہنے لگا ہے یہ لڑکا۔" وہ مصروف انداز میں کہتی ہوئیں دروازے سے باہر نکل گئیں۔ جس وقت وہ یہ سب کہہ رہی تھیں میں نے ان کے چہرے پر تھکن پژمردگی اور کرب کے آثار دیکھے تھے جنہیں میں بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی' جواب ان کے چہرے کا مستقل جز بن چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود میں ان کے چہرے کی اس تکان کی عادی نہیں ہوئی تھی اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے دل میں مما کو ہنستے مسکراتے دیکھنے کی خواہش ابھی زندہ تھی۔ پاپا سے وابستہ یہ خواہش دم توڑ چکی تھی۔

مما اور پاپا نے الگ الگ ایک انفرادی زندگی گزاری تھی اور گزار رہے تھے۔ خود سے وابستہ زندگیوں سے بے نیاز ہو کر وہ نجانے کن راستوں کے مسافر تھے۔ مجھے کبھی بھی ان مقاصد کی سمجھ نہیں آئی تھی' جن کے تحت انہوں نے زندگی گزاری تھی۔ غصے اور کرب کا ایک سیلاب تھا جس میں میرا وجود ایک کمزور تنکے کی مانند ہچکولے لے رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

غصے اور کرب کا ایک سیلاب تھا جس میں اس کا وجود ایک کمزور تنکے کی مانند ہچکولے لے رہا تھا۔ جب کہ ان دونوں کے چہرے متوقع کامیابی کی انجانی سی خوشی سے دمک رہے تھے۔ سارہ کل کا واقعہ تفصیلاً نادیہ کے گوش گزار کر رہی تھی جب کہ نادیہ کی سوئی محض ایک ہی فقرے پر اٹک سی گئی تھی۔

"آخر میں کیوں نہیں گئی تمہارے ساتھ؟ مجھے تو یقین نہیں ہو رہا کہ سلجوق عمر نے تم دونوں کو لفٹ کی آفر دی تھی یو نو سارہ! اٹس ان بلیو ایبل۔"

لفٹ کے بعد اس نے جس طرح ہمارا تفصیلاً تعارف لیا تھا' اس نے تو جیسے مجھے گنگ ہی کر دیا تھا۔ میں اس کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی' سلجوق عمر میرے اس قدر قریب تھا کہ مجھ سے کچھ بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے یہ دیکھو میرا دل ابھی تک دھڑک رہا ہے۔"

سارہ کا جوش بھی قابل دید تھا۔ وہ تینوں اس وقت اس ریسٹورنٹ میں موجود تھیں جہاں سلجوق عمر بلاناغہ آیا کرتا تھا اور آج وہ اپنے اتنے دنوں کی محنت کو پر ثمر بنانے کے لیے موجود تھیں۔ بختاور خاموشی سے اپنے دونوں ہاتھوں کو اضطراری انداز میں مسلتے ہوئے اپنے دل میں ہوتی دھکڑ پکڑ سے نبرد آزما تھی۔ آج کے بعد یہ ڈرامہ ختم ہو جائے گا اور وہ پھر سلجوق عمر کو نہیں دیکھ پائے گی۔ اس کی آواز نہیں سن سکے گی۔ زندگی کتنی اچھی گزر رہی تھی' کسی کرب کسی اضطراب کا نام نشان نہ تھا اور اب ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی ایک جگہ آ کر ٹھہر سی گئی ہو۔

جب سے سلجوق عمر نے اسے مخاطب کیا تھا' جن نظروں سے اسے دیکھا تھا' وہ قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ اسے اپنا وجود فنا ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ والہانہ نظریں جیسے اس کی کل زندگی کا حاصل بن گئی تھیں۔ لمحے ساکت تھے اور احساسات منجمد۔ اس سے آگے وہ کچھ سوچنا اور دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ثاقب کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی' مگر کل سے دماغ محض ثاقب کے متعلق سوچ سوچ کر شل سا ہو گیا تھا۔ وہ ذہنی طور پر مفلوج ہوتی جا رہی تھی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تمہاری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟" نادیہ نے متعجب نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ سارہ بھی انہیں نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"پتا نہیں کیوں' مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا' مجھے کوئی خوشی نہیں ہو رہی۔" وہ اب بھی اضطراری انداز میں اپنی انگلیاں مسل رہی تھی۔

سارہ نے بہت آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا تھا پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ قدرے سنجیدہ لہجے میں بولی تھی۔

"بس یہ آخری بار ہے اس کے بعد نہ تو ہمیں سلجوق عمر سے ملنا ہے اور نہ ہی اس کے متعلق سوچنا ہے تم اپنے آپ کو کسی بھی گلٹ میں مبتلا مت کرو۔"

"سارہ! وہ دیکھو سلجوق عمر آ رہا ہے۔" نادیہ نے سرگوشی کرتے ہوئے سارہ کو مخاطب کیا تھا۔

سارہ ایک دم عجلت میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"تم یہیں بیٹھی رہنا ہم دونوں ابھی آ رہے ہیں۔" وہ دونوں عجلت میں ریسپشن کی جانب چل دیں' جب کہ وہ یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔ نجانے کتنی ساعتوں تک وہ ایسے ہی بیٹھی رہی تھی اور پھر ایک مخصوص آہٹ اور ایک مانوس خوشبو اس کے اردگرد سرسرانے لگی۔ آخری بار پھر یہ خواب ناک خوشبو ایک خوش کن خواب کا حصہ بن جاتی۔ جسے وہ صرف تصور کی آنکھ سے ہی محسوس کر سکتی تھی۔ وہ اس حصار میں خود کو ہمیشہ کے لیے مقید کر لینا چاہتی تھی۔

"ہیلو!" وہی بھاری مضبوط مردانہ آواز اس کے دائیں جانب سے ابھری تھی جس سے دور بھاگنے کی دانستہ و شعوری کوشش اسے شکستگی جیسا احساس دان کر گئی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر اپنی دائیں جانب دیکھا تھا۔ وہ ہلکی سی مسکراہٹ لیے اسے والہانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ جواباً" وہ نہ تو مسکرا سکی تھی اور نہ ہی اس کے ہیلو کا جواب دے پائی تھی۔

"کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟" شستہ انداز میں اجازت طلب کرتا بختاور کو وہ خود سے دور ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔ وہ بھی خاموشی سے اس کے سامنے آ بیٹھا۔ چند ساعتوں تک ان دونوں کے مابین خاموشی کا پردہ حائل رہا۔ معاً" اس خاموشی کو سلجوق عمر نے ہی توڑا۔

"میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے پسند نہیں کرتیں' شاید آپ کو میرا یہاں بیٹھنا بھی اچھا نہ لگ رہا ہو۔"

"ایسا نہیں ہے۔" بختاور نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے بمشکل تمام کہا۔ وہ تولنے والے انداز میں اس کی سمت دیکھ رہا تھا۔ کسی قدر توقف کے بعد ایک بار پھر سلجوق کی آواز اس کی سماعتوں کے ایوانوں میں گونجی تھی۔

"بختاور!" وہ بے حد نرم لہجے میں مخاطب تھا۔

"جب بن مانگے خواہشات اچانک پوری ہو جائیں' بنا ہاتھ اٹھائے دل کی امنگیں بر آئیں۔ تو پھر کیا

کرنا چاہیے۔" وہ خواب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا ایسے ہی احساسات اس کے دل میں بھی پنپ رہے تھے۔ اس نے بے اختیار اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں۔ یہ کوئی خواب نہ تھا جو آنکھیں کھلنے پر ٹوٹ جاتا' یہ وہ سچ تھا جسے دیکھنے اور سننے کی خواہش جسے اپنی دسترس میں لینے کی طلب اس کے تصورات کا جزلاینفک بن چکا تھا۔

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا مگر آج میں تم سے اپنی محبت پر تمہارا اعتبار مانگتا ہوں۔ کیا تم مجھے اپنا اعتبار دو گی؟" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ اسے اپنا چہرہ تاریک ہوتا محسوس ہوا تھا۔ اس لمحے سے مفر اتنا سہل تو نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو اندر سے ٹوٹتا محسوس کررہی تھی۔

"تمہارا ہر قدم پر مجھ سے ٹکرانا محض اتفاق تو نہیں ہوسکتا اور اگر یہ اتفاق ہے بھی تو میں اسے اپنے جذبوں کی سچائی ہی کہوں گا۔ اسی اتفاق نے مجھے محبت جیسی منزل پر لاکھڑا کیا ہے۔ کیا تم میری اس محبت کو قبول کرو گی۔ تم یقین کرو میں تمہیں بہت خوش رکھوں گا۔" بختاور کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ گومگو کی کیفیت میں اسے دیکھ رہی۔

"سلجوق عمر جس لڑکی کو پرپوز کرے گا وہ یقیناً اس دنیا کی مخلوق نہیں ہوگی۔ میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس لڑکی کو دیکھوں اس سے ملوں!" نادیہ نے ایک بار حسرت آمیز لہجے میں اس سے کہا تھا۔ سلجوق عمر نے اسے پرپوز کیا تھا۔ وہ کسی قسم کے تفخر میں مبتلا نہیں ہوئی تھی' اسے اپنے اوپر ناز نہیں ہوا تھا۔ سلجوق اپنی محبت کے اظہار کے لیے جو الفاظ استعمال کررہا تھا وہ خود نہیں' بلکہ اس نے اسے بولنے پر مجبور کیا تھا۔ اس نے بختاور سے محبت نہیں کی تھی' بلکہ بختاور نے اسے ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کی بے قراری اور بے خودی اس ڈرامے کی دین تھی' جو بختاور نے کیا تھا۔ وہ مزید اپنے آنسوؤں پر بند نہیں باندھ پائی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے اس کے گالوں پر بہنے لگے تھے۔

"تمہیں میرا یہ سب کہنا برا لگا ہے نا؟" وہ متفکر سا پوچھ رہا تھا اور وہ برابر نفی میں سرہلائے جارہی تھی۔

"پھر تم رو کیوں رہی ہو؟" اس کے انداز میں اپنا[illegible] تھا۔

"آئی ایم سوری!" وہ بھرائی ہوئی آواز سے کہہ رہی تھی۔

"سوری فار واٹ؟" وہ اب بھی متحیر تھا۔

"ان باتوں کے لیے' جنہیں سن کر آپ مجھ سے محبت کی بجائے نفرت کا اظہار کریں گے۔" وہ گلوگیر آواز سے کہہ رہی تھی۔

"لیکن... میں تم سے نفرت نہیں کرسکتا۔" اس کا لہجہ جذبوں کی شدت سے مخمور تھا۔

"آپ کریں گے۔" وہ پرزور لہجے میں بولی۔ سلجوق اسے نا سمجھنے والے انداز میں دیکھ رہا تھا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ لب کپکپا رہے تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے ایک گولا سا حلق میں اٹک گیا ہو۔ مگر آج اسے خاموش نہیں رہنا تھا۔ وہ گلوگیر لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"سلجوق عمر آفریدی پورا نام' عمر چوبیس سال' تین بہن بھائی' رہائش ڈیفنس میں' باڈی بلڈنگ کرنا اور ٹینس کھیلنا پسندیدہ مشغلہ' کھانے کے لیے پسندیدہ ریسٹورینٹ لا ثانیہ' دو دوست ہیں جن کے ساتھ اکثر لانگ ڈرائیو پر جاتا ہے۔ اسے رات کو گھر سے باہر جانا پسند نہیں ہے۔ وہ اپنے مخصوص دوستوں سے بھی مخصوص وقت میں ملتا ہے۔ اس کی کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ وہ آفس میں چھ گھنٹے گزارتا ہے اور آفس کے بعد اس کی زیادہ تر مصروفیات اپنے دوستوں کے ساتھ ہوتی ہیں۔" سلجوق بھنویں اچکاتے ہوئے اس کی اس قدر جامع معلومات کو تحیر سے سن رہا تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ ایک بار پھر گویا ہوئی تھی۔

"بعض لوگ سراب نما اس خواہش کی مانند ہوتے ہیں' جن کے پیچھے جتنا دوڑا جائے' وہ اتنا ہی آپ سے دور بھاگتے ہیں اور جن سے دور بھاگا جائے وہ سائے کی طرح آپ کا پیچھا کرتے ہیں۔

اس روز آرٹ گیلری میں' میں آپ سے جان بوجھ کر ٹکرائی تھی اور میں نے جان بوجھ کر آپ کو اگنور کیا تھا اور آپ نے مجھے شناسا نظروں سے دیکھا تھا۔ میں آپ کے سامنے آکر آپ سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی رہی اور آپ نے میرا سائے کی طرح پیچھا کیا۔ اس روز ٹینس کھیلنے کے بعد آپ نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر آپ کو نظرانداز کیا اور پھر سلجوق عمر نے مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ اس نے مجھے پرپوز کیا۔"

"یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہی ہو۔" درشتی سے کہتے ہوئے اس نے اپنے لب بھینچ لیے تھے ایسے جیسے کہ اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی سعی کررہا ہو۔

"سامنے گلاس وال کے دوسری طرف پنک ٹاپ میں آپ اس لڑکی کو دیکھ رہے ہیں۔" سلجوق عمر نے نا سمجھنے والے انداز میں اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا۔

"اس لڑکی نے دعوا کیا تھا کہ آپ کسی سے محبت نہیں کرسکتے اور......"

"اور یہ کہ تم نے اسے ایک چیلنج سمجھ کر مجھ پر ایک ریسرچ شروع کردی۔ تم نے اس سے کتنے روپوں کے عوض شرط لگائی تھی۔" وہ اپنی جیب سے چیک بک نکالتے ہوئے ترشی سے گویا ہوا بختاور گنگ سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم جیسی لڑکیاں محبت ڈیزرو نہیں کرتیں' ان فیکٹ مجھے تم پر غصہ نہیں آرہا اور نہ ہی مجھے تم سے نفرت ہو رہی ہے۔ اگر نفرت سے بھی کوئی بڑا لفظ ہوتا وہ بھی اس احساس کے سامنے ہیچ ہوتا جو اس وقت میں اپنے دل میں تمہارے لیے محسوس کررہا ہوں۔ اینی ویز کانگریچولیشن! آپ اپنی شرط جیت چکی ہیں۔ میری طرف سے اس لڑکی کو ضرور کہیے گا کہ سلجوق عمر آفریدی بھی اسی دنیا کی مخلوق ہے۔ اسی دنیا کے دوسروں لڑکوں کی طرح اس کے محسوسات ہیں۔ محبت کرنے کے لیے اسے کسی خاص لڑکی کی چاہت کبھی نہیں رہی اور اگر کبھی رہی تھی تو آج وہ ختم ہوگئی۔"

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"ویسے آئم سوری! میں آپ کا یہ ڈراپ سین نامکمل چھوڑ کر جا رہا ہوں۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کی آنکھوں میں دھند اتر آئی تھی۔ چند ساعت بعد سارہ اور نادیہ اس کے قریب آگئیں۔

"You have done very good job"

نادیہ نے اسے سراہا تھا۔ اس پر کیا قیامت بیتی تھی وہ دونوں اس سے بے خبر تھیں۔ وہ بلینک چیک جو وہ جاتے ہوئے اسے تھما گیا تھا' جوں کا توں اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ اتنی کم مایا محبت تو نہیں تھی اس کی۔

سارہ اور نادیہ کا اطمینان قابل دید تھا۔ نادیہ کی خواہش پوری ہوچکی تھی وہ ایک بار مائرہ کو شکست یاب دیکھنا چاہتی تھی اور اس نے دیکھ لیا تھا۔ کل یونیورسٹی میں مائرہ بھی سب کے سامنے اپنی ہار تسلیم کرلیتی مگر جو شکست اس وقت اس کا مقدر ٹھہری تھی کیا اس سے بھی بری شکست ہوسکتی تھی؟ وہ دونوں اپنی اپنی تسکین آمیز دنیا میں مگن تھیں ان دونوں نے اس کے درماندہ وجود پر ایک نظر بھی ڈالنا گوارا نہیں کیا تھا۔

"مگر نفرت سے بھی کوئی بڑا لفظ ہوتا وہ بھی اس احساس کے سامنے ہیچ ہوتا جو اس وقت میں اپنے دل میں تمہارے لیے محسوس کررہا ہوں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگا' مگر آج میں تم سے اپنی محبت پر تمہارا اعتبار مانگتا ہوں۔" مزید ضبط کرنا اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ گھر میں آکر وہ کئی گھنٹوں تک اپنے کمرے میں بند ہوکر روتی رہی تھی۔ یہاں کوئی بھی اس کے آنسوؤں کی بابت دریافت کرنے والا نہ تھا۔ چاروں اور ایک سناٹا تھا اور اس سناٹے میں گونجتی اس کی سسکیاں تھیں۔ اسے اپنے اعصاب جھنجھناتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

(تیسرا حصہ آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

۳
تیسرا حصہ

مجھے اپنے اعصاب جھنجھناتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ میں جتنا اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اتنا ہی میری ہر کوشش کو ناکام بنانے پر تلا ہوا تھا۔ گو کہ معیز کی آمد میرے لیے قطعی طور پر غیر متوقع اور اچانک تھی لیکن لاشعوری طور پر میں اس کی اس آمد کی منتظر بھی تھی۔ میں دم بخود سا ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

میں ارتضٰی کو دیکھنے عادتاً پارکنگ لاٹ میں آئی تھی اور ہمیشہ کی طرح ارتضٰی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ میں تھوڑی دیر رک کر ارتضٰی کا انتظار کرنے کی عادی

انداز غیر معمولی محسوس ہوا تھا۔ پوری رات میں نے پھوپھو کی الجھن آمیز گفتگو کو سلجھاتے ہوئے گزاری تھی۔ اگلے روز چونکہ یونیورسٹی سے آف تھا اس لیے میں کافی دیر تک سوتی رہی۔ ناشتا کرنے کی غرض سے جب میں نیچے آئی تو اسٹڈی سے اخبار اٹھانے کی غرض سے اس جانب آئی تو مما کی آواز نے مجھے اندر جانے سے باز رکھا۔

"کل آپی آئی تھیں۔" وہ شاید پاپا کو مطلع کر رہی تھیں۔

"جانتا ہوں، کل انہوں نے فون کیا تھا مجھے آفس

لُبنیٰ راتا

تھی، حالانکہ آج اپنی دانست میں، میں قدرے تاخیر سے پہنچی تھی اور گمان غالب یہی تھا کہ ارتضٰی میرا انتظار کر رہا ہو گا مگر ارتضٰی کی جگہ معیز کو اپنا منتظر پا کر مجھے اپنے اعصاب منتشر ہوتے محسوس ہوئے تھے۔

گزشتہ ایک ہفتے سے میں معیز کو نظرانداز کرنے کی شعوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ گھر پر آتا تو میں اپنے آپ کو اپنے کمرے تک محدود کر لیتی، فون کرتا تو اپنے ایگزام کی مصروفیت کا بہانہ بنا دیتی۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے مجھے خود بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا مگر میں ایسا کرنے پر مجبور تھی۔

اس روز پھوپھو کے جانے کے بعد میں کافی دیر تک ڈسٹرب رہی تھی، نجانے کیوں مجھے اس بار پھوپھو کا

میں۔" پاپا نے سرسری انداز میں کہا۔

"آپ سے انہوں نے کیا کہا؟" مما نے متجسس لہجہ میں دریافت کیا۔

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" پاپا نے کڑوے انداز میں کہا۔

"وہ دراصل کل جب وہ آئی تھیں تو بہت غصے میں تھیں اور پھر کچھ بتا کے چلی بھی گئیں، میں اس لیے پوچھ رہی تھی، کوئی پرابلم تو نہیں۔" ان کا انداز بے ربط ضرور تھا مگر ان کے لہجے کی مضبوطی نے مجھے گونا گوں تقویت کا احساس دیا تھا۔

"ہوں! وہ معیز کی وجہ سے پریشان تھیں۔"

"معیز کی وجہ سے؟" میرے لبوں نے متحیر سی

جنبش کی۔
"وہ قرۃ العین سے شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ ایسا نہیں چاہتیں۔" مجھے اپنا دل گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اور کر دیجیے انہیں کم ہونی تھی۔
"آپ نے انہیں کیا جواب دیا۔" مما کی مدھم آواز میرے اندر کے سناٹوں میں کسی بازگشت کی طرح گونجی تھی۔
"میں نے کیا جواب دینا تھا، ظاہر ہے انہیں تسلی دی کہ میں معیز کو سمجھاؤں گا۔"
"لیکن معیز بچہ تو نہیں ہے۔ اس نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی فیصلہ کیا ہوگا۔" مجھے لگا جیسے مما میری اس کیفیت سے بے خبر نہیں۔ ایک نادیدہ سی طمانیت مجھے اپنے اندر باہر رقص کرتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"میں جانتا ہوں کہ تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو۔ تم یقیناً اندر سے اس رشتے کی خواہش مند ہو۔" پاپا کا خشونت بھرا لہجہ اب بھی اکھڑا ہوا تھا۔
"اس میں برائی بھی کیا ہے۔ وہ دونوں بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں، ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں، اگر یہ ان دونوں کی خواہش ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔"
"اس میں برائی ہے اور وہ یہ کہ میں ایسا نہیں چاہتا۔ قرۃ العین کی شادی کسی بھی صورت معیز سے نہیں ہو سکتی۔ میں ہونے ہی نہیں دوں گا۔" ان کے لہجے کی سفاکی میں باہر سے بھی محسوس کر سکتی تھی۔
اپنے کمرے میں آکر میں کتنی ہی دیر تک روتی رہی۔ اب مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ مما نے مزید کیا کہا ہوگا۔ جو کچھ میں سننا نہیں چاہتی تھی یا پھر جو خیال میرے تصور کے کسی دور افتادہ گوشے میں بھی موجود نہ تھا وہ میں سن چکی تھی اور اب سننے کو کچھ بھی نہیں تھا۔
ایک بار پھر مجھے اپنی خواہش کو پاپا پر قربان کرنا تھا۔ اگلے روز جب معیز نے مجھے فون کیا تو میں نجانے کس احساس کے زیر اثر اس کے ہر سوال کا جواب اور اس کے ہر استفسار کے جواب میں ہوں ہاں کرتی رہی۔ شاید اسی چیز نے معیز کو چونکنے پر مجبور کر دیا تھا اس روز وہ مجھ سے ملنے آیا تھا اور میں طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس کے سامنے آنے سے بچ گئی تھی۔
ایک ہفتے تک مسلسل میں اپنے اس رویے کو برقرار رکھے ہوئے تھی مگر آج معیز نے میرے فرار کے تمام راستے بند کر دیے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے پارکنگ لاٹ میں کھڑا یقینی طور پر میرا منتظر تھا۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے سے قصداً گریز کیا تھا۔
"بیٹھ جاؤ۔" بغیر کسی دعا سلام کے اس نے تحکمیہ انداز میں مجھے مخاطب کیا۔ میں ایک معمول کی طرح اس کا حکم بجا لائی۔ فرنٹ ڈور بند کرنے کے بعد وہ ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا تھا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس نے ایک اچٹتی سی نظر مجھ پر ڈالی۔
"کیسی ہو؟" اس کا لہجہ ابھی بھی سپاٹ تھا۔
"ٹھیک ہوں!" مختصراً کہتے ہوئے میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔
"تم یقیناً مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو رہی ہو گی اور میرا خیال ہے تمہیں حیران نہیں ہونا چاہیے کیونکہ پچھلے ایک ہفتے سے میں حیران ہونے کا کام کر رہا ہوں۔" میں چونک کر اسے دیکھنے لگی تھی۔
حیران تو میں واقعی ہوئی تھی مگر میری حیرانگی کے ساتھ ایک مسلسل اضطراب اور ایک کرب نے میرا احاطہ کیا ہوا تھا۔ میں کبھی بھی اس شخص سے کچھ نہیں چھپا سکتی تھی۔ گزشتہ ایک ہفتے سے میں معیز کو نہیں بلکہ خود کو سزا دے رہی تھی۔ اس محبت سے دستبرداری کی سزا جس کا اظہار بھی فی الوقت ہم دونوں کے مابین نہیں ہوا تھا۔ مگر اب میرے لیے معیز کی موجودگی اس کی عدم موجودگی سے زیادہ تکلیف دہ بن گئی تھی۔ اب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ارادہ باندھنا اور اس پر عمل کرنا دو متضاد عمل تھے۔
"بائی دا وے بینی! تم مجھے کون سا سرپرائز دینا چاہتی ہو؟" میں اب بھی خاموش تھی۔ معاً وہ ایک تلخ سی ہنسی ہنسا تھا۔
"تمہیں نہیں لگتا کہ میں کوئی الو کا پٹھا ہوں جسے تم

مسلسل اگنور کر رہی ہو۔ میں تمہارے لیے پریشان ہوں' تمہیں اس کی پروا نہیں ہے۔ میں پاگلوں کی طرح تمہارے پیچھے چکر پھیریاں کھا رہا ہوں اور تم کسی مغرور حسینہ کی طرح پتا نہیں کس زعم میں مبتلا مجھے خاطر میں نہیں لا رہیں۔ تمہارے ساتھ جو مسائل ہیں' تم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔ اس طرح نظر انداز کرنے کا کیا جواز ہے۔" وہ لب بھینچے اپنے غصے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہے معیز! تم غلط سمجھ رہے ہو۔" اس کے الفاظ کی درشتی نے میرے لہو کو جیسے منجمد کیا ہوا تھا اور اب خود اپنے لب کی بناوٹ پر مجھے غصہ آرہا تھا۔

"ایسا ہی ہے مائی ڈیئر!" اس نے پرزور انداز میں تردید کی تھی۔

"اب بھی تمہارے چہرے سے صاف ظاہر ہے کہ تمہیں میری آمد اور میری جواب طلبی ناگوار گزر رہی ہے۔ بہت سی باتیں کہی نہیں جاتیں' انہیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ پچھلے سات روز سے تم میرے ساتھ کیا کر رہی ہو اور کیا کرنا چاہ رہی ہو' یہ تو میں نہیں جانتا' البتہ ایک بات میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم اس بات سے آگاہ ہو چکی ہو جسے میں برسوں سے چھپاتا آرہا ہوں' اور ایسا میں نے صرف اس لیے کیا کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا کہ تمہاری اسٹڈی ڈسٹرب ہو۔ میں صرف تمہیں سوچنے کے لیے وقت دینا چاہتا تھا۔ تمہارے اس ردعمل کے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ میں اگر تمہیں پسند نہیں ہوں' یا تمہیں لگتا ہے کہ میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اترتا' یا تمہیں مجھ میں جو خامیاں نظر آتی ہیں' تم اس بارے میں مجھ سے ڈسکس کر سکتی ہو۔ مجھ سے چھپتی کیوں پھر رہی ہو؟" وہ بہت گہری نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا اور پھر ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر مجھ سے مخاطب ہوا تھا۔

"محبت کرنا یا محبت کا اظہار کرنا کوئی قابل گرفت فعل تو نہیں اور میرے ایسا کرنے سے پہلے ہی تم نے مجھ پر فرد جرم عائد کر دی ہے۔"

کیا میری زندگی میں اس سے برا بھی کوئی لمحہ آسکتا تھا۔ جس لمحہ کا میں نے انتظار کیا آج اسی لمحے سے میں نظریں چرا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں بے بسی اتر آئی تھی۔ اب مجھے اردگرد کا سارا منظر گھومتا ہوا لگنے لگا تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں۔" وہ گہری نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں اب بھی خاموش تھی۔ اپنی خاموشی میں چھپا انکار میں اپنی دانست میں اس تک ارسال کر چکی تھی مگر مقابل معیز تھا جس کے سامنے انکار کرنے کا مطلب تھا ایک لمبی اور وسیع بحث کو دعوت دینا۔ وہ میری خاموشی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اب بھی استفہامیہ نظروں سے میری جانب دیکھ رہا تھا انداز سے صاف ظاہر تھا کہ آج وہ کسی بھی صورت جواب لیے بغیر ٹلنے والا نہیں۔ تب میں نے اپنے آپ کو مضبوط کر کے جواب دینے کی ٹھانی۔

"معیز میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔" کو تو میرے اس جواب سے کسی بھی مباحثہ کی گنجائش

نہیں نکلی تھی۔

"کیوں؟" معیز کی سرد آواز نے بحث کے لیے موزوں لفظ کا انتخاب کیا تھا۔ میں خاموش رہی۔

"تم مجھ سے شادی کرنا نہیں چاہتیں کیوں؟" اس نے ایک بار پھر سرد انداز میں اپنا سوال دہرایا۔

"بعض سوال لاجواب ہوتے ہیں' تمہارے بھی اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔" میں پر اعتماد لہجے میں بولی۔

"ہر سوال کا جواب ہوتا ہے' ہمارے ہر عمل کے پس منظر میں اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔" وہ مدلل انداز میں گویا ہوا۔

"میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔" میرا خود ساختہ اعتماد شکستہ ہونے لگا۔

"تمہیں مجھے بتانا پڑے گا۔ آخر مجھے پتا چلنا چاہیے کہ مجھے ریجیکٹ کرنے کے عقب میں کیا وجہ ہو سکتی ہے' بلکہ کیا مقصد ہو سکتا ہے۔"

"کیونکہ میں تم سے شادی کرنا نہیں چاہتی۔"

"کیوں؟"

"میں تمہیں پسند نہیں کرتی۔"

"کیوں؟"

"کیونکہ تم ایک خود پسند شخص ہو' تمہیں اپنے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ تمہیں دوسروں کے احساسات سے زیادہ اپنے احساسات کی پروا رہتی ہے۔ تم ایک حاکم سوچ کے مالک ہو۔ مجھے تمہاری کوئی عادت پسند نہیں پھر میں کیوں تمہارے ساتھ شادی کروں۔ میری بھی کوئی مرضی ہے' پسند ہے۔ تمہاری خود پسندی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ تم مجھ سے حساب مانگ رہے ہو اور میں کیوں رہوں بدلے میں تمہاری مرضی پر تو زندگی نہیں گزار رہی۔ یہ میری زندگی ہے اور اس سے وابستہ ہر فیصلہ مجھے خود کرنا ہے۔ مجھے کسی دوسرے شخص کے سامنے دلائل نہیں دینے۔"

میں کیا کہہ رہی تھی اور کیا کہنا چاہتی تھی میں اس وقت تو بس میں صرف معیز کو خود سے بدظن کرنا چاہتی تھی۔ میں پھپھو اور بابا کی تلخ کلامی مزید سننا نہیں چاہتی تھی۔

"دوسرا شخص' خود پسند!" زیر لب دہراتے ہوئے وہ متحیر سا تھا۔

"میں تمہارے اس تجزیے کو قبول نہیں کر پا رہا۔ اپنے انکار کی ٹھوس وجہ دینے کو کہا تھا میں نے' یہ نہیں کہا تھا کہ تم میری محبت کا مذاق اڑاؤ۔ تم اتنی ناسمجھ تو نہیں ہو کہ میری محبت کو نہ محسوس کر سکو۔"

میرے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ چکے تھے۔ اپنے ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی جب کہ دوسری طرف اب بھی وہ صدمے کی سی کیفیت میں تھا۔

"پچھلے دس سال سے میں نے اپنے لیے سوچا لیکن لاشعوری طور پر تمہارا خیال ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔ کب میرا لاشعور میرے شعور پر حاوی ہو گیا مجھے خبر ہی نہ ہو سکی۔ پچھلے دس سال سے تمہاری خوشی کی خاطر' تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی خاطر میں تمہارا خیال رکھتا رہا اور آج تم مجھے کہہ رہی ہو کہ میں خود پسند ہوں۔ میں نے تم سے وابستہ محبت کو اپنے دل میں چھپا کر رکھا تم اسے تو خود پسندی کہہ سکتی ہو مگر میری اس محبت کی نفی نہیں کر سکتیں۔" میری سسکیاں اب گاڑی کے سرد ماحول میں گونجنے لگی تھیں۔

"جی بھر کر رو لو' جس دباؤ اور ذہنی کرب سے اس وقت میں گزر رہا ہوں' میں نہیں چاہتا کہ تم اس سے گزرو' اپنی ماں کو اور انکل کو مجھے کیسے منانا ہے یہ کام تم صرف مجھ پر چھوڑ دو۔ کسی کی انا کی خاطر ہماری محبت کو قربان مت کرو۔ تم صرف اپنی اسٹڈی کی جانب دھیان دو۔" وہ ملامت آمیز انداز میں میرا سر تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ وہ سب جانتا تھا اور میں اس سے سب کچھ چھپانے کی سعی کر رہی تھی۔

بہت سا رونے کے بعد جب میں نے سر اٹھایا تو وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا مگر اب اس کے چہرے پر سنجیدگی کا کوئی تاثر نہ تھا' بلکہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے اس

کے تمام چہرے کا احاطہ کیا ہوا تھا۔

"ویسے تو میں تم سے ہر قسم کی بے وقوفانہ حرکت کی توقع کرتا ہی رہتا ہوں لیکن نجانے کیوں میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ تم حماقت کے میدان میں اتنی آگے نکل جاؤ گی اور اب میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں کہ میں تمہیں اپنے ہر ارادے سے باخبر کر دوں۔" میں نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا تھا۔

○ ○ ○

اس نے بے ساختہ چونک کر اسے دیکھا تھا۔ مگر بختاور کی تحیر آمیز نظروں کے برعکس وہ مسلسل سامنے دیکھ رہا تھا ایسے جیسے اس نے بختاور کو دیکھا ہی نہ ہو۔ اس کی نگاہوں کا مرکز پروجیکٹر اسکرین تھا جہاں پر مارکیٹنگ کے حوالے سے پاکستان کی اکنامکس ویلیوز کو گراف کے ذریعے واضح کیا جا رہا تھا۔ اس کا دل وحشت سے بھر گیا تھا Fecilitatore کی آواز اب وہ عدم توجہی سے سن رہی تھی۔ اپنے قریب سلجوق عمر کی موجودگی اس کا جذباتی استحصال کر رہی تھی۔ اس کا ذہن اس نفسیاتی کشمکش سے پراگندہ ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں یہاں بیٹھے رہنا اور Fecilitatore کے ساتھ اپنے خیالات کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش بے سود تھی۔

انٹرنیشنل بزنس منیجمنٹ نے ملکی سطح پر اکنامیکل پروگریس کے حوالے سے ورکشاپ کا انعقاد کیا تھا جس میں کراچی کے معروف اساتذہ اور اسٹوڈنٹس نے بھی شرکت کی تھی۔ تین روزہ ورکشاپ کا یہ آخری دن تھا چونکہ اس ورکشاپ میں شرکت آپشنل تھی لہٰذا سارہ اور نادیہ نے اس ورکشاپ کو اٹینڈ کرنے کے حوالے سے کسی قسم کی دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"یار! میں نے تو آئی بی اے میں ایڈمیشن لے کر غلطی کی ہے۔ مجال ہے جو اس پورے سال میں کوئی فنکشن ہوا ہو ہاں البتہ سیمینار اور ورکشاپ ان کا تو کوئی حساب کتاب نہیں بن بادل برسات کے کبھی بھی برسنے لگتے ہیں۔ میرا تو فی الحال چار گھنٹے مسلسل بیٹھ کر

اپنی نظریں خراب کروانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" نادیہ نے سیدھا سپاٹ جواب دیا تھا۔

اس روز سلجوق عمر سے آخری ملاقات کے بعد اس کا بھی ہر چیز سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی تک سے وہ نظریں چرانے لگی تھی۔ سلجوق عمر کے لہجے کی سرد مہری اور سفاکی ابھی تک اس کی سماعتوں میں محفوظ تھی۔ نادیہ کے ساتھ ساتھ وہ جیسے خود سے بھی خائف ہو گئی تھی۔ اس کی اس بے زاری کو دادو نے بھی محسوس کیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ اتنی آدم بے زار کیوں ہوتی جا رہی ہو؟ جب دیکھو اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہو۔ دو دن سے یونیورسٹی بھی نہیں جا رہیں۔ خیریت تو ہے؟" وہ تعجب سے کہہ رہی تھیں۔

"کچھ نہیں دادو بس میرا پڑھنے کو دل نہیں کرتا!" بے زاری اب بھی اس کے لہجے سے ہویدا تھی۔

"پڑھنے کو دل بھی کیسے کرے گا۔ سارا دن تو اپنے کمرے میں قید رہتی ہو۔ دل تو بے زار ہونا ہی ہے نہ تمہیں آتی ہو نہ جاتی ہو۔ اچھا بھلا نادیہ اور سارہ کے ساتھ کہیں نہ کہیں چلی جایا کرتی تھیں اور اب تو تم انہیں بھی منع کر دیتی ہو۔ میں کہے دے رہی ہوں آج تم میرے ساتھ ہر صورت میں نرگس کی بیٹی کی شادی میں جا رہی ہو۔"

"لیکن دادو!" احتجاجی انداز میں اس نے کوئی بہانہ بنانے کی سعی کی تھی مگر دادو نے اس کی ایک نہیں سنی تھی۔ وہ اسے زبردستی اس نمائشی فنکشن میں لے ہی آئیں۔ کچھ دیر تک وہ خاموشی سے رنگ برنگ ملبوسات میں ملبوس خواتین کو دیکھتی رہی تھی پھر دادو کو بلانے کی خاطر وہ اسٹیج تک آئی تھی مگر اسٹیج کے قریب کھڑے سلجوق عمر پر نظر پڑتے ہی اس کا چہرہ فق ہو گیا تھا۔ سلجوق عمر اپنے دوستوں کے ساتھ کھڑا اسے دیکھ چکا تھا۔ اس نے اپنے لب ایسے بھینچ لیے تھے جیسے بختاور کی یہاں آمد اسے ناگوار گزری ہو۔ دل پر ایک بوجھ لیے وہ دادو کے پاس آ گئی تھی۔ اس شخص کی نفرت وہ برداشت نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی نظروں سے

نکلتے تنفر کے شرارے جیسے اس کے تمام وجود کو جلا رہے تھے۔

"دادو گھر چلیں۔" وہ اپنی کسی جاننے والی کے ساتھ گفتگو میں مصروف تھیں جب اس نے انہیں مخاطب کیا تھا۔

"ہاں تھوڑی دیر تک چلتے ہیں۔" اتنے ہنگامے میں وہ شاید اس کی آنکھوں کی نمی اور بھرائی ہوئی آواز کی جانب متوجہ نہیں ہوئی تھیں۔

"اگر آپ کچھ دیر رکنا چاہ رہی ہیں تو میں چلی جاتی ہوں۔" اس کے اس قطعی لہجے پر دادو نے اسے چونک کر دیکھا تھا کہ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ چہرے کے بھی غیر معمولی تاثر نے انہیں تشویش کا احساس دلایا تھا۔ راستے میں کئی بار دادو نے معاملے کی نوعیت جاننے کی سعی کی تھی اور وہ اپنی طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنا کر باہر جھانکنے لگی۔

اچھی بھلی زندگی گزر رہی تھی یہ کیسا عذاب مول لیا تھا نہ تو دل اپنے اختیار میں تھا اور نہ آنسوؤں پر اختیار۔ اگلے روز دادو نے زبردستی اسے ورکشاپ اٹینڈ کرنے کے لیے تیار کیا تھا اور اب یہاں سلجوق عمر کو اپنے اس قدر قریب دیکھ کر اس کا ضبط جواب دینے لگا تھا۔ کوشش کے باوجود اپنی توجہ اہم نکات پر مرکوز نہیں کر پا رہی تھی۔ بار بار اس کی آنکھوں میں دھند اتر رہی تھی۔ بے وقوفوں کی طرح یہاں بیٹھ کر رونے کا کوئی فائدہ نہ تھا اس شخص کی نظر میں اس کے آنسوؤں کی کوئی ویلیو نہ تھی۔ لیکن آنسوؤں کو وہ اسے دکھانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اسے یہاں نہیں بیٹھنا تھا۔

وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر آگے بڑھنے کے لیے وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکی تھی۔ اس نے ہونق ہوتے دماغ کے ساتھ سلجوق عمر کو دیکھا جس کی نظریں ابھی بھی پروجیکٹر اسکرین پر مرکوز تھیں۔ سلجوق عمر کے چہرے سے نظریں ہٹا کر اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ اپنے ہاتھ کو سلجوق عمر کی گرفت میں محسوس کر کے وہ متضاد کیفیات میں گھر گئی۔ چند ساعت تک وہ اتنے سے اسے دیکھتی رہی تھی مگر ایک بار بھی سلجوق نے اسے نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔

"پلیز مس! سٹ ڈاؤن دی آرکیٹکٹ از سرب ٹو واچ۔" عقبی سیٹ سے کسی نے اسے بیٹھنے کو کہا تھا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک بار پھر بیٹھ گئی تھی۔ اس کی کلائی ہنوز سلجوق عمر کی مضبوط گرفت میں مقید تھی۔ مسلسل ہاتھ چھڑانے کی مزاحمت اب دم توڑ چکی تھی۔ آنسوؤں نے اپنا راستہ دیکھ لیا تھا۔ وہ اس کی تکلیف سے بے نیاز اہم اہم پوائنٹ اپنے سامنے رکھے پیڈ پر نوٹ کر رہا تھا۔ چند منٹوں بعد لائٹ بریک کا سگنل آن کر دیا گیا تھا۔ ہال میں اچانک روشنیاں اتر آئیں اردگرد سے اسٹوڈنٹس کے اٹھنے کی خفیف سی آوازیں اسے سنائی دے رہی تھیں اور وہ کسی کو بھی سر اٹھا کر دیکھنے کی ہمت خود میں نہیں پا رہی تھی تمام آوازیں بتدریج آہستہ ہوتی معدوم ہو گئیں۔

"پلیز میرا ہاتھ چھوڑیں۔ مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔" وہ روندھے ہوئے لہجے میں بولی۔ اور اس نے ایک دم اس کا ہاتھ اپنی سخت گرفت سے آزاد کر دیا۔

"نام بختاور علی، عمر بائیس سال، چار بہن بھائی۔ رہائش ڈیفنس فیز ٹو۔ دو دوستیں ہیں، جن کے بغیر وہ کہیں نہیں جاتی اور جن کے ساتھ مل کر وہ لڑکوں کو فلرٹ کرتی ہے کیونکہ یہ اس کا دل پسند مشغلہ ہے۔"

"ایکسکیوز می! میں نے کبھی کسی کو فلرٹ نہیں کیا۔" اس کی آواز ابھی بھی بھرائی ہوئی تھی۔

"تو پھر! جو کچھ تم نے میرے ساتھ کیا وہ کیا تھا۔" وہ بہت سنجیدگی سے دریافت کر رہا تھا۔

"وہ۔" اس کے اعصاب بوکھلاہٹ آمیز جھٹکے سے منتشر ہو گئے تھے۔ وہ سرد نگاہوں سے اس کی جانب متوجہ تھا اور بختاور کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا وہ اسے ایک غلط لڑکی سمجھ رہا تھا اور وہ خاموش تھی۔

"آپ کو مجھ سے یہ سب پوچھنے کا کوئی حق نہیں اور وہ بھی تب جب آپ میرے لیے شدید نفرت کا احساس رکھتے ہوں۔"

"نہیں رکھتا۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے وہ قدرے بے بسی سے گویا ہوا تھا۔

"سلجوق عمر کچھ بھی کر سکتا ہے مگر بختاور علی سے نفرت نہیں کر سکتا۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں خود کو تم سے نفرت کرنے پر مجبور کرتا رہا مگر میں نہیں کر پایا۔ میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ میں تمہیں تکلیف نہیں دے سکتا۔ محبت شاید اسے ہی کہتے ہیں۔" اس کے لہجے کی ٹوٹ پھوٹ وہ اسے دیکھے بغیر بھی محسوس کر سکتی تھی۔

"آئی ایم سوری بختاور!" چند لمحوں کے توقف کے بعد معذرت کرتا لہجہ اس کی سماعتوں سے ٹکرایا۔ مگر وہ یونہی سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔

"آئی ایم سوری۔"

"سوری فار وات؟" وہ مضمحل انداز میں استفسار کر رہی تھی۔

"انہیں نے تمہیں اتنا رلایا۔" اس نے جواز دیا۔ مگر اس کے بہتے آنسوؤں میں کمی نہیں آئی تھی۔

"آئی ایم سوری۔"

"اب کس لیے؟"

"میری وجہ سے تمہارا ہاتھ فریکچر ہوا اور تم اتنے دن تکلیف میں رہیں۔"

"تکلیف تو تم نے مجھے ابھی بھی دی تھی۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم نے میرا یہ ہاتھ اتنی زور سے پکڑا تھا۔" وہ ایک دم مسکرا دیا تھا۔

"اس کے لیے میں سوری نہیں کروں گا۔ تھوڑی بہت سزا تو تمہیں ملنی ہی چاہیے۔" وہ اب ہنس رہا تھا اور بختاور کو ہر چیز خوب صورت اور روشن دکھائی دینے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼
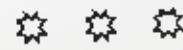
مجھے ہر چیز خوب صورت اور روشن دکھائی دے رہی تھی اور یہ سب اپنی ذات پر اعتماد کی بحالی کے سبب تھا اور یہ اعتماد مجھے معیز نے دیا تھا۔ اس روز جب معیز مجھ سے ملنے یونیورسٹی آیا تھا جب میں جذباتیت کے اعتبار سے شکستگی کی انتہا پر تھی اور پھر معیز کے اظہار محبت نے جیسے میرے سلگتے احساسات پر شبنم کی برسات کر دی تھی۔ میرے اندر باہر شادیانے بجنے لگے تھے۔

اس نے میرا ہاتھ تھام کر اپنے جذبوں سے مجھے آشنا کیا۔ مجھے ایسا لگا تھا جیسے میں نے ایک نئی دنیا میں قدم رکھ دیا ہو ایسی دنیا جہاں فقط میرے لیے خوشیاں تھیں 'نسوانیت کے غرور نے مجھے کسی بلند مقام پر پہنچا دیا تھا۔ پہلی بار میں اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور ہوئی تھی 'اپنی خواہشات کے بارے میں 'اپنی تمناؤں کے بارے میں 'اپنی خوشیوں کے بارے میں 'اپنے مستقبل کے بارے میں 'جہاں صرف میرے لیے تقویت آمیز لمحات ہوں گے 'بے یقینی اور شکوک 'اوہام کا نام و نشان نہ ہو گے۔

"مجھے تمہارے علاوہ کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔ نہ ممی کے اعتراضات کی اور نہ ہی تمہارے بابا کی دلیلوں کی۔ مجھے صرف تمہاری ہاں درکار ہے۔" میں نے اقرار کر لیا تھا 'مجھے لگا جیسے میں اسی لمحے کے انتظار میں تھی۔

"میں جانتا ہوں ممی کو منانا اتنا آسان نہیں ہے 'جتنا میں اور تم سوچ سکتے ہیں۔"

"تو تم کیا کرو گے؟" میں نے سرسراتے لہجے میں دریافت کیا۔

"کچھ نہیں!" یکدم اس نے اپنا انداز تبدیل کر لیا۔ "بس تم اپنے آپ کو پریشان کرنے کی کوشش مت کرنا 'تمہارے ایگزام ہونے والے ہیں اور تمہیں ہے۔" وہ مزید کچھ کہتا میں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میں پریشان رہوں گی معیز!" وہ ایک دم مسکرا دیا 'پھر ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

"مجھے لگتا ہے یعنی کہ ہمیں کورٹ میرج کرنا پڑے گی۔" میں نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ مجھے قائل کرنے کے انداز میں ایک بار پھر گویا ہوا تھا۔

"ممی کو میں جانتا ہوں ان کا راضی ہونا ناممکن نہ سہی مگر مشکل ضرور ہے اور انکل جیسے کل مجھے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے رضا مند ہونے کے چانسز بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن بہرحال یہ ایک آخری اور انتہائی فیصلہ ہوگا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ یہ سب بتانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم ذہنی طور پر کسی بھی انہونی کے لیے تیار رہو۔ تم اپنے تمام خدشات بس میرے حوالے کر دو۔" وہ اطمینان سے بولا اور پھر میں نے اپنے تمام خدشات اور وسوسے معیذ کی محبت اور یقین کے بھروسے طاق پر رکھ دیے تھے اس یقین کے ساتھ کہ اب میں کوئی قربانی نہیں دوں گی۔

اگلے روز یونیورسٹی سے واپسی پر ڈرائنگ روم سے ابھرتی آوازوں کو سن کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ نجانے کیوں مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ پھپھو اتنی جلدی دوبارہ یہاں کا چکر لگا سکتی ہیں۔ ڈرائنگ روم سے ابھرتی چند آوازیں میرے لیے یکسر اجنبیت لیے ہوئی تھیں۔ میں ان آوازوں کو پہلی بار سن رہی تھی اور پہلی بار ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ پھپھو کی آواز میں سابقہ ترشی اور طمطراق عنقا تھی۔ ان کے لہجے کا مصنوعی خوشگوار، خوش گفتار انداز مجھے بری طرح کھلا تھا۔ میں چند ساعتوں تک اپنے اندر جانے یا نہ جانے کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر کچھ توقف کے بعد میں اپنے کمرے کی اور بڑھ گئی۔

اپنے کمرے میں آکر میں نئے سرے سے پھپھو کی آمد کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتی رہی۔ ابھی مجھے اپنے کمرے میں آئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی جب ہلکی سی دستک کے بعد ملازمہ اندر آگئی تھی۔

"آپ کو بڑے صاحب اندر بلا رہے ہیں۔" وہ مؤدب انداز میں کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ میں متعجب سی تھی۔ پاپا نے مجھے کبھی اپنے مہمانوں کے سامنے ایسے نہیں بلایا تھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے میں نے مدھم لہجے میں جھوٹی سلام جھاڑا۔ پھپھو کے ساتھ بیٹھی اس خوش شکل اور باوضع خاتون نے میرے سلام کا جواب بلند آواز میں دیا تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی مما کے پاس صوفے پر ٹک گئی۔ میں اب اپنی یہاں آمد کے سلسلے میں تذبذب کا شکار تھی۔

"کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟" خاتون نے بڑے رسان سے مجھ سے پوچھا۔ ان کے قریب بیٹھا ہوا ادھیڑ عمر شخص بھی مسکراتے ہوئے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

"قرۃ العین!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں اب بھی نا سمجھنے والے انداز میں اس کمرے میں موجود نفوس کو دیکھ رہی تھی۔ مگر ان کے چہروں سے کچھ بھی اخذ کرنا میرے لیے دشوار ترین ہوتا جا رہا تھا۔

نام دریافت کرنے کے بعد بھی وہ خاتون چپ نہیں ہوئی تھیں، بلکہ ان کے سوالات ایک کے بعد ایک آ رہے تھے اور میں مختصراً جواب دیتی ہوئی خود کو احمق اعظم تصور کر رہی تھی۔ اس انٹرویو کا پس منظر کیا ہو سکتا تھا میری چھٹی حس بار بار سگنل دے رہی تھی۔

"پڑھتی ہو؟ کیا پڑھ رہی ہو؟ اچھا ایم بی اے، آئی بی اے انسٹی ٹیوٹ سے، ایوننگ میں یا مارننگ میں کون سا سمسٹر ہے۔ فیورٹ سبجیکٹ کون سا ہے۔ مستقبل کی پلاننگ۔" ان سوالات کے بعد اب مشاغل کی باری آئی تھی۔ میرے دیے گئے ہر جواب کے بعد وہ اپنے کسی اشعر نامی ہونہار سپوت کا تذکرہ کرنا ہرگز نہیں بھولتی تھیں۔ میرے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں بڑے شستہ انداز میں اپنے ایگزام کی مصروفیت کا بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اگرچہ کہ یہ بہانہ نہیں تھا لیکن اس وقت یہ مجھے بہانہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔

لاؤنج میں آکر میں نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔ چند منٹوں بعد میری سماعتوں نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اب میری سماعتیں ان قدموں کو شمار کر رہی تھیں جو لاؤنج کی اور بڑھ رہے تھے اور پھر میں نے مما کے ساتھ ارتضیٰ کو اور پاپا کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھا۔ پاپا سائیڈ ٹیبل سے اپنا سگریٹ

"ممی کو میں جانتا ہوں ان کا راضی ہونا ناممکن نہ سہی مگر مشکل ضرور ہے اور انکل بھی کل مجھے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کر رہے تھے ان کے رضا مند ہونے کے چانسز بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن بہرحال یہ ایک آخری اور انتہائی فیصلہ ہوگا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ یہ سب بتانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ تم ذہنی طور پر کسی بھی انہونی کے لیے تیار رہو۔ تم اپنے تمام خدشات بس میرے حوالے کر دو۔" وہ اطمینان سے بولا اور پھر میں نے اپنے تمام خدشات اور وسوسے معیز کی محبت اور یقین کے بھروسے طاق پر رکھ دیے تھے اس یقین کے ساتھ کہ اب میں کوئی قربانی نہیں دوں گی۔

اگلے روز یونیورسٹی سے واپسی پر ڈرائنگ روم سے ابھرتی آوازوں کو سن کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ نجانے کیوں مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ پھپھو اتنی جلدی دوبارہ یہاں کا چکر لگا لیں گی۔ ڈرائنگ روم سے ابھرتی چند آوازیں میرے لیے یکسر اجنبیت لیے ہوئی تھیں۔ میں ان آوازوں کو پہلی بار سن رہی تھی اور پہلی بار ہی میں نے محسوس کیا تھا کہ پھپھو کی آواز میں سابقہ ترشی اور طمطراق عنقا تھی۔ ان کے لہجے کا مصنوعی خوشگوار' خوش گفتار انداز مجھے بری طرح کھلا تھا۔ میں چند ساعتوں تک اپنے اندر جانے یا نہ جانے کے بارے میں سوچتی رہی اور پھر کچھ توقف کے بعد میں اپنے کمرے کی اور بڑھ گئی۔

اپنے کمرے میں آکر میں نئے سرے سے پھپھو کی آمد کے بارے میں قیاس آرائیاں کرتی رہی۔ ابھی مجھے اپنے کمرے میں آئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی ہوگی جب ہلکی سی دستک کے بعد ملازمہ اندر آگئی تھی۔

"آپ کو بڑے صاحب اندر بلا رہے ہیں۔" وہ مؤدب انداز میں کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ میں متعجب سی تھی۔ پاپا نے مجھے کبھی اپنے مہمانوں کے سامنے ایسے نہیں بلایا تھا۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے میں نے مدھم لہجے میں جھوٹی سلام جھاڑا۔ پھوپھو کے ساتھ بیٹھی اس خوش شکل اور باوضع خاتون نے میرے سلام کا جواب بلند آواز میں دیا تھا۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ممّا کے پاس صوفے پر ٹک گئی۔ میں اب اپنی یہاں آمد کے سلسلے میں تذبذب کا شکار تھی۔

"کیا نام ہے بیٹا آپ کا؟" خاتون نے بڑے رسان سے مجھ سے پوچھا۔ ان کے قریب بیٹھا ہوا وہ ادھیڑ عمر شخص بھی مسکراتے ہوئے مجھے ہی دیکھ رہا تھا۔

"قرۃ العین!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں اب بھی نا سمجھنے والے انداز میں اس کمرے میں موجود نفوس کو دیکھ رہی تھی۔ مگر ان کے چہروں سے کچھ بھی اخذ کرنا میرے لیے دشوار ترین ہوتا جا رہا تھا۔

نام دریافت کرنے کے بعد بھی وہ خاتون چپ نہیں ہوئی تھیں' بلکہ ان کے سوالات ایک کے بعد ایک آرہے تھے اور میں مختصراً جواب دیتی ہوئی خود کو احمق اعظم تصور کر رہی تھی۔ اس انٹرویو کا پس منظر کیا ہو سکتا تھا میری چھٹی حس بار بار سگنل دے رہی تھی۔

"پڑھتی ہو؟ کیا پڑھ رہی ہو؟ اچھا ایم بی اے' آئی بی ایس انسٹی ٹیوٹ سے' ایوننگ میں یا مارننگ میں کون سا سمسٹر ہے۔ فیورٹ سبجیکٹ کون سا ہے۔ مستقبل کی پلاننگ۔" ان سوالات کے بعد اب مشاغل کی باری آئی تھی۔ میرے دیے گئے ہر جواب کے بعد وہ اپنے کسی اشعر نامی ہونہار سپوت کا تذکرہ کرنا ہرگز نہیں بھولتی تھیں۔ میرے لیے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ میں بڑے شستہ انداز میں اپنے ایگزام کی مصروفیت کا بہانہ بنا کر وہاں سے اٹھ آئی تھی۔ اگرچہ کہ یہ بہانہ نہیں تھا لیکن اس وقت یہ مجھے بہانہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔

لاؤنج میں آکر میں نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔ چند منٹوں بعد میری سماعتوں نے گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی۔ اب میری سماعتیں ان قدموں کو شمار کر رہی تھیں جو لاؤنج کی اور بڑھ رہے تھے اور پھر میں نے ممّا کے ساتھ ارتضیٰ کو اور پاپا کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھا۔ پاپا سائیڈ ٹیبل سے اپنا سگریٹ

کبھی نہیں رہا تھا۔ یہ حقیقت آج میں کھلی آنکھ سے دیکھ رہی تھی۔ جہاں کوئی خوش گمانی اور خوش فہمی کا پردہ نہیں تھا پھر اچانک معیز کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"ممی کا راضی ہونا ناممکن نہ سہی' مشکل ضرور ہے اور کل انکل نے جس طرح مجھے اس فیصلے سے باز رکھنے کی سعی کی تھی' ان کے رضامند ہونے کے چانسز بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔"

میں آج ایک آس اور امید کی پرسکون اور میٹھی نیند سے بے دار ہوئی تھی اور جب میں بولی تو میرا لہجہ اتنا ہی رواں اور شفاف تھا' جتنا کہ ان کا پر رعونت انداز۔

"آپ میرے انکار کی کوئی بھی وجہ قبول کریں' میں یہ شادی نہیں کروں گی' نہ زور زبردستی سے اور نہ ہی آپ ہی کے حکم کے زیر اثر۔" نہ میری آواز لڑکھڑائی تھی اور نہ ہی میرا لہجہ کانپا تھا۔ جو میں کہنا چاہتی تھی' وہ میں کہہ چکی تھی۔ مما اور ارتضیٰ متحیر چہروں کے ساتھ مجھے دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہرے الگ الگ رد عمل کے ماخذ تھے' پھر میں ان کے سامنے سے ہٹ گئی تھی۔ ان کے سامنے سے ہٹنے کے باوجود میں ان کی آواز سن سکتی تھی' وہ مما پر چلا رہے تھے۔

"دیکھا تم نے' وہ مجھ سے کس انداز میں بات کر کے گئی ہے۔ میں نے اسے آزادی دی' اس پر اعتماد کیا اور اس نے میرے ساتھ کیا کیا۔ میرے اعتماد کو خاک میں ملا دیا۔ یہی سزا ملنی چاہیے مجھے کہ وہ میرے منہ پر اس انداز میں انکار کا طمانچہ دے مارے' میں اسی کا مستحق ہوں۔ اس سے تو بہتر تھا کہ معیز کو اس گھر میں آنے کی اجازت ہی نہ دیتا۔ کم از کم مجھے یہ دن تو دیکھنا نہ پڑتا' لعنت ہے مجھ پر اور میرے اندھے اعتماد پر' لیکن کان کھول کر سن لو تم اور...... سمجھا دینا اسے بھی' محبت کی آنکھ مچولی تو کھیل لی ہے اس نے' لیکن میں اس محبت کو انجام تک پہنچنے نہیں دوں گا۔"

مما کچھ نہیں کہہ رہی تھیں۔ وہ کچھ کہہ ہی نہیں سکتی تھیں۔ وہ پاپا سے اس قدر مرعوب اور متاثر تھیں کہ ان سے اختلاف رائے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا' چاہے ان کا یہ عمل ان کی اولاد کی خوشیوں کے آڑے ہی کیوں نہ آئے۔ وہ پاپا کے خلاف جا ہی نہیں سکتی تھیں۔ ایک پتھر کی پوجا کرنا اور اس کے سامنے ہاتھ جوڑنے کے علاوہ ان کی کوئی اور دنیا نہیں تھی' وہ کیسے اپنی اولاد کی خوشیوں کے بارے میں سوچ سکتی ہیں' جیسے تڑپا گئیں کے لیے ان کے دل میں کوئی احساس پیدا ہو سکتا تھا۔

بیڈ پر بیٹھی اپنے دونوں بازوؤں کو گھٹنوں کے اردگرد لپیٹے میں اپنے اضطراب کو کم کرنے کی سعی کر رہی تھی مگر کرب تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ آج پہلی بار مجھے اپنے ماں باپ سے شدید نفرت کا احساس ہوا تھا' شدید بے زاری محسوس ہوئی تھی۔ میرے محسوسات کی کرچیاں میرے وجود میں پیوست ہو رہی تھیں۔ کیا ماں باپ اس قدر خود غرض ہو سکتے ہیں کہ انہیں اپنی خود ساختہ انا اپنی اولاد سے زیادہ عزیز ہو۔

"میں نے ان کے لیے اتنا کچھ کیا۔" میرے کانوں میں پاپا کے الفاظ گونج رہے تھے۔ باوجود کوشش کے میں پاپا کی نوازش اور عنایات کی نوعیت جاننے سے قاصر تھی۔ اگر پاپا میرے لیے ایک عام باپ کی طرح ہوتے تو شاید انہیں یہ سب کہنے کی ضرورت بھی نہ محسوس ہوتی لیکن چونکہ میری نظر میں انہوں نے ایک ایسے باپ کا کردار ادا کیا تھا' جنہوں نے سوائے احسانات کے کوئی اور کام نہیں کیا تھا۔ معیز کا اس گھر میں داخلہ وہ کیسے فراموش کر سکتے تھے۔ بھلا احسانات بھی بھلائے جاتے ہیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات اور احساسات کا گلا گھونٹتے گھونٹتے میں قربانی دینے کی عادی نہیں ہوئی تھی۔ میں معیز سے دستبرداری کی قربانی نہیں دے سکتی تھی۔ یہ میرے لیے اتنا آسان کام نہیں تھا۔ میرے اندر جیسے ایک لاوا سا دہکنے لگا تھا۔ پاپا نے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی چھیننے کی بات کی تھی' معیز کو چھیننے کی۔

اگلے کئی روز تک میں نے پاپا کا سامنا کرنے سے گریز کیا تھا۔ گھر تو گھر یونیورسٹی میں بھی میری

بےزاری اپنے عروج پر تھی۔ یہ تو معیز کے ساتھ کیے گئے وعدے کا پاس تھا کہ میں باقاعدگی سے یونیورسٹی آرہی تھی۔ حالانکہ پڑھائی سے تو میرا دل کب سے اچاٹ ہو چکا تھا۔

"کیا بات ہے' کچھ دنوں سے تم بہت ڈل لگ رہی ہو؟" فارینہ کے سوال کے جواب میں میرے پاس سوائے تردید کے اور کچھ تھا ہی نہیں۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس آج ناشتا نہیں کیا' اس لیے تھوڑی سستی ہو رہی ہے۔"

"تو چلو پھر کینٹین چلتے ہیں۔ ویسے بھی مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" فارینہ نے اپنا بیگ دوسرے شانے پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔

فارینہ نے سینڈوچز اور کافی آرڈر کرنے کے بعد مجھے دیکھا پھر متبسم انداز میں گویا ہوئی۔

"تم بھی سوچ رہی ہو گی کہ میں تم سے کیا ضروری بات کرنے والی ہوں۔" مجھے اس کی مسکراہٹ بہت غیر مانوس سی محسوس ہوئی تھی۔ میں فقط اسے دیکھ رہی تھی' چند ساعت بعد اس کی آواز پھر ابھری تھی۔

"عینی! مجھے محبت ہو گئی ہے۔" فارینہ کے سرگوشیانہ انداز نے مجھے متعجب کر دیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ فارینہ ایسا کچھ کہے گی یا پھر مجھے کبھی بھی فارینہ سے اس قسم کے فلمی ڈائیلاگ کی توقع نہیں رہی تھی۔ فارینہ کسی سے محبت کر سکتی ہے' یہ ایک ناممکن سی بات تو نہیں تھی۔ یونیورسٹی میں جس طرح وہ محتاط انداز میں گفتگو کرتی' خصوصاً" لڑکوں کے ساتھ۔ وہی چیز میری بے یقینی میں اضافہ کر رہی تھی۔

میں نے متحیر انداز میں ایک بار پھر فارینہ کے چہرے پر نظر دوڑائی جو آج ایک انوکھی بشاشت اور چمک سے تابناک تھا۔ کیا محبت کا یقین کسی کو اس حد تک تبدیل کر سکتا ہے؟ اور پھر میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کیا معیز کی محبت نے مجھے بھی سرتاپا بدل دیا تھا؟ میرے اندر باہر ننھے منے جگنو ٹمٹمانے لگے تھے۔ اپنی محبت کا برملا اظہار یا اعتراف میں معیز کے سامنے نہیں کر سکی تھی مگر شاید میں نے اسے وہ ایقان دلا دیا کہ جس کے بعد اس نے مجھ سے کسی قسم کا اعتراف محبت قبول نہیں کروایا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی وہی رنگ تھے جو میں فارینہ کے چہرے پر دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھ سے یہ نہیں پوچھو گی کہ وہ کون ہے جس سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔" فارینہ کی آواز مجھے ایک بار پھر اس کی جانب متوجہ کر گئی تھی۔ میں نے ملائمت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا تھا' پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ضرور پوچھوں گی' بلکہ اس سے ملنا بھی چاہوں گی' جس سے تمہیں محبت ہو گئی ہے۔"

میں نے اپنائیت سے کہتے ہوئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھا۔

"عینی! مجھے معیز سے محبت ہو گئی ہے۔" کوئی دھماکہ نہیں ہوا تھا لیکن مجھے ایسا لگا تھا جیسے کوئی نادیدہ بوجھ میرے وجود پر آگرا ہو۔ کوئی انہونی نہیں ہوئی تھی لیکن فارینہ کی زندگی سے بھرپور ہاتھ کے اوپر رکھا اپنا ہاتھ بے جان ہوتا محسوس ہوا تھا۔ ارد گرد کی معمول کی آوازیں اب بھی جوں کی توں تھیں مگر مجھے سوائے سناٹے کے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا چہرہ ایکدم تاریک ہو گیا تھا مگر فارینہ وہ سب محسوس نہیں کر سکتی تھی جو میں کر رہی تھی۔ میرا دل وحشت سے بھر گیا جیسے میرے لیے یہ سب ناقابل یقین ہو اور مجھے یقین دلانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔

☼ ☼ ☼

اس کا دل وحشت سے بھر گیا۔ ایسے جیسے کہ یہ سب اس کے لیے ناقابل یقین ہو اور اسے یقین دلانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ اس نے ایک بار پھر سلجوق کے سیل فون کے نمبر کو ری ڈائل کیا تھا۔ اس بار کسی نے بھی اس کی کال ڈسکنیکٹ نہیں کی تھی اور ایسا اس لیے ہوا تھا کہ دوسری طرف سیل فون آف تھا۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ صرف چند روز میں ہی اس سے بےزار ہو گیا تھا۔ اس نے بہت کوشش کی

تھی کہ وہ نہ روئے مگر جیسا کہ سلجوق کے معاملے میں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوئی تھی' اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ آنسو سیل رواں کی مانند اس کے گالوں پر گر رہے تھے۔

"میں کیوں اس شخص سے ہار جاتی ہوں؟" اس کے حلق میں ایک گولا سا پھنس گیا تھا۔ وہ بے اختیار رو رہی تھی۔ زندگی میں ہر چیز اس کے لیے قابل برداشت تھی اور اگر کچھ ناقابل برداشت تھا تو صرف سلجوق عمر کی بے رخی اور بے توجہی۔

نجانے کتنے گھنٹوں تک وہ یونہی روتی رہی تھی۔ معاً" موبائل کی بیپ نے سناٹے میں جیسے ایک ہلچل سی پیدا کر دی تھی۔ اس نے دھندلی آنکھوں سے اسکرین پر جگمگاتا سلجوق عمر کا نمبر دیکھا۔ ایک بار' دوبار' بار بار وہ اس نمبر کو بے یقینی سے دیکھ رہی تھی۔ کافی دیر تک موبائل بجتا رہا لیکن اس نے کال ڈس کنیکٹ نہیں کی۔ ایک طمانیت اور سرشاری کے احساس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ جس قسم کے احساسات کے زیر تسلط تھی' اب اس کی جگہ طمانیت نے لے لی تھی اور اب محض اپنی ناراضگی کے اظہار کی خاطر وہ اس کا فون ریسیو نہیں کر رہی تھی' بلکہ مسلسل بجتے فون کی آواز اس کے اندر باہر جیسے شادیانے بجا رہی تھی' پھر یہ خوبصورت اور طمانیت انگیز موسیقی بھی اپنے انجام کو پہنچی اور اب بختاور کی بے چینی میں ایک بار پھر اضافہ ہو گیا تھا۔

چینل سرچنگ کرتے ہوئے اس کی نظریں ٹی وی سے زیادہ اپنے موبائل پر جمی ہوئی تھیں۔ معاً" ملازمہ نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"بختاور بی بی! نادیہ بی بی کا فون ہے' وہ آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔" وہ کارڈلیس اسے تھما کر بڑی عجلت سے باہر نکل گئی۔

اس نے بے زاری سے کارڈلیس اپنے کان سے لگایا۔

"نادیہ پلیز یار! میں اس وقت بالکل بھی تم سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" اس نے ناگواری سے کہا۔

"کیوں؟" یہ آواز نادیہ کی ہرگز نہیں تھی اور جس کی تھی' اس سے تو وہ قطعی بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔

"ناراض ہو؟" دوسری جانب سے بڑے مدھم انداز میں دریافت کیا گیا تھا۔ بختاور نے اپنے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں کی' وہ خاموش تھی۔

"آئم سوری بختاور۔ ایکسٹریملی سوری۔ ایکچوئلی میں بابا کے ساتھ ایک بہت ضروری میٹنگ میں تھا اور اس دوران میں تمہارا فون اٹینڈ نہیں کر سکا تھا۔"

تھوڑی سی ہمدردی ملتے ہی اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

"تم بھی بھی ناراض ہو۔" وہ بہت آہستہ سے دریافت کر رہا تھا۔

"میں تمہاری کوئی بات سننا نہیں چاہتی اور خاص طور پر مجھے تم سے کوئی بہانے نہیں سننے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"بائی گاڈ بختاور! میں جھوٹ نہیں بول رہا۔" وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ اسے کیسے یقین دلائے۔

"تم جھوٹے ہو۔ تم نے مجھے کہا کہ تم مجھے فون کرو گے اور جب تم نے مجھے فون نہیں کیا تو جانتے ہو میں کتنی پریشان ہو گئی تھی۔ میں نے پتا نہیں کیا کچھ سوچ لیا تھا۔ میں تمہیں فون نہیں کرنا چاہ رہی تھی مگر مجھے کرنا پڑا۔ میں کیا کرتی' میں خود کو ایسا کرنے سے باز نہیں رکھ پائی اور تم نے کیا کیا' میرا فون کاٹ دیا اور تم نے ایسا بار بار کیا۔ تم نے مجھ سے پرامس کیا تھا کہ تم مجھے کبھی اگنور نہیں کرو گے اور پھر تم نے بڑے آرام سے اپنا پرامس بھی توڑ دیا۔" وہ روتے ہوئے بے ربط انداز میں کہے جا رہی تھی۔

"او کے پلیز چپ ہو جاؤ' تم جانتی ہو نا کہ میں تمہیں روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔" سلجوق عمر کے لیے جیسے یہ صورت حال ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ بختاور اتنی چھوٹی سی بات کو اس حد تک سیریس لے لے گی۔ اس کی ناراضگی کا تو اسے

انداز تھا مگر ناراضگی کی یہ شدت جہاں اس کے لیے تکلیف دہ تھی وہیں بختاور کی اس محبت کی شدت نے اسے آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ دوسری جانب وہ رو رہی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"پلیز بختاور! آئی پرومس آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔" اس کا انداز تسلی دینے والا تھا۔

"لیکن اب میں تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گی اور اب تم مجھے فون بھی مت کرنا اور ملنے کی تو بالکل بھی کوشش مت کرنا۔"

"ورنہ___" سلجوق نے اس کے جارحانہ انداز کو قطع کرتے ہوئے کہا۔

وہ خاموش ہوگئی۔

"میں تمہیں فون بھی کروں گا اور تم سے ملنے کی کوشش بھی کروں گا اور اس کے لیے اگر مجھے تمہارے گھر بھی آنا پڑے تو میں آؤں گا۔ تم کیا کرو گی بختاور! مجھے روکنے کے لیے کوئی پلان ہے تمہارے زرخیز دماغ میں۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے مصنوعی دھمکی آمیز لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں خفیف سا طنز بھی پوشیدہ تھا' جسے بختاور نے فوراً محسوس کر لیا تھا۔

"تم ایسا نہیں کرسکتے۔" وہ شاید خود کو تسلی دے رہی تھی۔

"میں کیا کچھ کرسکتا ہوں' اس سے تو تم بے خبر ہو اور جہاں تک تمہارے گھر آنے والی بات ہے تو میرا خیال ہے کہ یہ میرے لیے مشکل نہیں ہے۔"

"اگر تم ایسا کرو گے تو میں تم سے ناراض ہو جاؤں گی۔"

"تو کیا اب تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔" تصدیق طلب لہجے میں دریافت کیا۔

وہ ایکدم خاموش ہوگئی۔

"تم مجھ سے واقعی ناراض ہو؟" اب کی بار اس نے بڑی سنجیدگی سے دریافت کیا تھا۔

"ہوں۔" متذبذب انداز میں اظہار کیا۔

"تو پھر میں تمہیں کیسے مناؤں؟" اس کا مدھم سرگوشی کرتا انداز اس کی مستحکم دھڑکنوں کو منتشر کر رہا تھا۔ اس کی بھاری خوابناک آواز اس کے حواسوں پر حاوی ہونے لگی تھی۔

"تم نے جواب نہیں دیا؟" وہ اسی خوابناک لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"تم مجھ سے ایسے بات مت کرو۔" دھڑکنیں اب بھی اس کے قابو میں نہیں تھیں۔

"کیسے؟" دھیمے سے دریافت کیا گیا۔

"مجھے نہیں پتا۔" وہ خفا سی ہوگئی۔ سلجوق قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"تمہیں تو ناراض ہونا بھی نہیں آتا۔ اب دیکھو میں نے تمہیں ستایا بھی نہیں اور تم___"

"تمہیں کس نے کہا ہے کہ میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔" وہ مصنوعی خفگی سے کہہ رہی تھی۔

"بختاور کی گھبراہٹ نے' اس کی شرمیلی سی ہنسی نے' اس کے دل کی تیز ہوتی دھڑکنوں نے' اس کے لہجے کی کھنک نے' اور سلجوق عمر کے دل نے۔" وہ شاعرانہ انداز میں گویا ہوا۔

"میں نہ تو گھبرا رہی ہوں اور نہ ہی شرما رہی ہوں اور میں تم سے کیوں شرماؤں گی۔" سارے اندیشے چھٹ گئے تھے اور اب صرف سرشاری تھی۔

"ریئلی؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ریئلی۔" بختاور نے جواباً کہتے ہوئے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر پہلے جو گھٹن اس کے چاروں اور تھی' اب اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ مشتعل اور متذبذب احساسات کی جگہ طمانیت نے لے لی تھی۔

اس روز ورکشاپ ختم ہونے تک سلجوق اور اس کے مابین بے تکلفی اور مانوسیت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا تھا۔ یہ سب اتنا اچانک اور فوری تھا کہ گزشتہ دنوں کی تمام کڑواہٹ اور اجنبیت ایک ثانوی اور دھندلا سا ہیولہ بن گئی تھی۔ کٹھور اور مغرور دکھائی دینے والا سلجوق عمر اس حد تک رومینٹک اور سوفٹ نیچر کا ہوگا' بختاور کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ پوری

ورکشاپ کے دوران وہ اس سے اتنی نرمی سے بات کرتا رہا تھا کہ بختاور کو اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ ایک زمانہ جس کے لیے پاگل تھا جس کے غرور کے قصے زبان زد عام تھے جو لڑکیوں کو ایک نظر اٹھا کر بھی دیکھنا گوارا نہیں کرتا تھا۔ وہ ایکدم اس حد تک تبدیل ہو جائے گا کہ اس کا ساحرانہ کنفور انداز خواب و خیال لگنے لگے گا۔

اور ویسے بھی بختاور کے لیے یہ سب کچھ ایک خواب جیسا ہی تھا جس لڑکے کو اس نے فلرٹ کرنا چاہا تھا' وہ خود اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ اس محبت کی جڑیں چند ہی روز میں دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ اس نے بھی اپنے آپ کو اس حد تک بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ جتنا کہ وہ خود کو سلجوق عمر کی محبت کے اظہار کے بعد سمجھنے لگی تھی۔ اس محبت کے کیا نتائج نکلنے والے تھے اور اس کے گھر والے اس کے اس اقدام کو کس زاویے سے لینے والے تھے۔ وہ یہ سب سوچ کر اپنے موجودہ خوشگوار لمحات کو پراگندہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔

ویسے بھی فیصلہ وہ کر چکی تھی اور عملی قدم اٹھانے سے پہلے تک وہ صرف دادو کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ وہی تھیں جو اس کے احساسات کو سمجھ سکتی تھیں۔ دادو کو قائل کرنا ممی اور ڈیڈی کو قائل کرنے سے زیادہ دشوار نہ تھا۔ وہ دونوں ہی غصے کے بہت تیز تھے۔ تدبر اور تدبیر کے بجائے وہ ہمیشہ جارحانہ انداز میں منفی فیصلے کیا کرتے تھے۔ یہ تو دادو ہی تھیں جو غصے میں بھی اس حد تک پرسکون دکھائی دیتی تھیں کہ ان کے چہرے کے تاثرات سے کوئی بھی کچھ بھی اخذ کرنے سے قاصر رہتا تھا۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی میں ہمیشہ دلیرانہ انداز میں فیصلے کیے تھے اور یہ فیصلے بظاہر فوری دکھائی دیے تھے مگر وہ جانتی تھی کہ دادو ہر بات کو ہر زاویہ نظر سے پرکھنے کی عادی تھیں۔ نہ تو انہوں نے کسی کو خود پر حاوی ہونے دیا تھا اور نہ ہی وہ کبھی کسی پر حاوی ہونے کی کوشش کرتی تھیں۔ یہ ان کی شخصیت کا وہ مثبت پہلو تھا جس نے بختاور کو کسی بھی قسم کے خدشات میں

جکڑا نہیں کیا تھا مگر یہ بھی نہ تھا کہ وہ مکمل طور پر مطمئن تھی۔ چند خدشات و اوہام کا سے ابھی بھی سامنا تھا' جو بظاہر غیر واضح تھا۔

نادیہ اور سارہ بھی اس کے اندر ہوتی تبدیلیوں کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکی تھیں۔ تبدیلی تو اس کی ذات کا حصہ بہت پہلے ہی بن چکی تھی۔ جب اس نے سلجوق عمر کو پہلی بار دیکھا تھا' تب تک اس کی ذات کا یہ تغیر غیر واضح اور غیر محسوس کن جھنجلاہٹ تک ہی محدود تھا اور اب جب کہ یہ جھنجلاہٹ اپنے دوام کو پہنچ چکی تھی تب ان دونوں نے اسے محسوس کیا تھا۔

"کیا بات ہے بختاور! تم بہت خاموش اور کھوئی کھوئی سی رہنے لگی ہو؟" سارہ نے استفسار کیا تھا جب کہ نادیہ اس سوال کی خاموش مکالمہ گری کر رہی تھی۔ وہ محض شانے اچکا کر رہ گئی تھی۔

"کوئی نہ کوئی تو خیر' کوئی بات ضرور ہوئی ہے ورنہ تم...." تشویش آمیز بے یقینی کہتے ہوئے نادیہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی تھی' مگر اس کے لہجے کا غیر معمولی پن اپنا مفہوم خود واضح کر رہا تھا۔ وہ فی الحال ان دونوں کو شریک راز نہیں کر سکتی تھی اور نادیہ کو تو ہرگز نہیں۔ اگر نادیہ' ثناقب کی بہن نہ ہوتی تو یقیناً بختاور کو ہر بار "بتائے یا نہ بتائے" والی متذبذب کیفیت میں گرفتار ہونا نہ پڑتا۔ ویسے بھی وہ ایک جذباتی لڑکی تھی۔ سلجوق کے ساتھ بختاور کی اس وابستگی کو وہ کس انداز میں لیتی اور کیا ردعمل ظاہر کرتی' وہ فی الحال اس بارے میں سوچ سوچ کر اپنی سوچوں کو الجھا کر ہلکان بنانا نہیں چاہتی تھی۔

نادیہ' مائرہ کو شکست دے کر مطمئن تھی اور بختاور اسے مطمئن اور پرسکون ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں کافی دیر تک اس کے موجودہ رویے کو ڈسکس کرتی رہی تھیں۔ بختاور نے محض مسکراتے ہوئے اس ڈسکشن کو سننے پر اکتفا کیا تھا۔

اس روز کے بعد سلجوق نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی پژمردہ ہو رہی تھی۔ دلگرفتی کا یہ عالم تھا کہ ہر چیز سے دل اچاٹ ہو گیا

تھا۔ خود سے فون کرتے ہوئے انا آڑے آ رہی تھی۔ کافی دیر سے وہ یونہی موبائل پر نظریں جمائے متوقع نمبر کی منتظر تھی۔ سلجوق کی یہ لاتعلقی اسے شاک گزر رہی تھی۔ موبائل کو بیڈ پر پٹختے ہوئے وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل آئی۔ کافی دیر تک مختلف سڑکوں پر پیٹرول پھونکتے ہوئے اس کا دماغ متضاد کیفیات کی یورش میں مبتلا تھا۔

سی ویو کے قدرے ویران ساحل پر چہل قدمی کرتے ہوئے اس کی سوچوں کا مرکز فقط سلجوق تھا۔ محض چند دن کی ٹیلی فونک رفاقت زندگی بھر کی رفاقت کی خواہش کرنے لگی تھی۔ نجانے کتنی دیر تک وہ یونہی اس کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ پھر چند لمحوں کے توقف کے بعد قریبی پتھروں پر آبیٹھی۔ شدت سے محسوس کی جانے والی تنہائی زود رنجی میں تبدیل ہو گئی تھی اور پھر اس نے اپنے سے کچھ فاصلے پر پڑے اس پھول کو دیکھا تھا جو کتنے لمحوں پہلے نجانے کس کے ہاتھوں کی زینت تھا۔ کس نے کن جذباتی تغیر کے احساس کے تحت اسے توڑا تھا اور کون اسے لینے پر اپنی خوشیوں اور طمانیت کی حدوں کو چھو آیا تھا۔ نجانے اسے کیا ہوا تھا۔ اس نے بہت آہستگی سے پھول کی ایک پتی کو پھول سے جدا کیا تھا۔

"He loves me !He loves me not!" کرتے ہوئے وہ اپنی نوزائیدہ محبت کو اس کسوٹی پر پرکھ رہی تھی جو محض افسانوی پیمانہ تھا، مگر نجانے کون سی حس تسکین پا رہی تھی۔ جوں جوں پتیوں کی تعداد کم ہوتی جا رہی تھی، اس کی دھڑکنوں کا استحکام بھی رخصت ہوتا چلا جا رہا تھا۔

آخری پتی He loves me not! پر اپنا فیصلہ صادر کر چکی تھی۔ وہ بے یقینی سے اپنے اردگرد بکھری ان پتیوں کو دیکھ رہی تھی۔ معاً" کسی کی مضبوط ہتھیلی نے اس کے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"معاً" کسی کی مضبوط ہتھیلی نے میرے ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے میں نے متحیر نظروں سے اس جرأت مندانہ اقدام کرنے والے کو دیکھا۔ معیز کے مسکراتے چہرے نے میری نظروں کو دھندلا دیا۔ اپنے دھیان سے چونکتے ہوئے میں نے بہت نرمی سے اپنا ہاتھ اس کی سخت ہوتی گرفت سے آزاد کروایا۔

"کیا بات ہے، یہاں ایسے کیوں بیٹھی ہو؟" پورا لاؤنج تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور مجھے احساس تک نہیں ہوا تھا۔ معیز نے لائٹ آن کی اور پھر میرے سامنے والے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔

"سب لوگ کہاں ہیں؟" اس کا سوالیہ انداز بہت عام سا تھا۔ ایسے جیسے کہ سب کے نہ ہونے یا ہونے سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ رسماً" دریافت کیا ہو۔

"بابا کے دوست کی بیٹی کی شادی پہ گئے ہیں۔" اردگرد پھیلے ہوئے کشن اٹھاتے ہوئے میں نے مصروفیت بھرے انداز میں جواب دیا تھا۔

"تم نہیں گئیں؟" وہ بہت گہری نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس بار میں نے صرف نفی میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

"کیوں؟"

"مجھے اپنے سمسٹر کی تیاری کرنا تھی۔" پتا نہیں کیوں میں اسے جواب دے رہی تھی۔ بہت سی باتیں چھپاتے ہوئے بھی میں اس پر سب کچھ عیاں کر جاتی تھی۔ شاید اب بھی میں کچھ ایسا ہی کر رہی تھی۔ اس کا غیر معمولی انداز اور کچھ سوچتا ہوا انداز اسی بات کا ماخذ تھا۔

اس روز فارینہ کا معیز کے حوالے سے اعتراف محبت سننے کے باوجود میں اپنی محبت سے دستبردار نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ پھوپھو مجھے کبھی بھی اپنی بہو بنانے پر راضی نہیں ہوں گی اور وہ بھی اس صورت میں جب فارینہ جیسی پرفیکٹ لڑکی ان کے بیٹے سے محبت کرنے کی دعوے دار ہو۔ میری نگاہوں کے سامنے ابھی بھی فارینہ کا چہرہ تھا اور اس کی بازگشت کرتی آواز اب بھی میری سماعتوں پر کوڑے

برسا رہی تھی۔

"زندگی... زندگی اس حد تک خوبصورت ہو سکتی ہے؟ مجھے آج محسوس ہو رہی ہے۔ کل جب معیز آذر سے ملنے آیا تو پتا نہیں کیوں مجھے اس کی آمد اچھی لگ رہی تھی۔ تب اس لمحے مجھے احساس ہوا تھا کہ میں لاشعوری طور پر اس کی آمد کی منتظر تھی۔ وہ... آذر اور ممی سے باتیں کر رہا تھا اور میں سارا وقت اسے دیکھتی رہی تھی۔ میں اسے پہلی بار نہیں دیکھ رہی تھی' لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں اسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔ ایک بالکل نئے معیز کو جس سے مجھے محبت ہو گئی تھی۔ محبت... کتنی انوکھی سی چیز ہے نا عینی! کل تک جو شخص میرے لیے غیر اہم تھا' فقط ایک لفظ نے اسے میرے لیے سب سے خاص بنا دیا تھا۔"

فاریہ کی زبان سے ادا کیا جانے والا ایک ایک لفظ اس کی محبت کی سچائی کا غماز تھا۔ میرے لیے یہ الفاظ خود ترسی تھے جس نے میرے لیے سوچوں اور تذبذب کا ایک اور در وا کر دیا تھا۔ میری زندگی میں سوائے احساسات کے اور کچھ نہیں تھا اور شاید احساس کا دوسرا نام ہی اذیت ہے۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" معیز کی آواز نے مجھے چونکایا تھا لیکن میں کوئی رد عمل ظاہر نہیں کر سکی تھی۔ میں بس خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ میرا الجھا الجھا انداز یقیناً وہ بھی محسوس کر چکا تھا۔

"عینی کوئی پرابلم ہے؟" تشویش آمیز انداز میں دریافت کرتے ہوئے اس کا لہجہ مختلف اندیشوں سے مزین تھا۔ میں بدستور خاموش تھی۔ وہ کافی دیر تک مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا تھا پھر ایکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے وجود میں کوئی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ داخلی دروازے کی اور بڑھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر مجھے مخاطب کیا تھا۔

"کل مما اور پپا تمہارے لیے میرا پرپوزل لے کر آئیں گے۔" وہ بہت ٹھوس انداز میں کہہ رہا تھا۔ چند ساعتوں کے توقف کے بعد مجھے اس کے قدموں کی چاپ دور تک سنائی دی اور پھر ایکدم سناٹا چاروں اور

تھا۔ کسی طمانیت نے سر نہیں اٹھایا تھا۔ میں سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ میں اتنی رقیق القلب کیوں ہوتی جا رہی تھی۔ بدگمانیاں اور شکوک و ابہام میں اضافہ کیوں ہوتا جا رہا تھا۔ کیا منزل قریب آ رہی تھی یا سب کچھ کھونے والا تھا۔ ایک دن بعد سب کچھ عیاں ہونے والا تھا۔ مجھے ایک مخصوص کیفیت نے جکڑنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اپنے اعصاب کو پرسکون کرنے کی کوشش کی بھی مگر یہ سب کوششیں بے سود ثابت ہوئی تھیں۔

اگلے روز اتوار تھا' پاپا کو گھر پر ہی ہونا تھا اور انکل کی متوقع آمد نے میرے اندر ایک غیر معمولی سا تجسس پیدا کر دیا تھا۔ یہ تو طے تھا آج کوئی نہ کوئی فیصلہ ضرور ہونا تھا۔ چاہے وہ میرے حق میں ہوتا یا میرے خلاف' کم از کم زندگی سے متعلقہ یہ بے چینی اور بے قراری کا عنصر تو ختم ہو جاتا جس نے میرے احساسات کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

اور پھر وہ لمحہ بھی آ گیا تھا' جس کی میں دانستہ و غیر دانستہ طور پر منتظر تھی۔ پھوپھو اپنی مخصوص پر رعونت چال سمیت لاؤنج میں تشریف لا چکی تھیں۔ وہ اکیلی تھیں۔ حالانکہ معیز نے اپنے ممی پاپا دونوں کے آنے کی پیش گوئی کی تھی۔ لاؤنج میں آتے ہی انہوں نے جس طرح مجھے دیکھا تھا' ان کی آنکھوں کا تنفر اور خشونت مجھے حقیقت کی دنیا کی جانب کھینچ رہی تھی اور یہ خوش فہم دل اندازوں اور مثبت قیاس آرائیوں کے سہارے طلسمات میں مقید تھا۔

"کہاں ہے تمہارا باپ؟" انہوں نے ارتضیٰ کو مخاطب کیا تھا جب کہ ان کی آنچ دیتی نگاہوں کا مرکز ابھی بھی میں ہی تھی۔ ارتضیٰ کے جواب دینے سے پہلے ہی مما اور پاپا اپنے کمرے سے برآمد ہوئے تھے۔

"سمجھایا تھا نا میں نے تمہیں کہ تم اپنی اس سوکالڈ اولاد کو قابو میں رکھو۔ لگتا ہے تم نے میری اس بات کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔" انہوں نے جس تحقیر آمیز انداز میں میری جانب اشارہ کیا تھا' اس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

"تمہاری اولاد تو تمہارے قابو میں نہیں ہے اور

تمہاری یہی نااہلی میری اولاد کے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہی ہے۔ آج معیز نے مجھ سے جس انداز میں بات کی ہے' جس طرح وہ میرے سامنے آکھڑا ہوا ہے' وہ میری برداشت سے باہر ہے۔"

"پھوپھو! آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں۔" ارتضیٰ کا نا سمجھنے والا انداز سوالیہ لہجہ اختیار کر گیا تھا۔

"تم درمیان میں مت بولو جو میں کہنا چاہ رہی ہوں' وہ تمہارا باپ اچھی طرح سمجھ چکا ہے۔ سمجھایا تھا میں نے اسے کہ یہ قرۃ العین کو معیز سے دور رکھے اور جس اندیشے کے تحت میں نے ایسا کہا تھا' آج وہ اندیشہ میرے گھر کی دیواروں کو ہلا گیا۔ میں کبھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ قرۃ العین کبھی میرے گھر کی بہو نہیں بنے گی۔" میرے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔ میرا وجود جیسے خلا میں معلق ہو گیا تھا۔ میں آنکھیں پھاڑے اس نفرت کی آگ کو جھیل رہی تھی' جو ان کی آنکھوں اور زبان سے بیک وقت نکل رہی تھی۔

"معیز' قرۃ العین سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اس میں اتنا غصہ کرنے والی کون سی بات ہے۔"

"ارتضیٰ! تم خاموش رہو۔" ارتضیٰ کے متحیر انداز کو پاپا نے ایکدم ٹوک دیا تھا۔

"کیوں خاموش رہوں پاپا! آخر اس میں ایسی کون سی انہونی ہو گئی ہے۔ معیز اور عینی دونوں میچیور ہیں۔ اپنی زندگی کا فیصلہ وہ خود کر سکتے ہیں۔ وہ دونوں بچپن سے ہی اچھے دوست رہے ہیں۔ اب اگر وہ شادی کرنا چاہتے ہیں تو اس میں اس قدر قیامت برپا کرنے والی کون سی بات ہے اور پھر عینی میں ایسی کون سی کمی ہے کہ آپ اسے اپنی بہو تسلیم کرنا نہیں چاہتیں۔" میں ایک خاموش تماشائی کی مانند ان خامیوں اور ان اعتراضات کو سننے کی منتظر تھی کہ جن کی بنا پر میں معیز سے شادی نہیں کر سکتی تھی اور جس کی بنا پر میں پھوپھو کو اپنے ساتھ روا رکھے گئے تنفر آمیز رویے کو حق بجانب قرار دیتی' لیکن ارتضیٰ کی اس جرأت پر چاروں جانب سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ ممّا

پاپا کے ساتھ ساتھ پھوپھو بھی گنگ تھیں۔ چند ساعتوں کے توقف کے بعد پاپا کی آواز سنائی دی تھی۔

"ارتضیٰ! تم اپنے کمرے میں جاؤ۔" اس تحکم آمیز رویے کے باوجود ارتضیٰ پر مطلق اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ جوں کا توں کھڑا رہا۔ میں ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب میں یہاں مزید کھڑی رہ کر اپنا تماشا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں اس منظر سے ہٹ جانا چاہتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اب اس مبہم سی نفرتوں کو سہنا برداشت سے باہر ہو چکا تھا اور اب جبکہ یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ معیز دسترس سے باہر تھا مگر راستے میں ہی ارتضیٰ میرا ہاتھ تھام کر مجھے روک گیا تھا۔

"تم کہیں نہیں جا رہیں۔ تمہیں خود اس بات کا تجسس نہیں ہے کہ آخر پھوپھو تمہیں کس ریزن کے تحت ریجیکٹ کر رہی ہیں۔ تمہارے اندر عزت نفس ہے کہ نہیں ہے؟" اس کا غصہ ان کے لہجے سے ہویدا تھا۔

"عزت نفس کی خاطر ہی تو میں یہاں سے چلی جانا چاہتی ہوں۔" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں سرگوشی کی تھی۔

"عینی! آپ کو کیوں ناپسند ہے۔" اس نے ٹھوس اور مدلل لہجے میں دریافت کیا تھا۔ پھوپھو خاموش تھیں۔ انہوں نے پاپا کو دیکھا اور پھر پر رعونت لہجہ میں کہا۔

"میں تمہارے سامنے جواب دہ نہیں ہوں ارتضیٰ۔"

"تو یہاں اس انداز میں آنے کا کیا جواز ہے۔ آپ کا تو انداز ایسا تھا جیسے عینی نے معیز کو پھنسایا ہو۔ نہ تو معیز اتنا کم عمر ہے اور نہ ہی کم عقل۔ اور اگر بالفرض ایسا ہوا بھی ہے تو آپ کیوں ان سیکیور فیل کر رہی ہیں اور پھر وہی بات آجاتی ہے کہ آخر عینی میں ایسی کون سی برائی ہے۔"

"اسٹاپ اٹ ارتضیٰ! جسٹ اسٹاپ۔ تم اگر کچھ نہیں جانتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو کچھ تمہارے منہ میں آئے گا تم بولتے چلے جاؤ گے۔" اس

بار پھوپھو کا انداز کچھ کچھ الجھن لیے ہوئے تھا۔ ایسے جیسے ارتضیٰ کا یہ جواب طلب کرتا انداز ان کے لیے غیر متوقع ہو۔ ان کے لیے حقیقتاً" یہ سب توقع کے برعکس ہی تھا۔ ان کا تنتنا گردن کی اکڑ اور تفاخر ایک ہی پل میں زمین بوس ہو گیا تھا اور ایسا ارتضیٰ نے کیا تھا۔

"آپ کے منہ میں جو آئے گا' وہ آپ ہمارے گھر میں آکر آسانی سے کہہ سکتی ہیں۔ آپ کا جب جی چاہے گا آپ میری ماں اور بہن کو اپنی نفرت کا نشانہ بنا سکتی ہیں۔ کیوں؟ یہ ڈبل اسٹینڈرڈ کیوں ہے۔ آپ جب بھی آتی ہیں' عینی کی انسلٹ کرتی ہیں یا تو اسے اگنور کرکے یا نفرت کا اظہار کرکے مگر اب ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں آپ کو اس چیز کی اجازت نہیں دوں گا کہ آپ ہمارے گھر میں آکر میری بہن کی اس طرح انسلٹ کریں۔ اگر آپ معیز کی شادی عینی سے کرنا نہیں چاہتیں تو اس چیز کا اظہار کرنے کے لیے ہمارے گھر آنے کی آپ کو قطعا" ضرورت نہیں تھی۔ آپ صرف معیز پر حق رکھتی ہیں۔ اپنے اختیارات کا استعمال آپ ہمارے گھر میں مت کیا کریں۔ خود کو اور اپنے اختیارات کو صرف اپنے گھر تک محدود رکھا کریں۔" پھوپھو کے ساتھ ساتھ مما اور پاپا کی حالت قابل دید تھی۔ میرا ہاتھ ابھی بھی ارتضیٰ کے ہاتھ میں تھا اور وہ بے تکان بول رہا تھا۔

"ہماری جانب سے آپ معیز کی شادی ایکس وائی زیڈ کسی سے بھی کریں' ہمیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عینی کوئی گری پڑی نہیں ہے کہ معیز کے علاوہ اسے کوئی ملے گا نہیں۔ آج کے بعد آپ خود بھی چاہیں گی تب بھی کم از کم عینی آپ کی بہو نہیں بنے گی۔" فیصلہ کن انداز میں کہتے ہوئے ارتضیٰ میرا ہاتھ تھام کر اوپر چلا آیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں ایک تحفظ کا احساس تھا مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ کھو دینے کا احساس بھی تھا۔ میری آنکھوں میں بے اختیار ہی نمی اتر آئی تھی۔ اب مجھے اپنے بھائی کی زبان کی پاسداری کرنی تھی۔ خواب اور زندگی کی حقیقت میرے سامنے

مجسم اکھڑی ہوئی تھی۔ معیز کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواب تعبیر نہیں پا سکا تھا۔ معیز کے بغیر زندگی گزارنے کا جان لیوا احساس میری فکر میں اضافہ کر رہا تھا۔

میرے کمرے میں آکر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

"تم معیز کو پسند کرتی ہو؟" یہ جملہ ہوئے لہجے میں کہتا ہوا میرے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں بغور مجھے جانچ رہی تھیں۔ کیا میں کسی سے بھی کچھ نہیں چھپا سکتی تھی۔ میں نظریں جھکائے امید سے بھری آنکھوں کا سامنا نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کی خاموشی نے مجھے باور کروا دیا تھا کہ میں اس کی امیدوں پر کھری نہیں اتری تھی۔

"آئی ایم سوری عینی! مجھے تم سے یہ سوال پہلے پوچھ لینا چاہیے تھا لیکن ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا جب میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ایکدم ان آنکھوں میں جھانکا تھا۔

"اب کچھ نہیں بچا ارتضیٰ! اب ختم ہو گیا۔" ارتضیٰ نے ایکدم میرا سر اپنے شانے سے لگایا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ معیز تمہیں بہت خوش رکھتا مگر میں یہ بھی جانتا ہوں کہ پھوپھو تمہیں کبھی خوش رہنے نہ دیتیں۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جن سے کسی کا دکھ برداشت نہیں ہوتا مگر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے کسی کی خوشی اور سکون برداشت نہیں ہوتا۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے تمہارے حوالے سے یکطرفہ فیصلہ کیا ہے مگر کچھ عرصے بعد تمہیں خود اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ یہ میری جذباتیت نہیں بلکہ دوررس سوچ تک رسائی تھی۔" وہ میرا سر تھپتھپا رہا تھا۔

اور پھر میں معیز کی محبت سے دستبردار ہو گئی تھی۔ میرے اس فیصلے کی آڑ نہ تو ارتضیٰ بنا تھا اور نہ ہی فارتہ۔ ارتضیٰ اگر احساس جرم میں مبتلا تھا تو میری نظر میں اس کا یہ احساس قطعا" غلط تھا۔ پھوپھو کے سامنے اس نے جو کچھ کیا تھا وہ پاپا کو کرنا چاہیے تھا۔ اس کے

لب و لہجے نے پھوپھو کو خفت آمیز چپ وان دی تھی اور مجھے... مجھے اس نے نخفو کے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ اگر پاپا کا رویہ نارمل ہوتا تو شاید میں اس سارے معاملے میں انہیں بھی مجرم تصور نہیں کرتی مگر پاپا مجرم ہی تھے۔ میری خواہشات کے اور میری خوشیوں کے اور اب وہ وقت آ گیا تھا' جب میں نے انہیں وہ سب کچھ لوٹانا تھا جو انہوں نے مجھے دیا تھا۔ کم مائیگی کا احساس' بے لچک تحکمانہ انداز اور تنفر کا احساس۔ زندگی کو اب نئے رخ پر جینا تھا۔ اس تبدیلی کو بھی اپنی زندگی پر لاگو کرنا تھا جسے میں پاپا کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کر سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ خود کو انتہا کی بے بسی پر پاتے ہوئے وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھے سلجوق عمر کو دیکھتی۔ اس کے ہاتھ کی ملائمت آمیز گرفت بھی اسے مختلف اندیشوں اور واہموں کے گرداب سے نہیں نکال پائی تھی۔

"میں نے سوچا تھا کہ تم سے ناراض ہو کر دیکھتے ہیں کہ تم کیسے مناتی ہو مگر یار! میں نہ تو تمہاری ناراضگی سہہ سکتا ہوں اور نہ ہی تم سے ناراض ہو سکتا ہوں۔ دو دن میں تم نے اپنی آنکھوں کا کیا حال کر لیا ہے۔" اس نے تاسف سے کہتے ہوئے اس کی پلکوں کو ہلکا سا مس کیا تھا۔ ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نرمی اور اپنائیت کا رنگ لیے وہ مسلسل اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے غمگین تاثر کے سوا وہ کچھ نہیں کھوج پایا تھا۔

"اینی پرابلم؟" سلجوق کی گہری نظروں کو خود پر مرتکز پا کر وہ ایک بار پھر ان پتیوں کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

"اگر یہ سب حقیقت ہوئی' سلجوق عمر کو مجھ سے محبت نہ ہوئی تو..." دل سے اٹھتا بے یقینی کا احساس تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"او مائی گاڈ! تم ایک بار پھر مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئی ہو؟" وہ متفکر انداز میں استفسار کر رہا تھا۔ وہ بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تھینک گاڈ!" اس نے با آواز بلند کہتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک بار پھر تھام لیا تھا۔

"سلجوق!" اس نے بہت دھیمے سلگتے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ وہ پوری جان سے اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

"کیا... تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" سلجوق عمر نے بغور اسے جانچا تھا۔ معصومانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ کسی قدر ہراساں اور بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اس پل وہ اسے اپنے دل کی گہرائی میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ لڑکیوں سے کڑی بے نیازی برتنے والا سلجوق عمر اس لڑکی کے سامنے ہار گیا تھا۔ جو کچھ وہ پوچھ رہی تھی وہ تو محض اس احساس کی ہلکی سی جھلک تھی جس کا یقین وہ پا لینا چاہتی تھی۔ اس کا جواب نہ ملنے پر اس نے بہت چونک کر سلجوق عمر کو دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

"اس طرح رو کر تم مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ مجھ سے کس قسم کے اعترافات سننا چاہتی ہو۔" درحقیقت اسے بختاور کے اس طرح زود رنج ہونے پر غصہ آنے لگا تھا۔

"تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے' تم صرف مجھے پسند کرتے ہو۔ وہ بھی اس لیے کہ تم مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔"

"تم کیا سننا چاہتی ہو' بختاور علی!" اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ اس لڑکی کے سامنے ہار رہا تھا اور وہ مسلسل اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"یہی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو' یا نہیں کرتے۔" اس نے اس کے بازوؤں کو اپنے شانے سے جھٹکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا تو... تو کیا تم مجھ سے تعلق توڑ لو گی؟" وہ بہت

لب و لہجے نے پھوپھو کو خفت آمیز چپ دلا دی تھی اور مجھے۔ مجھے اس نے تحفظ کے آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ اگر پاپا کا رویہ نارمل ہوتا تو شاید میں اس سارے معاملے میں انہیں بھی مجرم تصور نہیں کرتی مگر پاپا مجرم ہی تھے۔ میری خواہشات کے اور میری خوشیوں کے اور اب وہ وقت آگیا تھا جب میں نے انہیں وہ سب کچھ لوٹانا تھا جو انہوں نے مجھے دیا تھا۔ کم مائیگی کا احساس' بے لچک تحکمانہ انداز اور تنفر کا احساس۔ زندگی کو اب نئے رخ پر جینا تھا۔ اس تبدیلی کو بھی اپنی زندگی پر لاگو کرنا تھا جسے میں پاپا کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کر سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھیں جھلملانے لگی تھیں۔ خود کو انتہائی بے بسی پر پاتے ہوئے وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ خود سے کچھ فاصلے پر بیٹھے سلجوق عمر کو دیکھتی۔ اس کے ہاتھ کی ملامت آمیز گرفت بھی اسے مختلف اندیشوں اور واہموں کے گرداب سے نہیں نکال پائی تھی۔

"میں نے سوچا تھا کہ تم سے ناراض ہو کر دیکھتے ہیں کہ تم کیسے مناتی ہو مگر یار! میں نہ تو تمہاری ناراضی سہہ سکتا ہوں اور نہ ہی تم سے ناراض ہو سکتا ہوں۔ دو دن میں تم نے اپنی آنکھوں کا کیا حال کر لیا ہے۔" اس نے تاسف سے کہتے ہوئے اس کی پلکوں کو ہلکا سا مس کیا تھا۔ ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ اور آنکھوں میں نرمی اور اپنائیت کا رنگ لیے وہ مسلسل اس کے چہرے نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے کے غمگین تاثر کے سوا وہ کچھ نہیں کھوج پایا تھا۔

"نی پرابلم؟" سلجوق کی گہری نظروں کو خود پر مرتکز پا کر وہ ایک بار پھر ان پتیوں کی جانب دیکھنے لگی تھی۔

"اگر یہ سب حقیقت ہوئی' سلجوق عمر کو مجھ سے محبت نہ ہوئی تو..." دل سے ابھرتا بے یقینی کا احساس تھا کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔

"او مائی گاڈ! تم ایک بار پھر مجھ سے ناراض تو نہیں ہو گئی ہو؟" وہ متفکر انداز میں استفسار کر رہا تھا۔ وہ بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تھینک گاڈ!" اس نے با آواز بلند کہتے ہوئے اس کا ہاتھ ایک بار پھر تھام لیا تھا۔

"سلجوق!" اس نے بہت دھیمے سلگتے لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں ایسا کچھ ضرور تھا کہ وہ پوری جان سے اس کی جانب متوجہ ہوا تھا۔

"کیا... تم مجھ سے محبت کرتے ہو؟" سلجوق عمر نے بغور اسے جانچا تھا۔ معصومانہ انداز میں کہتے ہوئے وہ کس قدر ہراساں اور بے یقینی کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ اس پل وہ اسے اپنے دل کی گہرائی میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ لڑکیوں سے کڑی بے نیازی برتنے والا سلجوق عمر اس لڑکی کے سامنے ہار گیا تھا۔ جو کچھ وہ پوچھ رہی تھی وہ تو محض اس احساس کی ہلکی سی جھلک تھی جس کا یقین وہ پالینا چاہتی تھی۔ اس کا جواب نہ ملنے پر اس نے بہت چونک کر سلجوق عمر کو دیکھا اور پھر اس کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

"اس طرح رو کر تم مجھ پر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو۔ مجھ سے کس قسم کے اعترافات سننا چاہتی ہو۔" درحقیقت اسے بختاور کے اس طرح زود رنج ہونے پر غصہ آنے لگا تھا۔

"تم مجھے صاف صاف کیوں نہیں بتاتے کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے' تم صرف مجھے پسند کرتے ہو۔ وہ بھی اس لیے کہ تم مجھ سے مانوس ہو گئے تھے۔"

"تم کیا سننا چاہتی ہو بختاور علی!" اس نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ اس لڑکی کے سامنے ہار رہا تھا اور وہ مسلسل اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

"یہی کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو' یا نہیں کرتے۔" اس نے اس کے بازوؤں کو اپنے شانے سے جھٹکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

"اور اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا تو... تو کیا تم مجھ سے تعلق توڑ لو گی؟" وہ بہت

عجیب سے لہجے میں دریافت کر رہا تھا۔
"ہاں!" سلجوق عمر نے بہت چونک کر اس کے چہرے کو دیکھا۔
"تم واقعی ایسا کرو گی؟"
"ہاں' میں ایسا ہی کروں گی۔" اس کا لہجہ مضبوطی لیے ہوئے تھا۔ ایک بار پھر سلجوق عمر نے اس کے شانوں کو تھام لیا تھا۔
"وہ پروا جو میں نے تمہاری کی' وہ توجہ جو میں نے تمہیں دی' وہ باتیں جو میں نے تم سے شیئر کیں' ان سب کا کیا۔ کیا یہ سب محض ایک فقرے کے کہہ دینے سے ختم ہو جائیں گی کیا ان احساسات کی تمہاری نظر میں کوئی ویلیو نہیں۔ سلجوق عمر نے کبھی کسی بھی لڑکی سے اس انداز میں باتیں نہیں کیں اور اگر اس نے ایسا کیا ہے تو کیوں؟ سوچا ہے تم نے ایسا؟ کیوں میں تمہاری پروا کرتا ہوں' کیوں میں صبح سے رات تک تمہارے بارے میں سوچتا ہوں' کیوں مجھے ہر وقت تمہاری ناراضگی کا خیال رہتا ہے۔"
"کیونکہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔" وہ آس کے جگنو جلائے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ سلجوق عمر اس کی جانب سے رخ موڑ کر سمندر کی لہروں کو دیکھنے لگا تھا۔
"کیا میری محبت زبانی اظہار کی محتاج ہے بختاور!" وہ متاسف انداز میں کہہ رہا تھا۔ وہ خاموش رہی۔
"اس سے پہلے میں نے خود بھی کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ میں اگر خود بھی چاہوں تو بھی اپنی محبت کو ناپ نہیں سکتا تو میں کیونکر تمہیں بتا سکتا ہوں کہ میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ تم پھولوں کی ان پتیوں سے کیسے میری محبت کا اندازہ کر سکتی ہو۔"
"آئی ایم سوری۔" وہ آنکھوں میں ڈھیروں پانی لیے معذرت خواہانہ انداز میں کہہ رہی تھی۔
"یہ رونا دھونا اب نہیں چلے گا اینڈ دس از مائی لاسٹ وارننگ۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام کر سمندر کی ریت پر اتر آیا۔ نجانے کتنی دیر تک وہ خاموشی سے چہل قدمی کرتے رہے تھے۔ معاً" سلجوق عمر اس کے سامنے آکھڑا ہوا اور گھٹنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔
"میں تم سے محبت کرتا ہوں بختاور غنی! کیا تم مجھ سے شادی کرنا پسند کرو گی۔" وہ اچانک اظہار محبت پر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ حیران سی اپنے سامنے پھیلے اس کے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ کس قدر دلکش تھا یہ سب' بالکل ایک فریب دیتے خواب کی مانند۔ بہت جھجک کر اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔
"میرا تو خیال تھا کہ تم ایکدم اپنا ہاتھ مجھے تھما دو گی۔ بائی دا وے میرا ہاتھ تھامنے کے لیے تمہیں اتنا وقت کیوں لگا۔" وہ بہت شرارتی انداز میں دریافت کر رہا تھا۔
"کوئی بھی کام کرنے سے پہلے ایک بار ضرور سوچ لینا چاہیے' یہ میری دادو کہتی ہیں۔" وہ بھی شرارت پہ مائل تھی۔
"مائنڈ یو۔ یہ وہ کام تھا جو تم نے مجھ سے کروایا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ بختاور نے ایک زوردار مکا اس کے شانے پر رسید کیا تھا۔
"محبت میں مرنے ورنے کی باتیں پرانی ہوگئی ہیں۔ میں تمہاری محبت میں تم سے شادی پر تیار ہوں۔ اس سے بڑی قربانی بھی کوئی محبوب اپنی محبوبہ کے لیے دے سکتا تھا۔" حفظ ماتقدم کے طور پر وہ اس سے کچھ فاصلے پر جاکھڑا ہوا تھا۔
"سلجوق! تم بہت برے ہو۔" وہ مصنوعی غصے سے اس کی سمت بڑھی تھی۔ وہ ہنستا ہوا خود اس کے نزدیک چلا آیا۔
نجانے کتنی دیر تک وہ ساحل سمندر پر اس طرح اٹکھیلیاں کرتے رہے۔ بختاور کو یہ دن اپنی زندگی کا سب سے خوبصورت دن لگا تھا۔
اگلے کئی روز تک وہ دادو کو سلجوق عمر کے بارے میں بتانے کا سوچتی رہی اور ہر بار کوئی نہ کوئی متذبذب کیفیت اسے ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ ویسے بھی آج کل دادو خاصی مصروف تھیں۔ حمزہ بھائی کی

شادی پھوپھو کی بڑی بیٹی سے ہو رہی تھی۔ اسی سلسلے میں ایک مہینے سے ان کا قیام پھوپھو کے ہاں تھا۔ اس بابت انہیں بتانے کا عمل اس نے حمزہ بھائی کی شادی کے بعد پر ٹال دیا تھا۔

بختاور کے ساتھ ساتھ سارہ اور نادیہ بھی حمزہ بھائی کی شادی کی پرجوش تیاریوں میں مصروف تھیں۔ روزانہ مارکیٹوں کے چکر لگ رہے تھے۔ فنکشن کے حوالے سے ڈسکشن چل رہی تھی۔

"مجھے پتا تھا ٹیلر میرے سوٹ کا بیڑا غرق ضرور کرے گا۔ اب میں کیا پہنوں گی حمزہ بھائی کی شادی پر۔" ابھی بھی وہ تینوں مارکیٹ سے ہو کر آئی تھیں۔ ٹیلر نے نادیہ کا سوٹ خراب کر دیا تھا اور وہ اسی افسوس میں مسلسل راگ الاپ رہی تھی جبکہ وہ دونوں نادیہ کو نظرانداز کیے اپنی کی گئی شاپنگ پر سیر حاصل تبصرہ فرما رہی تھیں۔

"یار! یہ دن اتنی تیزی سے گزر رہے ہیں آج سولہ اپریل ہے۔ اٹھارہ اپریل کو حمزہ بھائی کی شادی اور پھر نیکسٹ ڈے ہمارے تھرڈ سمسٹر کے پیپر اسٹارٹ ہو جائیں گے۔ کیا بنے گا ہمارا' فرسٹ ٹرم نادیہ کے انڈر نیچر کی نذر ہو گیا تھا اور اس کے بعد تو جیسے سمسٹر بھاگ رہے ہیں۔ مجھے تو یہ سمسٹر بھی ہاتھ سے نکلتا ہوا لگ رہا ہے۔" سارہ کی فکرمندی اپنے عروج پر تھی جبکہ بختاور کی سوئی محض ایک نقطے پر اٹک گئی تھی۔

"آج سولہ اپریل ہے؟" اس نے زیر لب بے یقینی سے دہرایا تھا۔

"تم اپنے فورتھ سمسٹر کی بھی خیر منالو۔" نادیہ نے اس کی پریشانی میں اضافے کی خاطر بڑے متجسس انداز میں کہا تھا۔

"کیا مطلب؟" سارہ نے حیرت سے دریافت کیا۔

"ثاقب بھائی اگلے مہینے تشریف لا رہے ہیں اور اس بار وہ بڑی سنجیدگی سے امی سے اپنی شادی کے بارے میں کہہ چکے ہیں کیونکہ اگلی بار وہ تین سال بعد ہی آسکیں گے اور امی بھی مکمل طور پر رضامند ہیں۔ امی گرین سگنل دے چکی ہیں۔" وہ شرارت سے آنکھیں مٹکاتے ہوئے بختاور کو دیکھ رہی تھی جو اپنی ہی کسی دنیا میں مگن تھی۔

"آج سلجوق کا برتھ ڈے ہے۔ او مائی گاڈ! میں کیسے اس کا برتھ ڈے بھول گئی؟ وہ مجھ سے ناراض ہو گا۔ میں نے اسے وش بھی نہیں کیا۔"

"تم کن سوچوں میں گم رہنے لگی ہو۔" سارہ نے اس کا شانہ ہلایا تھا۔

"کچھ نہیں۔" پھیکی مسکراہٹ سے کہتے ہوئے وہ ایکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مجھے لگتا ہے میں اپنا سوٹ بوتیک میں ہی بھول آئی ہوں۔"

جھوٹ بولتے ہوئے اسے خود اپنی آواز لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔

"میں بہت تھکی ہوئی ہوں اور اب مجھے کہیں نہیں جانا۔" نادیہ نے فوری ردعمل ظاہر کیا تھا۔ اسی ردعمل کو ہتھیار بنا کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

"تم دونوں پیپیں لڑاؤ' میں بس یوں آئی۔" چٹکی بجاتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔

سلجوق کے لیے گفٹ اور کیک پیک کراتے ہوئے اسے ایک گھنٹہ لگ گیا تھا۔ اس کے آفس بلڈنگ میں داخل ہوتے ہوئے اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے آفس میں نہیں ہو گا۔ اکا دکا لوگ ابھی بھی آفس میں مستعدی سے بڑی عجلت میں اپنا کام نبٹا رہے تھے۔

اس کی سکریٹری نے اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی سلجوق کے آفس میں آچکی تھی مگر تب سلجوق اس کے ہمراہ تھا۔ ایک بے نام سی جھجک نے اس کے قدموں کی رفتار سست کر دی تھی۔

"سر اندر ہیں۔ شاید آپ کا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ آئی مین' اس وقت تک وہ چلے جاتے ہیں۔" اس نے اپنے سابقہ جملے کی وضاحت دیتے ہوئے وال کلاک کی سمت اشارہ کیا تھا جو شام کے چھ بجا رہی تھی۔

آفس میں داخل ہوتے ہی اندھیرے نے اس کا استقبال کیا تھا۔ چند ساعت بعد وہ اندھیرے میں دیکھنے

کے قابل ہوئی تھی۔ وزیٹر صوفے پر نیم دراز شاید وہ سو رہا تھا یا یونہی تھکاوٹ کی وجہ سے آنکھیں موندے ہوئے تھا۔ کوٹ دوسرے صوفے پر پڑا تھا۔ ٹائی بھی بے ترتیبی سے گلے میں جھول رہی تھی۔ وہ دبے قدموں چلتی ہوئی اس کی پشت پر آکھڑی ہوئی۔ وہ ہنوز اسی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے مدھم آواز میں اسے پکارا تھا مگر اس کے وجود میں کوئی جنبش نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بہت آہستگی سے اپنے دونوں ہاتھ اس کی آنکھوں پر رکھ دیے۔ اسے جیسے کسی کرنٹ نے چھو لیا تھا' وہ ایکدم اٹھ بیٹھا۔ بختاور خود اس کے اس ردعمل سے ڈر کر دو فٹ دور جا کھڑی ہوئی تھی۔ سلجوق نے بیٹھے بیٹھے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ آنکھوں کی سرخی سے صاف ظاہر تھا کہ وہ گہری نیند میں تھا۔

"آئی ایم سوری۔" وہ بے اختیار کہہ رہی تھی۔ جواباً" وہ مسکرانے لگا تھا۔

"سوری' فار واٹ۔" کھڑے ہوتے ہوئے اس نے بھاری آواز میں دریافت کیا۔

"میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔" وہ توجیہہ پیش کر رہی تھی۔

"ڈسٹرب۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔

"جانتی ہو تھوڑی دیر پہلے میں تمہیں خواب میں دیکھ رہا تھا۔ اب تم سوری ووری کرنا چھوڑ دو یار! ڈسٹرب تو میں ہو ہی چکا ہوں' تم کب تک اور کہاں تک سوری کرتی رہو گی۔" وہ اس کے بہت قریب کھڑا تھا۔ اس کے وجود سے اٹھتی کلون کی خوشبو اسے خود سے بے خود کرنے لگی تھی۔

"میں تمہیں وش کرنے آئی تھی۔" گفٹ اور کیک اسے تھماتے ہوئے اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ یہ خوابیدہ آنکھیں' خواب ناک ماحول اور اس کے ہاتھوں کا گرم لمس اس کے ہوش اڑا رہا تھا۔ وہ جلد از جلد یہاں سے چلے جانا چاہتی تھی۔ سلجوق نے کیک اور گفٹ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اب وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھا۔

"اب مجھے جانا چاہیے' میں دادو کو بتا کر نہیں آئی تھی۔" وہ اضطراری انداز میں اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔

"تو بتا دو۔" اس نے اپنی جیب سے موبائل فون نکال کر اسے تھما دیا تھا۔

"لیکن۔" بختاور نے کچھ کہنا چاہا' معاً" سلجوق نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا تھا۔

"زندگی کی خواہشیں جب یوں بن کہے پوری ہونے لگیں تو کون کافر ان دستک دیتی خواہشوں کے لیے در بند کرتا ہے۔" وہ خمار آمیز انداز میں سرگوشی کر رہا تھا۔ بختاور جیسے اس خواب ناک ماحول کا حصہ بننے لگی تھی۔ سلجوق کے ہاتھوں کا لمس اس کے شانے پر تھرتھرا رہا تھا۔ اندر کہیں جیسے جلتے الاؤ سرد ہو رہے تھے۔ احساسات کے خشک ہوتے سوتے سیراب ہو رہے تھے۔ معاً" ہوش مندی کا فقط ایک لمحہ اسے بے خودی کے آب ہو گیا' سمندر سے کھینچ لایا تھا۔ وہ پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼
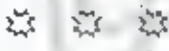
میں پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی' دیکھ تو وہ بھی مجھے رہی تھی مگر اس کی نظروں میں وہ تعجب اور تحیر نہ تھا جو اس وقت میری آنکھوں میں تھا۔ ایک دکھ تھا جس کی کیفیت نہ صرف اس کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی' بلکہ اس کے چہرے کا نقش نقش اضطراب کی لپیٹ میں تھا۔ اس کی موجودگی ہی میرے لیے تعجب خیز تھی۔ اس پر مستزاد فارینہ کا یہ انداز۔

"فارینہ! تم اور یہاں؟" مجھے اس کے اس طرح یہاں آجانے پر حیرت ہوئی تھی اور اس حیرت کے اظہار کے لیے میں نے ایک پل کا بھی تامل نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے اس لباس میں دیکھ کر میرے اندر ایک بار پھر خود ترسی کے الاؤ دہکنے لگے تھے۔ وہ خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کی آنکھوں کا جامد ٹھہراؤ میرے چہرے پر مرکوز تھا۔

میں اس کی نظروں کا ارتکاز سہہ نہیں پا رہی تھی۔ میں بے اختیار رخ موڑ کر اپنے عقب میں دیکھنے لگی۔

اس کے پیلے لباس سے اٹھتی ابٹن، مہندی کی خوشبو، ہاتھوں میں پہنے گجروں کی مہک، چوڑیوں کی کھنکھناہٹ۔ میں ان سب چیزوں سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ یہ آرائش اس نے خالصتاً "معیز کے لیے کی تھی۔ اپنے خیالوں میں، میں نے خود کو بارہا ایسے ہی حلیے میں دیکھا تھا۔ انبساط کے لمحے اپنا وجود کھو چکے تھے۔ آگے زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں دیکھنے کے لائق جو قدم قدم پر میرا حوصلہ بڑھاتا تھا۔ میری ہر کامیابی کو سیلیبریٹ کرتا تھا۔ میرے ہر خوف اور اندیشے منٹوں میں دور کردیا کرتا تھا۔ اب وہ کہیں نہیں ہوگا۔ وہ فارینہ کے پاس ہوگا۔ میری آنکھیں ڈبڈبانے لگی تھیں۔ میں نے اپنی زندگی سے معیز کو اپنی خاطر نہیں بلکہ خود سے وابستہ رشتوں کی خاطر خارج کیا تھا۔

ارتضیٰ جو اپنی دانست میں خود کو اس تمام معاملے کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا، میری نظر میں وہ ذمہ دار تھا بھی نہیں جو ذمہ دار تھے، وہ بہت خوش تھے۔ گھر کی فضا کا تناؤ ختم ہوگیا تھا۔ فارینہ اور معیز کی شادی کی ڈیٹ فکس ہوگئی تھی۔ بابا بہت خوش تھے۔ شاید اتنی خوش پھوپھو بھی نہیں ہوں گی۔ محبتوں نے مجھ سے محبتوں کا خراج وصول کیا تھا۔ لہٰذا مجھے ایک جمود کی نذر ہونا ہی تھا اور میرے اس جمود کو توڑنے کی سب سے پہلے سعی معیز نے کی تھی۔

"تم میرے ساتھ ایسا نہیں کرسکتیں عینی!" وہ حیران تھا۔ بےیقینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ ایسے جیسے یہ فیصلہ کسی نے مجھ سے زبردستی کروایا ہو۔

"تم تھوڑا سا ویٹ کرو۔ بلیو می عینی! میں ممی کو راضی کرلوں گا۔" اس کا یقین دلاتا لہجہ ہیجان آمیز تھا۔ اس کے ہاتھوں کی سخت گرفت میرے شانے کو تھامے ہوئی تھی۔ میں خاموش تھی۔ اگر کچھ کہتی، تب بھی معیز نے حیران ہی رہنا تھا۔

"تم کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟" اس بار اس نے مجھے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"لیو معیز!" میں چیخ پڑی تھی اور وہ الجھنے سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"تو آئی کانٹ ڈو دس۔ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔" جواباً وہ بھی چلایا۔

"تمہیں مجھے بھولنا ہوگا معیز! کیونکہ میں فیصلہ کرچکی ہوں، میں تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں تمہاری ماں کی بےجا نفرت نہیں سہہ سکتی۔ اگر تم سمجھ رہے ہو کہ مجھ میں حوصلہ ہے تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں اتنی باہمت نہیں ہوں۔ وہ اب بھی جب ان کا جی چاہے ہمارے گھر میں آکر اپنی نفرت کا اظہار کرسکتی ہیں اور تم سے شادی کے بعد تو ان کی نفرت......"

"ختم ہوجائے گی ان کی نفرت۔ آئی پرامس! میں انہیں تم سے محبت کرنے پر مجبور کردوں گا تم بس مجھے تھوڑا وقت دو۔"

"اور...... میں تمہیں یقین دلاتی ہوں وہ کبھی نہیں بدلیں گی۔ وہ مجھے کبھی قبول نہیں کریں گی۔" میرا مدھم اور مدلل لہجہ اسے ششدر کیے دے رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ مجھے یونہی دیکھتا رہا۔

"تمہیں مجھ پر ذرا بھی یقین نہیں؟" اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔

"مجھے تم پر یقین ہے معیز! لیکن پھوپھو پر نہیں۔"

"عینی! تمہیں میرے ساتھ زندگی گزارنی ہے، ممی کے ساتھ نہیں۔" اس بار اس کا انداز خفیف سی ناگواری لیے ہوئے تھا۔

"لیکن تمہارا ان سے تعلق ہے اور یہ تعلق کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔" میری آواز کسی بھی ارتعاش سے عاری تھی، لیکن میرے اندر جو طوفان بپا تھا، میں ہرگز بھی اس کی خبر معیز کو نہیں دینا چاہتی تھی۔

"میں نے کبھی نہیں سوچا تھا تم میرے ساتھ ایسا کروگی۔ تم مجھے اس حد تک کمزور کردوگی۔" وہ تاسف سے کہہ رہا تھا۔

"معیز! میں نے زندگی میں کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ آج مجھے اس فیصلے پر قائم رہنے دو۔ اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو تمہیں اسی محبت کا واسطہ، تم پلیز مجھے

بجھل جیت۔ میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گی۔ تمہاری محبت کی خاطر مجھے تمہاری ماں کی طرف سے ملنے والی نفرت نہیں چاہیے۔ ان کی نفرت ہر خوشگوار احساس پر حاوی رہنے والی ہے۔ تمہاری محبت اور نہ محبت کا احساس اس نفرت کی تاثیر کو ختم کر پائے گا۔ پلیز میں تمہارے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ مجھے کوئی اور قدم اٹھانے پر مجبور مت کرو جو بعد میں تمہیں پچھتاووں میں دھکیل دے۔" معیز کی سرد نگاہیں میرے آر پار ہو رہی تھیں۔

"تم نے مجھے محبت کے نام پر دھوکہ دیا ہے۔" اس کے انداز میں سردمہری اور سناٹا در آیا تھا۔

"میں تم سے اپنی محبت کی بھیک مانگ رہا ہوں اور تم مجھے دھتکار رہی ہو۔ مجھے تم سے محبت نہیں تھی عینی! محبت تو اس جذبے کے سامنے بہت حقیر سا لفظ ہے جو تمہارے حوالے سے میرے دل میں تھا لیکن اب مجھے تم سے محبت بھی نہیں ہے۔ ان فیکٹ مجھے اس وقت تم سے صرف نفرت ہو رہی ہے۔" میرے چاروں اور تاریکی چھا گئی تھی۔ میری محبت دوسروں کے احساسات کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ آنسو ایک تواتر سے میری آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

"جاؤ معیز! تمہیں اپنی محبت سے آزاد کرتا ہے۔" وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے کمرے سے جا چکا تھا۔ میرا پیار دہشت سے بھر گیا تھا میں اسے روکنا چاہتی تھی، مگر میں روک نہیں پائی۔

ایک ہفتے بعد مجھے فارینہ کے ذریعے خبر ملی تھی کہ ان دونوں کی انگیجمنٹ ہو چکی ہے۔ فون کی دوسری طرف سے وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ اس وقت وہ جن خوشگوار احساسات کی زد میں تھی، وہ میری گلوگیر آواز سے بھی کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ میں ایک بار پھر اپنی ذات کے پاتال میں لوٹ آئی۔ ان اندھیروں میں جو اب تمام عمر میرا مقدر رہیں گے۔

فارینہ کے فون کرنے کے باوجود میں اس کے گھر نہیں گئی تھی اور نہ ہی جانا چاہتی تھی۔ میں اس دلدل میں دوبارہ لوٹ جانا نہیں چاہتی تھی، جس سے نکلنے میں مجھے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اب میں یہ حقیقت قبول کر چکی تھی کہ معیز صرف اور صرف فارینہ کا ہوگا۔ ان دونوں کی شادی میں شرکت کرنے کا مطلب تھا میں ایک بار پھر تاریکی کی جانب سفر شروع کر دیتی۔ اپنے آپ کو خود ترسی اور زود رنجی میں مبتلا کر لیتی۔

اس روز بھی فارینہ کا مایوں تھا۔ میرا جانے کا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا۔ حالانکہ فارینہ کی ممی نے مجھے صبح ہی فون کر کے ان کی طرف سے شادی میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ مما، پاپا پھوپھو کی جانب سے شرکت کر رہے تھے۔ میں نے فارینہ کی ممی کو مثبت انداز میں ہاں تو کہہ دی تھی مگر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

سب لوگوں کے جانے کے بعد میں کچن میں آ کر کافی بنانے لگی، جب مجھے اپنے عقب سے ابھرتی عجیب سی خوشبو کا احساس ہوا تھا۔ فارینہ پر نظر پڑتے ہی مجھے اپنے اندر کسی چیز کے ٹوٹنے کا احساس ہوا تھا۔ چوڑیوں کی کھنکھناہٹ مجھے اپنے خیالوں سے کھینچ لائی تھی۔ وہ مجھے یک ٹک خاموش نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ میں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھی۔

"کیوں کیا تم نے میرے ساتھ ایسا؟" وہ عجیب سے لہجے میں کیا دریافت کر رہی تھی، میں سمجھ نہیں پا رہی تھی پھر اپنی دانست میں اس کے اس سوال کا مفہوم سمجھتے ہوئے میں نے اسے جواب دینا ضروری سمجھا تھا۔

"ایکچوئلی فارینہ! آفس میں آج کل جنرل اینول رپورٹ کی تیاری چل رہی ہے، اس لیے مصروفیت بہت ہے۔ بلیو می، میں ابھی آفس سے ہی آئی ہوں۔ دس بجے پھر مجھے ایک میٹنگ اٹینڈ کرنے جانا ہے۔ یوں سمجھو آج کل تو میں مشین ہی بنی ہوئی ہوں، لیکن فکر مت کرو، میں تمہاری شادی میں ضرور شرکت کروں گی۔" میری نظر میں اس سوال کا یہی جواب ہو سکتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ فارینہ اپنی شادی کی تیاریوں میں شمولیت نہ کرنے پر استفسار کر رہی

ہے۔" مگر اس تسلی آمیز جواب کے جواب میں بھی اس کے چہرے پر کوئی خوش کن اور دوستانہ انداز نہیں ابھرا تھا۔

"تم نے معیز کو مجھ سے شادی کرنے پر کیوں مجبور کیا؟" سوال کا اصل مفہوم بے نقاب ہو گیا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ فارینہ ایسا کچھ کہے گی۔ وہ مذاق نہیں کر رہی تھی' وہ بالکل سنجیدہ تھی۔ اس کی محبت کا غرور ٹوٹ گیا تھا جس کا جاں فزا احساس اس کے لبوں پر خوشگوار مسکراہٹ کا موجب تھا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی نمی اور چہرے کا اضمحلال میرے احساس جرم میں اضافہ کر رہا تھا۔

"تم کیا کہہ رہی ہو' میں سمجھ نہیں پا رہی۔" لاعلمی سے شانے اچکاتے ہوئے میں اپنے ضبط کو آزما رہی تھی۔

"تم اچھی طرح سمجھ رہی ہو' عینی! میرے سامنے ڈرامہ کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ معیز مجھ سے شادی کر رہا ہے لیکن محبت وہ تم سے کرتا ہے۔ یہ بات تمہارے بجائے اس نے مجھے بتائی اور تب جب میں اس سے شادی سے انکار کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں ہوں۔ ہم تو اچھی دوستیں تھیں نا تو پھر تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ اس ایک طرفہ محبت کے سہارے میں یہ پوری زندگی کیسے گزاروں گی۔ میں کیسے پل پل اس زندگی کے عذاب کو جھیلوں گی جس میں صرف میرے لیے سمجھوتا ہو گا' محبت نہیں ہوگی یہ بتایا تھا معیز نے مجھے۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ وہ رو رہا تھا اپنی محبت کے لیے' اس لڑکی کے سامنے جو خود اس کی محبت میں اس حد تک غرق ہے کہ جس کی شدتوں کا ادراک اسے خود بھی نہیں ہے۔ "تم نے کیوں کیا یہ سب؟" میں ایکدم رخ پھیر کر اپنے آنسوؤں کو روکنے کی سعی کر رہی تھی۔ میرے مزاحمتی الفاظ ان آنسوؤں میں بہہ گئے تھے۔ میرے پاس کچھ بھی کہنے کو نہیں بچا تھا۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ فارینہ کا سامنا کر سکوں۔

ایک بار پھر فارینہ کی آواز میرے عقب سے ابھری تھی۔ "تم نے مجھ سے دوستی کا تعلق نہیں نبھایا بلکہ میری زندگی کو صرف میرے لیے مذاق بنا دیا ہے۔ صرف ایک بار مجھے بتا دیتیں' یہی نہیں تھوڑا سا اشارہ ہی دیا ہوتا۔ میں تم دونوں کے بیچ سے ہٹ جاتی' شاید میں ہرٹ ہوتی۔ مجھے اذیت بھی ہوتی ہاں لیکن کم از کم میں اس اذیت کا سامنا کرنے سے تو بچ جاتی۔ جو ایک ناسور کی طرح مجھے تمام عمر اذیت دیتا رہے گا۔ تم دونوں کے بیچ آجانے کی اذیت اس اذیت سے کہیں زیادہ ہے جب میں معیز کو تمہاری خاطر چھوڑ دیتی۔ تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ مجھے یہ سب آج پتا چل رہا ہے' ان فیکٹ تم نے معیز نہیں بلکہ اذیت دی ہے مجھے۔ میں اس شادی سے انکار کر سکتی ہوں اور کرنا چاہتی ہوں لیکن جب اپنے پیرنٹس کے بارے میں سوچتی ہوں تو....." اس کی آواز بھرا گئی تھی۔ مگر چند لمحوں کے توقف کے بعد وہ ایک بار پھر گویا ہوئی۔

"آج سے پہلے میں کس قدر خوش تھی۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں کس قدر خوش نصیب ہوں کہ جسے چاہا اسے پا لیا' کوئی مشکل' کوئی رکاوٹ' کوئی رنجش درمیان میں نہیں آئی۔ آج سے پہلے محبت کو پا لینے کا احساس کس قدر تفاخر آمیز اور تسکین آمیز تھا میں نے اپنی محبت پالی تھی اور میری محبت نے مجھ سے کوئی امتحان نہیں لیا۔" وہ مغموم سے انداز میں قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی تھی۔

"کاش فارینہ! میں اتنی ہی عظیم ہوتی جتنا تم مجھے تصور کر رہی ہو۔ کاش میں دوستی کی خاطر محبت سے دستبردار ہونے کا احساس رکھتی' کاش میں ایسی ہی ہوتی جیسا تم مجھے سوچ رہی ہو۔ مگر تکلیف دہ بات یہ ہے کہ میں ایسی نہیں ہوں۔ میں بھی اتنی ہی خود غرض تھی' جتنا کہ کوئی بھی اپنی محبت کے لیے ہو سکتا ہے۔ مگر شاید وہ خود غرضی اس نفرت کے سامنے بھربھری ریت ثابت ہوئی تھی جو مجھے پھوپھو اور پاپا سے تھی۔ پھوپھو سے میں کبھی انتقام نہیں لے سکتی تھی۔ کیونکہ وہ معیز کی ماں تھیں' جس کے لیے میرے دل میں محبت ہی نہیں عزت بھی تھی۔ اور اس سے وابستہ رشتوں

سے انتقام لینا میرے لیے کبھی بھی تسکین آمیز نہیں ہو سکتا تھا۔ البتہ میں پاپا کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ میں زندگی کی آخری سانس تک انہیں اذیت دینا چاہتی تھی۔"

میں یہ سب فارینہ سے نہیں کہنا چاہتی تھی۔ اسے صرف اسی خوش فہمی کے لبادے کو اوڑھے رکھنا چاہیے تھا جو آج تو اس کے لیے ناخوشگوار تھا شاید اذیت آمیز بھی تھا۔ مگر حقیقت بتا کر میں اسے مزید تکلیف دینا نہیں چاہتی تھی، کم از کم اس کی نظروں میں میرا امیج بہت بلند تھا۔ وہ شاید مجھے بہت عظیم لڑکی تصور کر رہی تھی، جس نے دوستی کی خاطر اپنی محبت سے دست برداری کا اعلان کر دیا تھا۔ فارینہ کافی دیر تک میری آواز کی جھنکار رہی مگر پھر تھک ہار کر کچن سے باہر نکل گئی۔ میں نے اسے روکنا چاہا مگر بہت دیر ہو گئی تھی۔

***

اس نے اسے روکنا چاہا مگر بہت دیر ہو گئی تھی۔ اختیارات کا طوفان سب کچھ بہا کر لے گیا تھا اب جو کچھ بچا تھا وہ فقط شرمندگی کا احساس تھا۔ وہ دروازے سے کمر ٹکائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی جو اس وقت خود سے بھی نظر ملانے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ بختاور کی سسکیاں اس کے احساس جرم کو جلا بخش رہی تھیں۔

"بختاور...!" وہ اس کے نزدیک گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ الفاظ تھے کہ اپنے معنی کھو چکے تھے۔

"آئی ہیٹ یو!" وہ چلائی تھی۔

"لسن می!" اس نے اس کا ہاتھ تھام کر کچھ کہنا چاہا تھا۔

"ڈونٹ ٹچ می!" اس نے چیخ کر ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر رسید کیا تھا۔ اور پھر دروازہ کھول کر تقریباً دوڑتی ہوئی باہر نکل گئی تھی۔ سلجوق بھی دوڑتا ہوا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ وہ روتے ہوئے جس برق رفتاری سے سیڑھیاں پھلانگ رہی تھی اس نے سلجوق کو خوفزدہ کر دیا تھا۔

"بختاور پلیز! میری بات سنو۔" وہ حتی المقدور تیزی سے سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ بختاور نے ان سنی کر دی۔ پارکنگ سے گاڑی نکالتے ہوئے اس کی گاڑی اپنے پیچھے پارک ہوئی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ سلجوق کو ڈر تھا کہ وہ کہیں ایکسیڈنٹ نہ کروا لے۔ پہلے ہی اس کے ہاتھ کی تکلیف ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جب تک اس کے قریب پہنچا وہ گاڑی مین روڈ تک لے جا چکی تھی۔ وہ تاسف سے اپنے سے دور اوجھل ہوتی گاڑی کو دیکھ رہا تھا۔ بے اختیاری میں وہ جس گناہ کا مرتکب ہوا تھا اس نے اسے شرمندگی کی گہری کھائی میں لا پٹخا تھا۔ رہ رہ کر اسے آنسوؤں اور وحشت سے لبریز وہ آنکھیں یاد آ رہی تھیں نفرت کے اظہار نے اسے ان دیکھی آگ کی تپش میں لا کھڑا کیا تھا۔

وہ جب گھر پہنچی تو اسے ہر نظر استفسار کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس کے ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اسے اپنے وجود سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ کسی بت کی مانند بیڈ پر گرنے والے انداز میں بیٹھی تھی۔ وجود جیسے پتھر کا ہو گیا تھا۔ آنکھیں پتھرائے ہوئے انداز میں ساکت تھیں، ذہن مفلوج ہو چکا تھا۔

معاً اس کی نظروں کے سامنے چند لمحوں پہلے کی فلم سی چلنے لگی تھی۔ سکتہ ٹوٹ گیا تھا، دانستہ یا غیر دانستہ وہ گناہ کی مرتکب ٹھہری تھی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ مگر... زمین تو اس کے پیروں تلے تھی ہی نہیں، وہ تو جیسے ایک خلا میں معلق تھی، خالی ہاتھ، خالی دامن سمیت کل تک اپنی ذات کا غرور، کردار کا فخر اس کے ہمراہ تھا اور آج وہ سب کچھ گنوا چکی تھی۔ ایسا اس شخص نے کیا تھا جو اس سے محبت کا دعوے دار تھا۔

آنسو ایک تواتر سے اس کے گالوں پر پھسل رہے تھے۔ "کاش یہ بہتے آنسو میرا سابقہ تفاخر مجھے لوٹا دیں۔" تمناؤں کا گرداب اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا جس میں پھنسی وہ ابھر اور ڈوب رہی تھی۔ کوئی ہاتھ اسے کھینچنے والا نہ تھا۔ آنسو بہہ رہے تھے اور

بے وقعت ہو رہے تھے۔ معاً" اس کے اندر باہر ابھرتے سناٹے میں موبائل کی بیپ گونجی تھی۔ وہ ایسے ہی بیٹھی رہی' بے حس و حرکت یہاں تک کہ موبائل کی بیپ بازگشت کی صورت اختیار کر گئی۔ کچھ دیر یہ بازگشت اس کے اندر باہر گونجتی رہی۔ اور ایک دم سناٹا چھا گیا۔ ایک گھٹن کا احساس اسے اپنے وجود کی بوسیدگی کا احساس دلا رہا تھا۔

اسے اپنے وجود پر سلجوق عمر کے ہاتھوں کا لمس رینگتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس کے نازک وجود میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ کیسی قیامت بیت گئی تھی اور وہ اپنے وجود کے تمام اختیارات انجانے میں اس شخص کو سونپ گئی تھی۔ جسے اس نے اپنے دل کے اختیارات سونپے تھے۔ جسے اس نے چاہا تھا' محبت کی تھی اور اب محبت کے نام پر وہ سب کچھ گنوا چکی تھی۔

اسے اپنے وجود سے تعفن اٹھتا محسوس ہوا تھا۔ اور پھر وہ زیادہ دیر تک اس سرانڈ کو برداشت نہیں کر سکی تھی۔ واش روم میں شاور کے نیچے کھڑے ہو کر وہ جیسے متعفن وجود سے نجات پا لینا چاہتی تھی۔ بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ وہ ان لمحوں کی تپش میں جل رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے اس کا وجود دیوار پر دے مارا ہو۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے سنگسار کیا جا رہا ہو۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک دہکتے ہوئے الاؤ میں اسے پھینک دیا گیا ہو۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک بپھرے ہوئے سمندر کے بھنور میں آ پھنسی ہو۔

ٹیلی فون کی بیل ایک بار پھر بجی تھی۔ اس بار وہ اس آواز کو نظر انداز نہیں کر پائی تھی۔ ریسیور اٹھاتے ہی اسے سلجوق عمر کی آواز سنائی دی تھی۔

"پلیز بختاور فون مت رکھنا۔" وہ لجاجت سے کہہ رہا تھا۔

"میں تمہاری شکل دیکھنا تو کیا تمہاری آواز بھی سننا نہیں چاہتی۔ مجھے خود اپنے آپ سے شدید نفرت ہو رہی ہے کہ میں نے تم جیسے شخص سے۔" وہ شدت سے رونے لگی تھی۔ اس کی سسکیوں کی آواز سلجوق عمر کے دل پر اثر کر رہی تھی۔

"پلیز ایسے مت روؤ بختاور مجھے تکلیف ہو رہی ہے۔ تم کسی قسم کا گلٹ فیل مت کرو۔ جو کیا ہے میں نے کیا ہے' گناہ مجھ سے سرزد ہوا ہے اور اس کی تلافی بھی میں ہی کروں گا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ آج' ابھی اور اسی وقت۔" شاید وہ اس کی جانب سے کسی ممکنہ ردعمل کے خطرات کو بھانپ کر اسے احساس جرم سے نکالنے کی سعی کر رہا تھا۔

"شادی!" وہ چلائی۔ "میں خود سے بھی نظر ملانے کی ہمت نہیں پا رہی' اور تم شادی کی بات کر رہے ہو' مجھے تم سے شادی نہیں کرنی' ان فیکٹ' اب میں جینا نہیں چاہتی۔ میں اس گناہ کے احساس کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتی۔"

اس نے فون پٹخ دیا تھا۔ اس کے بعد کئی بار فون بجا تھا لیکن وہ بے حس و حرکت اسے بس دیکھتی ہی رہی تھی۔

اگلے دو روز تک وہ اس بارے میں سوچ سوچ کر اعصاب زدگی کا شکار ہو گئی تھی۔ نتیجہ بخار کی صورت میں نکلا تھا۔ دادو متفکر سی اس کے سرہانے بیٹھی تھیں۔

"ہزار بار کہا ہے کہ یوں بن سنور کے گھر سے نہ نکلا کرو۔ اب لگ گئی نہ کسی کی بری نظر۔" وہ تھرما میٹر سے اس کا بخار چیک کرتے ہوئے مسلسل بڑبڑا رہی تھیں۔ آج سے پہلے دادو کا یہ متفکر انداز اس کے لیے فخریہ ہوا کرتا تھا اور اب یہ محبت' تفکر اس کے لیے خواب تھا۔ "اگر انہیں پتا چل جائے کہ میں نے ان کی تربیت کو خاک میں ملا دیا ہے' تو شاید یہ مجھ سے ہر ناتا توڑ لیں' اپنی آنکھوں سے بہتے پانی کو چھپانے کی خاطر اس نے اپنے بازو کو آنکھوں پر رکھ لیا تھا۔ گھر کا ایک ایک فرد اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔ لاڈ اٹھا رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو ذلت کی انتہا پر پا رہی تھی۔

دادو نماز پڑھ رہی تھیں۔ جب ملازمہ نے اسے کارڈلیس لا کر تھما دیا تھا۔

"آپ کی کسی دوست کا فون ہے۔" مؤدب انداز

میں کہتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ طوعاً" کرہاً" اسے فون اپنے کان سے لگانا پڑا تھا۔

"بختاور!" وہ بختا اس آواز سے دور بھاگ جانا چاہتی تھی یہ آواز اتنا ہی اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

"آئی ایم سوری بختاور! مجھے معاف کر دو۔ پلیز صرف ایک بار۔" وہ ملتجی تھا۔ وہ خاموش رہی۔ آنسو ایک بار پھر گالوں سے ہوتے ہوئے تکیہ میں جذب ہونے لگے۔

"معاف کرنے کے لیے میرا زندہ رہنا ضروری ہے۔ میں فی الحال اس ذلت کے ساتھ زندگی کو برداشت کرنے کی کوشش میں لگی ہوئی ہوں جس روز یہ کوشش بے سود ثابت ہوئی میں اس روز زندگی سے ہر تعلق توڑ لوں گی۔" سرد مہری سے کہتے ہوئے وہ سرد و شیانہ انداز اختیار کیے ہوئے تھی۔

"تم ایسا کچھ نہیں کرو گی بختاور! اور تم ایسا کرو گی بھی کیوں۔ تم قصور وار تو نہیں ہو۔ میں سزا کا مستحق ہوں۔ پلیز! ایسا کر کے میرے عذاب میں اضافہ مت کرو۔" بختاور پر ہمیشہ کی طرح اس ملتجی لہجہ کا اثر نہیں ہوا تھا۔

"مجھے آئندہ فون مت کرنا۔ ورنہ میں کل کی مرتی آج مر جاؤں گی۔ جب جب تم مجھے فون کرتے ہو میرے مرنے کا ارادہ اتنا ہی مضبوط اور مستحکم ہونے لگتا ہے۔" دوسری جانب ایکدم خاموشی چھا گئی۔

"کس کا فون تھا؟" دادو نے سلام پھیر کر دریافت کیا تھا۔ وہ ایکدم گڑبڑا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"سارہ کا!" مختصراً" بتاتے ہوئے وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

نیند سے تو جیسے ناتا ہی ٹوٹ گیا تھا۔ آنکھیں بند کرتی تو وہ قیامت خیز لمحے کسی فلم کی طرح نگاہوں کے سامنے چلنے لگتے اور کھولتی تو زندگی ایک عذاب اور بوجھ محسوس ہونے لگتی۔ اسی کشمکش میں حمزہ بھائی کی شادی بھی خیریت سے گزر گئی۔ اس کی حد سے زیادہ سنجیدگی اور خاموشی کو ہر فرد نے بری طرح محسوس کیا تھا۔ یہاں تک کہ پاپا نے حمزہ بھائی کی مہندی کے فنکشن پر اسے لوگ بھی دیکھ کر بیٹھی تھی وہ محض انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ

کیسے ساتھ انداز میں ہنس بول سکتی تھی۔ کیسے سب کے ساتھ گھل مل کر گپیں لڑا سکتی تھی۔ وہ جب کسی سے بات کرنے کی کوشش کرتی تو وہ اپنے آپ کو کسی سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہیں پاتی تھی۔ ہر نظر اسے اپنا وجود کھوجتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہ اپنے کمرے تک محدود ہونے لگی۔ اپنے سمسٹرز کے پیپرز بھی وہ محض ممی پاپا کی وجہ سے دے رہی تھی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو ان کے سوالات اسے ایک نئی مصیبت میں ڈال دیتے۔

"جب سے نادیہ نے تمہاری شادی کی بات چھیڑی۔ تب سے تم بہت خاموش رہنے لگی ہو۔" سارہ نے اپنی جانب سے اس کی خاموشی کا سبب تلاش کیا تھا۔ جواباً" وہ خاموش رہی۔

"کوئی پرابلم ہے بخت! تم مجھ سے شیئر کر سکتی ہو۔" سارہ کا اکسا دینے والا انداز بھی اسے کچھ بولنے پر مجبور نہیں کر سکا تھا۔ نہ اس نے اس کی کسی بات کی تصدیق کی تھی اور نہ ہی تردید کرنے کی کوشش کی تھی۔

"اچھا ایسا کرو، آج تم میرے ساتھ میرے گھر چلو، خوب مزے کریں گے۔ کوئی اچھی سی مووی دیکھیں گے۔ شاندار سا کھانا کھائیں گے۔ خوب باتیں کریں گے۔" سارہ پروگرام سیٹ کر رہی تھی جواب میں فقط اس نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تھا۔

ڈرائیونگ کے دوران سارہ ہی بولتی رہی تھی۔

اپنے کمرے میں جاتے ہی سارہ نے اپنی کلکشن اس کے سامنے رکھ دی۔

"اب بولو کون سی فلم دیکھیں؟؟"

"کوئی بھی لگا دو۔" اس نے بہت دھیمے لہجے میں کہا تھا۔ سارہ اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔

کھانا کھانے کے دوران بھی وہ خاموش رہی تھی معاً" میٹھا کھاتے ہوئے وہ ایکدم منہ پر ہاتھ رکھ کر واش روم کی جانب لپکی۔ سارہ بھی تشویش آمیز انداز میں

اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ واش بیسن میں قے کرتے ہوئے سارہ اس کی پشت سہلا رہی تھی۔ اس کی پریشانی اور تشویش بختاور اس کے لمس سے بھی محسوس کر سکتی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' میں آپی کو بلاتی ہوں آج ان کا ہاسپٹل سے آف ہے۔" سارہ اسے بازوؤں سے تھامتے ہوئے بیڈ تک لے آئی۔

"نہیں! میں ٹھیک ہوں۔" مدھم انداز میں کہتے ہوئے اس کی آواز اندرونی کمزوری کی غماز تھی۔

"خاک ٹھیک ہو' شکل دیکھو اپنی کیسی پیلی ہو رہی ہے اور آنکھوں کے گرد حلقے دیکھے ہیں تم نے؟" بختاور اس کا ہاتھ تھام کر اسے روک لی تھی۔ بدترین اندیشے درست ثابت ہونے جا رہے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں سارہ! تم کہیں مت جاؤ۔" وہ گلوگیر آواز میں کہہ رہی تھی اس کی آواز ہی بھرائی ہوئی نہ تھی' اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ سارہ اس کے انداز سے متاثر ہوتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی پھر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی۔

"نجانے بخت! مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے کہ تم کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہو اور ایسا تم آج نہیں کر رہیں گزشتہ پانچ چھ ماہ سے تمہارا ہر ہر انداز بدلا سا ہے' میرا خیال تھا کہ تم خود بتاؤ گی' لیکن کیا ہماری دوستی میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ہم ایک دوسرے سے کچھ بھی شیئر کر سکیں' کیا میں نے اور نادیہ نے تم سے کبھی بھی کچھ بھی چھپانے کی کوشش کی؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ تم نے ہمیں کبھی دوست ہی نہیں سمجھا۔" وہ یاسیت سے کہہ رہی تھی۔ بختاور چاہتے ہوئے اس کے ان خیالات کی تردید نہیں کر پا رہی تھی۔

"تمہاری وجہ سے تمہاری دادی بھی پریشان ہیں' کل جس طرح وہ مجھ سے تمہارے بارے میں کرید کرید کر پوچھ رہی تھیں' مجھے شدید شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا تھا' ان کا خیال تھا کہ میں تمہاری دوست ہونے کی حیثیت سے تمہاری پریشانی' تمہارے خیالات سے اچھی طرح واقف ہوں۔" ایک تلخ سی مسکراہٹ کے بعد ایک بار پھر گویا ہوئی تھی۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کروں گی لیکن اتنا ضرور جانتی ہوں تمہارا یہ بدلا ہوا انداز سلجوق مرزا والے واقعے کے بعد نظر آیا ہے۔" وہ ایک دم چونک کر سارہ کو دیکھنے لگی تھی۔ کاش وہ اپنا بے وقوفوں والا احساس گناہ کر چھوٹ چھوٹ کر رونے لگی محبت نے اسے ذلت کی دلدل میں دھکیل دیا اور کچھ بولنے پر مجبور کر دیا تھا' کیا اس کا تھا اور کیا پایا تھا۔

چند ثانیوں بعد اس نے سارہ کو مخاطب کیا تھا اور وہ بھی تب جب اس نے خود کو کسی فیصلے پر پہنچتا پایا تھا۔

"تم کیا سننا چاہتی ہو سارہ! وہی جس کے بعد تم مجھ سے نفرت کرو گی ہاں لیکن اب مجھ میں بھی اتنی سکت نہیں کہ میں اس عذاب کا بوجھ تنہا برداشت کر سکوں۔ اب تو سب کچھ عیاں ہونے والا ہے' کچھ بھی چھپا رہنے والا نہیں ہے۔" بے ربط انداز میں کہتے ہوئے وہ سارہ کو عجیب سی لگ رہی تھی بختاور کا یہ انداز اس کے لیے اچنبھے کا باعث تھا۔

"کیا عیاں ہونے والا ہے بختاور!" وہ متحیر سی پوچھ رہی تھی۔

"وہی جس کے بعد مجھ سے سب نفرت کریں گے' تم بھی دادو' ممی' ڈیڈی اور شاید نادیہ تو میری شکل دیکھنے کی بھی روادار نہ ہو گی۔" اس کے چہرے پر عجیب سی وحشت تھی۔

"بختاور! پہیلیاں مت بجھاؤ۔"

اس کے بعد بختاور کا خاموش ہونا ناممکن ہی تھا۔ سارہ نے اس سے سب کچھ اگلوایا تھا۔ وہ روتے ہوئے ایک ایک لمحے سے آگاہ کرتی چلی گئی' سلجوق سے ہونے والی ملاقاتیں' اس سے محبت اس کی جانب سے ملنے والی اپنائیت' توجہ اور اہمیت۔ وہ بھیانک لمحے' سب کچھ' وہ کچھ چھپا نہیں پائی سارہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہی تھی' اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں میں بے یقینی کا تاثر نمایاں تھا۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے اس کا ہاتھ جھٹکتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ نجانے کتنے ثانیوں تک دونوں

کے مابین خاموشی حائل رہی' اس خاموشی میں ایک بار پھر بختاور کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔

"شٹ اپ! بختاور!" سارہ کی زہرخند آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی "کیوں رو رہی ہو تم؟ تمہیں تو اپنے اس کارنامے پر فخر کرنا چاہیے۔ گردن اکڑا کر اپنے والدین کا سامنا کرنا چاہیے' یہ رونا دھونا اب کس لیے کشتیاں تو جلا ہی چکی ہو تم۔

ان فیکٹ بختاور! تم آئی بی اے کی ان لڑکیوں سے گئی گزری ہو' جن سے تمہیں نفرت تھی اور اپنی نفرت کا اظہار تم برملا کیا کرتی تھیں۔ مجھے تم سے نفرت ہو رہی جیسا کہ تم نے کہا' نہ مجھے تم پر غصہ آرہا ہے تم تو میرے ترس کے قابل بھی نہیں ہو۔ بعض لوگوں کو قدرت سب کچھ دیتی ہے اور جب وہ ناشکرا پن کرتے ہیں تو ان کا انجام تمہارے جیسا ہوتا ہے۔ کس چیز کی کمی تھی تمہارے پاس' محبت کرنے والے پیرینٹس' کیئرنگ دادو' لاڈ اٹھانے والے بھائی اور عشق کرنے والا منگیتر۔ ثاقب حسن کے وجود سے باخبر ہونے کے باوجود تم نے سلجوق عمر سے ملاقاتیں کیں۔ اس نے تم سے کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے اور تم سب کچھ فراموش کر کے اس کی محبت میں گرفتار ہو گئیں۔ آئی ایم سوری بختاور! یہ بات اتنی آسانی سے ہضم ہونے والی نہیں ہے۔ کم از کم میرے لیے۔ تم نے ایک بار بھی ثاقب کے بارے میں نہیں سوچا۔ یہ جاننے کے باوجود کہ چند ماہ بعد تمہاری ان سے شادی ہونے والی ہے۔ اس کی فیملی کے بارے میں سوچنا تو کجا تم نے اپنی فیملی کے بارے میں بھی نہیں سوچا' تم اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہو بختاور!"

وہ صحیح کہہ رہی تھی اس نے ایک بار بھی ثاقب اور اس کی فیملی کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ سلجوق کی محبت کے اظہار کے بعد سوچنے کی گنجائش نکلتی بھی نہیں تھی' گرم گرم آنسو اس کے گالوں سے ہوتے ہوئے اس کی گود میں گر رہے تھے۔

"درحقیقت تم میں اور آئی بی اے کی ان لڑکیوں میں واضح فرق تھا جن سے تمہیں چڑ تھی' وہ سب سلجوق عمر کے لیے اپنی عزت نفس تک گنوانے کو تیار تھیں مگر تم تو ان سے بھی بازی لے گئیں۔ تم نے اپنی عزت نفس کے ساتھ ساتھ سب کچھ گنوا دیا۔ سب کچھ۔" وہ تاسف سے سر ہلا رہی تھی۔ معاً بختاور کے زرد پڑتے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم خاموش ہو گئی اس کے ہاتھ پاؤں بری طرح سرد ہو رہے تھے۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔ مجھے تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے جانا ہوگا۔" وہ پرتشویش انداز میں اسے زبردستی کھڑا کرتے ہوئے بولی مگر اپنا آپ سارہ کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے وہ سسکیاں بھرتی ہوئی زمین پر بیٹھ گئی۔

"مجھے ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا' بس تم مجھے کہیں سے پوائزن لادو۔ مجھے زندہ نہیں رہنا۔ مجھے زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ میں تمہاری نفرت سہہ نہیں پا رہی سارہ! تو کیسے اپنے گھر والوں کی نفرتوں کا سامنا کروں گی۔ پلیز مجھ پر یہ آخری احسان کردو۔ مجھے مرنے دو۔ یقین کرو یہی قابل قبول حل ہے۔ میں ڈاکٹر کے پاس جا کر ذلت و رسوائی کا طوق اپنے گھر والوں کی گردنوں میں نہیں ڈالنا چاہتی۔" وہ اس کا ہاتھ تھام کر بری طرح سسک رہی تھی۔ سارہ نے ایک دم اسے اپنے شانے سے لگالیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کا غصہ اور تنفر جیسے کافور ہو گیا تھا۔ وہ اس کا سر ملامت آمیز انداز میں سہلاتے ہوئے بولی۔

"نہیں بختاور! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ جو شخص اس تمام واقعہ کا ذمہ دار ہے' مرنا اسے چاہیے۔ اس مسئلے کا اب ایک ہی حل نکلتا ہے۔" پرسوچ انداز میں کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی' بختاور سوالیہ انداز سے اس کی سمت دیکھ رہی تھی۔

"شادی!" اس کی نظریں کسی غیر مرئی نقطہ میں الجھی ہوئی تھیں۔

"تمہیں سلجوق عمر سے شادی کرنا ہوگی۔" وہ وضاحتی لہجے میں گویا ہوئی "وہ اگر اب بھی تم سے محبت کرنے کا دعوے دار ہے تو وہ تم سے شادی ضرور کرے گا اور اگر اس نے یہ سب وقت گزاری کے تحت کیا

ہے تو..." اس کے نامکمل فقرے کا مفہوم بخوبی سمجھ جاتی تھی۔

"تمہیں پھر بھی اسے شادی کے لیے مجبور کرنا ہوگا۔ میں جانتی ہوں اس وقت تم کس قسم کی اندرونی کیفیات سے دوچار ہو' لیکن اس کے پاس وہ تمہیں بمشکل مرتے ملتا ہوگا۔ ایک بار اس کے بیچ میں تمہارے بیچ جس سے ملاقات کرلیں' اس کے بعد دیکھیں گے کیا کیا جاتا ہے۔" وہ نظریں جھکائے خیالات کے گرداب میں الجھی تھی' اس کا ذہن متضاد کیفیات سے دوچار تھا۔

☼ ☼ ☼

میرا ذہن متضاد کیفیات سے دوچار تھا۔ مسز شیرازی بغور میری جانب دیکھ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟ کیا سوچ رہی ہو؟" وہ متفکرانہ انداز میں میرے سامنے آبیٹھیں' میں انہیں بس دیکھ کر رہ گئی تھی۔

"اگر تم یہ سوچ رہی ہو کہ تم اپنی فرم میں شرکت نہ کر کے زیادہ آفاق کے جذبات کی نفی کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گی تو میری جان میں تمہاری اس خام خیالی کی داد نہیں دوں گی۔" میں ایک گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

گزشتہ دو روز سے میں جس ذہنی اضطراب کا شکار تھی اس کی باقیات اب بھی میری آنکھوں سے ہویدا تھیں۔ معیز کی فارینہ سے شادی ہو چکی تھی اور یہ وہ حقیقت تھی جسے مجھے ہر حال میں قبول کرنا تھا اور میں قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ محبت یک طرفہ ہو یا دو طرفہ ہمیشہ تکلیف دہ ہوتی ہے' اور میرے لیے یہ تکلیف اس لیے بھی زیادہ تھی کیونکہ میں نے معیز سے محبت نہیں کی تھی۔ اس محبت کو اپنے احساسات کے ذریعے اپنے اندر پروان چڑھایا تھا' پل پل اس محبت کی جڑوں کو مضبوط کیا تھا اور آج مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے ایک غلط شخص کے ساتھ محبت کی تھی' میں نے اپنے ساتھ ساتھ معیز کو بھی فریب دیا تھا۔ میرے لیے اس

دنیا کے کسی بھی کونے میں محبت نہیں تھی اور یہ بات میں بچپن سے جانتی تھی' اپنے نکاح سے چند گھنٹے قبل معیز نے مجھے فون کیا تھا۔ اس کی سسکیاں اب بھی میری سماعتوں میں محفوظ تھیں۔

"میرے ساتھ یہ سب مت کرو عینی! تم جانتی ہو کہ تم دنیا کا واحد لڑکی ہو جس سے میں اپنی محبت کا اظہار کر سکتا ہوں۔ میں فارینہ کے ساتھ وفادار نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے ساتھ اچھی زندگی نہیں گزار سکتا۔ ہم دونوں اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہم دونوں اب بھی اکٹھے رہ سکتے ہیں بس تم ایک بار ہاں کہہ دو' سب ٹھیک ہو جائے گا' میں سب کچھ سنبھال لوں گا فارینہ کی فیملی کو بھی اور فارینہ کو بھی۔"

"لیکن! میں ایسا نہیں چاہتی۔" میری آواز کسی بھی قسم کے اضطراب اور ارتعاش سے عاری تھی۔ دوسری طرف سے ایک دم خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ایک بار پھر معیز کی آواز ایئر پیس سے آئی۔

"مجھے تم سے محبت نہیں کرنی چاہیے تھی' تم ایک ایسی بزدل لڑکی ہو جس نے اپنی بزدلی کو میری راہ کا کانٹا بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے دس سال تمہاری اندھی محبت کے نذر کر دیے۔"

میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں بچوں کی طرح گڑگڑا کر روؤں۔ میری دھندلی آنکھوں میں گزشتہ دس سال کسی فلم کی طرح چل رہے تھے۔ دس سال پہلے چند خدشات میری محبت کے ساتھ سانس لیتے تھے اور آج دس سال بعد انہی خدشات کے سبب میری محبت دم توڑ گئی تھی۔ اب نہ تو معیز کے نزدیک میری کوئی اہمیت رہی تھی اور نہ ہی میرے آنسوؤں کی۔ قرۃ العین کی حیثیت معیز حیدر کی آنکھوں سے غائب ہو گئی تھی' اس کی محبت اپنے معانی کھو چکی تھی۔ وہ اب مجھے اپنے فیصلے سے باز رکھنے کی سعی نہیں کر رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا تھا۔ نکاح سے چند منٹ قبل ایک بار پھر اس کا فون آیا تھا۔ اس کا امید سے لبریز ہیجان آمیز

لہجہ میرے اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ اپنے وجود کی بکھری کرچیاں سمیٹتے سمیٹتے میرے ہاتھ شل ہو گئے تھے اور نجانے کیوں معیز میری اس درماندہ کیفیت سے بے خبر تھا۔

"تم بنتی! میرے لیے ایک ناسور بن گئی ہو تم اتنی بے حس ہو سکتی ہو میں کبھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ تم دس سال پہلے بھی اتنی ہی بے حس تھیں اور میں تمہاری بے حسی کو تمہاری معصومیت پر محمول کرتا رہا اپنی دانست میں تم مجھے اپنے باپ پر قربان کر رہی ہو درحقیقت تم رشتوں کو پرکھنے کا فن ہی نہیں جانتیں۔ تمہاری حماقت آمیز خوش فہمی کی عمارت کسی روز ضرور زمین بوس ہو گی۔ تمہارا کیا خیال ہے تمہارے اس عمل سے تمہارے باپ پر کوئی فرق پڑے گا۔" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔

"اگر تم مجھ سے بھاگ کر شادی کر لیتیں' انہیں فرق تب بھی نہ پڑتا۔" وہ مجھے جھڑک نہیں رہا تھا بلکہ وہ تو مجھے آئینہ دکھا رہا تھا۔ اس آئینے سے جھانکنے والا ہر منظر میں بخوبی دیکھ سکتی تھی۔ وہ جو کہہ رہا تھا وہ سچ تھا مگر اس کا یہ سچ میری زندگی سے زیادہ کڑوا نہیں تھا۔ میں نے اپنی ذات کے حوالے سے کوئی خوش فہمی نہیں پالی تھی کہ جس کے ٹوٹنے پر مجھے کسی دکھ کا احتمال ہوتا۔ یہ فیصلہ مجھ سے نہ تو پاپا کی خاطر سرزد ہوا تھا اور نہ ہی ارتضیٰ اس کی وجہ ثابت ہوا تھا۔ میرا اعتماد' میری عزت نفس' میری زندگی اور اس سے وابستہ خواب اور خواہشات' میرا زعم یہ سب ابھی بھی میرے اندر کہیں باقی تھا اور اگر میں معیز کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوتی تو مجھے ان سب چیزوں سے محروم ہونا پڑتا۔

"معیز! میں نے تمہیں اپنی زندگی سے نکال دیا ہے اگر تم بھی ایسا کرو گے تو مطمئن رہو گے۔" کسی ہچکچاہٹ تردد نے میری زبان گنگ نہیں کی تھی۔ بس یہ آنسو تھے جو میری تکلیف کو کم نہیں ہونے دے رہے تھے۔ میرا دل جن قیامتوں کے زیر تھا۔ اس سے میں کسی کو بھی باخبر نہیں کرنا چاہتی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی اگلے روز میں نے ڈنر پر جانے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اگر زندگی سے منسلک حقائق کا سامنا کرنا تھا تو مجھے زیاد آفاق کا بھی سامنا کرنا تھا۔ تیار ہونے کے بعد میں ابھی ارتضیٰ سے شیرٹن ہوٹل میں ڈراپ کرنے کے بارے میں کہنا ہی چاہتی تھی۔ جب میرے سیل فون پر زیاد آفاق کا نمبر جھلملانے لگا۔

"اگر آپ تیار ہو چکی ہیں تو باہر تشریف لے آیئے پچھلے پینتالیس منٹ سے میں باہر سفر کر رہا ہوں۔" میں ایک لحظہ کے لیے ٹھٹک سی گئی نجانے کیوں میرا ذہن زیاد آفاق کی جانب سے اس شدت تک رسائی نہیں کر پا رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ ایک بار پھر گویا ہوا۔

"تم یقیناً" میری آمد کی توقع نہیں کر رہی تھیں۔" اس کا قیاس بجا تھا لیکن پھر بھی میں نے اسے جواب نہیں دیا۔ میں نے کال ڈسکنیکٹ کر دی پھر مما کو اپنے جانے کی اطلاع دے کر باہر نکل آئی۔ اپنی گرے سوک سے ٹیک لگائے وہ یقینی طور پر میرا منتظر تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کا چہرہ ایک دم کھل گیا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس نے میرے لیے فرنٹ ڈور وا کر دیا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"تھینکس فار کمنگ۔" جواب میں' میں مروتاً" بھی مسکرا نہیں سکی تھی۔ ابھی تو معیز میری زندگی سے نکلا تھا مگر اس کا تصور یقیناً" اب بھی میں خارج نہیں کر سکی تھی۔ اتنی جلدی زیاد آفاق کے جذبات کی پذیرائی میرے لیے ایک ناممکن عمل تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں اس کے ساتھ بیٹھی تھی وہ استحقاق نہ سہی جس کا زیاد آفاق خواہش مند تھا مگر وہ پھر بھی مطمئن تھا' خوش تھا' خوش تو مجھے بھی ہونا چاہیے تھا میں وہ کر رہی تھی جس کی پاپا شدید ترین مخالفت کرتے رہے تھے۔ میں اکیلی ایک غیر مرد کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھی تھی لیکن پاپا کو زک پہنچانے کا خیال بھی مجھے مطمئن نہیں کر سکا تھا۔ تسکین کا احساس کہیں بھی نہ تھا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے حال چال دریافت

کرنے کے بعد دوسری کوئی اور بات نہیں کی تھی وہ بہت خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

ڈنر کے دوران اس نے جس طرح اپنے والد کو مجھ سے متعارف کروایا تھا اس سے میں اندازہ لگا سکتی تھی کہ میرا تذکرہ اس نے گھر میں کس طرح کیا ہوا تھا۔ اس کے والد کا گرم جوشی سے لبریز رویہ میرے لیے باعث حیرت تھا۔ زیاد آفاق کا اطمینان بھی کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا اس کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ میرے سرد رویے کے باوجود کسی بھی قسم کے خدشات میں مبتلا نہ تھا بلکہ میرے موجودہ مزاحتی ردعمل کی اس کی نظر میں کوئی اہمیت نہ تھی۔ اسے اپنے جذبوں کی قبولیت کا سو فیصد یقین تھا اور اسی یقین کے سہارے وہ ہر ایک کا مجھ سے مسکرا مسکرا کر تعارف کروا رہا تھا۔ ڈنر کے اختتام پر وہ ایک بار پھر میرا منتظر تھا۔

"چلو! محترم اپنی ذمہ داری نبھانے کو تیار کھڑے ہیں۔" مسز شیرازی نے شرارتی انداز میں کہتے ہوئے اس کی جانب اشارہ کیا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے نزدیک چلی آئی۔

"پھر تم نے کیا سوچا؟" گاڑی ریورس گیئر میں ڈالتے ہوئے وہ بغیر کسی تمہید کے گویا ہوا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ کس بارے میں بات کر رہا ہے لیکن اس کے باوجود میں نا سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"غالباً" میں نے تمہیں پروپوز کیا تھا اسی سلسلے میں تم سے بات کر رہا ہوں۔" میری خاموشی کا مفہوم سمجھتے ہوئے وہ یاددہانی کروانے والے انداز میں گویا ہوا۔ میں بے اختیار کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی۔ معاً" میری نگاہوں کے سامنے معیز کا چہرہ آ بسا تھا۔

"تم میرے لیے ایک ناسور بن گئی ہو۔ جو مجھے تمام عمر تکلیف دیتا رہے گا۔"

"میں تمہیں اپنی محبت سے آزاد نہیں کر سکتا۔"

معیز میری زندگی سے نکل چکا تھا اور اب مجھے ان آوازوں کو اپنی زندگی سے خارج کرنا تھا اور زیاد آفاق مجھے اتنا وقت دینے کا بھی روادار نہ تھا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی اور پھر گاڑی کے سرد ماحول میں زیاد کی آواز گونجی۔

"قرۃ العین! ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جو چیز ہماری ذات سے منسلک ہو کر ہم سے جدا ہو جائے وہ ہمیں اتنی عزیز ہو جاتی ہے کہ پھر اس کے سوا ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیتا' حالانکہ زندگی کی نئی راہیں روشن راستوں کی مانند ہمارے سامنے ہوتی ہیں مگر یہ انسانی فطرت ہے انسان اپنے لیے ہر موقع پر کوئی نہ کوئی خلش تلاش کر ہی لیتا ہے۔ بعض واقعات اور حادثات اتنے پر اثر نہیں ہوتے جتنے ہمارے محسوسات انہیں بنا دیتے ہیں ہم کچھ زیادہ محسوس کرنے لگتے ہیں۔" وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے سر کہ میں بے حس نہیں بن سکتی کوشش کروں تب بھی میری ہر کوشش بے اثر ثابت ہوتی ہے۔" معیز پر میں نے ثابت کر دیا تھا کہ میں ایک بے حس لڑکی تھی۔ کوشش کے باوجود میں اپنی گلوگیر آواز پر قابو نہیں رکھ پائی تھی۔

"کسی کو بھول جانا یہ ثابت نہیں کرتا کہ ہم بے حس ہو گئے ہیں۔" وہ بڑے مدلل انداز میں گویا ہوا۔

"تم نے معیز سے محبت کی یہ بات میرے لیے ہرگز بھی قابل گرفت نہیں ہے کیونکہ تمہارے جیسا کرب میری زندگی میں بھی آیا تھا۔ محبت اور اس کا اظہار کسی بھی طور پر قابل گرفت نہیں ہو سکتا یہ زندگی ایسی ہی ہے ناقابل یقین حد تک پرنتائج۔ میں کبھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ میں شازمہ کے بعد کسی اور سے محبت کر سکتا ہوں۔ کوئی اور لڑکی بھی میرے احساسات کی دنیا میں ہلچل برپا کر سکتی ہے۔

جب شازمہ نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تھا اور انیس سے شادی کر لی تھی تو مجھے ایسا لگا تھا کہ میں یہ زندگی کیوں گزار رہا ہوں۔ وہ مجھ سے عمر میں پانچ سال بڑی تھی اور اسی بے بنیاد تفاوت کو اس نے جواز بنا کر انکار کا پتھر میرے منہ پر دے مارا تھا۔ مجھے اپنی زندگی بے معنی لگنے لگی تھی مگر پھر محض ایک پل کے احسانی

لمحے نے میری زندگی بدل کر رکھ دی تھی' مجھے شازمہ کو
بھلانے میں عرصہ صرف نہیں کرنا پڑا تھا اس لیے کہ وہ
شادی کے بعد خوش تھی' اس لمحے میں نے محسوس کیا
تھا کہ وہ میری زندگی سے نکل گئی ہے اور اسی بات کو میں
نے شروع میں ہی محسوس کر لیا تھا کہ اب وہ لوٹ کر
میری زندگی میں کبھی نہیں آئے گی۔ اس کی کسی بھی
یاد کو میں نے اپنے نزدیک نہیں آنے دیا اور اگر شاید
میں ایسا کرتا تو ایک نفسیاتی مریض بن جاتا۔ میری
زندگی کے چار سال کے ہر لمحے میں اس کی یاد کی چھاپ
تھی' اس سے وابستہ ہر خوشگوار لمحہ اپنی پوری ایک
کتاب رکھتا تھا لیکن قرۃ العین! یہ جو شعور ہے نا اسے
ہمیں ہر پل جگائے رکھنا چاہیے' میں نے ایسا فقط اپنی
فیملی کے لیے کیا اور اب شازمہ کہیں نہیں ہے' نہ
میری سوچوں میں اور نہ ہی میرے دل میں۔ اسے
جہاں ہونا چاہیے تھا وہ وہیں ہے' اپنے شوہر کے گھر
ہنستی ہوئی اور خوش باش۔"

"لیکن معیز خوش نہیں ہے۔" میں بھرائی ہوئی
آواز میں کہتے ہوئے اضطراری انداز سے اپنی انگلیاں
مسلنے لگی تھی۔ معیز کے بعد زیاد آفاق کا یہ انداز جیسے
میرے زخموں پر مرہم رکھ رہا تھا۔

"زیادہ عرصے تک وہ ناخوش نہیں رہ سکے گا۔" زیاد
کی آواز مجھے خود ساختہ کرب کے سمندر سے کھینچ لائی
تھی۔ اس کی آواز کسی امرت کی طرح میری سماعتوں پر
گر رہی تھی۔

"اگر وہ حقیقت کو فیس کرنا نہیں چاہتا تو ایک روز
حقیقت خود اس کے دماغ اور دل کے پردوں کو ہٹا دے
گی اور وہ حقیقت ہے فارینہ۔ جو اس سے محبت کرتی
ہے اور اب ایک معتبر رشتے کے حوالے سے اس کے
گھر میں موجود ہے۔ اس سے بڑی کوئی حقیقت نہیں
ہو سکتی۔

قرۃ العین! تمہیں معیز سے زیادہ خود اپنی
پروا کرنی چاہیے' تمہیں یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ
معیز خوش مطمئن ہے یا نہیں' تمہیں صرف یہ سوچنا
چاہیے کہ اب معیز تمہاری زندگی میں نہیں ہے' یہ
احساس جتنا بھی تکلیف دہ ہے' حقائق سے نظر چرانا
اس سے زیادہ تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔ ٹھیک ہے وہ
تمہارا بہترین دوست رہا ہو گا' تمہارے ہر احساس کو
اس نے تم سے شیئر کیا ہو گا' قدم بقدم پر تمہارا ساتھ دیا
ہو گا لیکن اب تمہیں صرف حقائق کو سامنے رکھنا ہو
گا۔"

وہ میرے اوپر بیتی قیامت سے ناواقف تھا لیکن اس
کے باوجود اس کے الفاظ میری تسلی کا باعث بن رہے
تھے' معیز کے بعد پہلی بار کسی نے مجھے اس انداز میں
تسلی دی تھی اور ایسا وہ شخص کر رہا تھا جو معیز کے بعد
مجھ سے محبت کرنے کا دعوے دار تھا۔

گاڑی سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی اور
اب عملی طور پر میرا ذہن آگے کی جانب بڑھ رہا تھا۔
میرا کرب' کسک اور خلش پیچھے جاتے راستوں کی
طرح ماضی کا ہیولا بنتے جا رہے تھے معاً گاڑی ایک دم
رک گئی۔

"کل میرے والدین تمہارے گھر آئیں گے۔ مجھے
یقین ہے تم میرے رشتے سے انکار نہیں کرو گی۔"
ڈور کھولتے ہوئے محض ایک پل کے لیے میرے ہاتھ
ساکت ہوئے تھے اور اس کے بعد میں نے اپنی زندگی
میں تحریک دینے کے بارے میں' عملی اقدامات کرنے
کے بارے میں سوچا تھا۔ اپنے کمرے میں آتے ہوئے
میرے قدموں میں سابقہ پژمردگی عنقا تھی۔

"نہیں زیاد آفاق! میں انکار نہیں کروں گی۔ اب
مجھے صرف اپنے لیے جینا ہے۔ مجھے کسی بھی قربانی کی
نذر نہیں ہونا۔ مجھے عملی طور پر معیز کو اپنی زندگی سے
خارج کرنا ہو گا۔" میں زیاد آفاق کے تصور سے مخاطب
تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے زندگی کے مثبت پہلو
میرے سامنے روز روشن کی طرح عیاں کر دیے تھے۔
اپنی ذات سے وابستہ ہر خوش کن آہٹ کو میں نے
دھتکار دیا تھا۔ ہمیشہ اپنی ذات کی نفی کی تھی لیکن آج میں
ایسا کچھ بھی کرنے کے بارے میں نہیں سوچ رہی
تھی۔ زندگی نظریہ متبادل کا دوسرا نام تھی' تغیرات جب
ذہن و دل قبول کرنے کے قابل ہوتے ہیں تو متبادل کے

لیے جگہ بنتی رہتی ہے۔ زیاد آفاق کبھی بھی معیز کا مبادل نہیں ہو سکتا تھا البتہ زیاد آفاق نے معیز حیدر کے خالی خانے کو پر کر دیا۔ پچھتاوے اور احساس جرم کی اذیت کسی طور کم نہیں ہو سکتی تھی اور اب مجھے اس اذیت کو کم کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

پچھتاوے اور احساس جرم کی اذیت کسی طور بھی کم نہیں ہو سکتی تھی اور اب اسے اس اذیت کو کم کرنا تھا۔

سارہ اسے تھامتے ہوئے لفٹ تک لائی تھی۔

"وہ تمہیں اپنی خوشنما شخصیت کے ساتھ ساتھ لفظوں کے جال میں پھانسنے کی کوشش کرے گا' تم ہرگز بھی اس کی باتوں میں نہیں آؤ گی۔ تم اس سے دو ٹوک انداز میں صرف شادی کے بارے میں بات کرو گی اور پلیز رونے دھونے کی کوشش مت کرنا۔ اگر اسے تمہارے آنسوؤں کی پرواہ ہوتی تو وہ یہ سب نہ کرتا۔" سارہ غالباً" اسے اس وقت کوئی چھوٹا سا بچہ تصور کر رہی تھی جب ہی اس کا انداز لاشعوری طور پر حکمیہ تھا۔

وہ پژمردہ قدموں کے ساتھ اس کے آفس سے متصل اس کی سیکریٹری کے کمرے میں کھڑی تھی۔ ہمیشہ کی طرح اس کی سیکریٹری بختاور کو دیکھ کر مسکرائی تھی مگر ہمیشہ کی طرح وہ اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہیں دے پائی تھی۔

"آئی ایم سوری! سر اس وقت ایک ضروری میٹنگ میں بزی ہیں ان کے ساتھ جی ایم صاحب بھی ہیں اور انہوں نے ڈسٹرب کرنے سے منع کیا ہے۔" وہ سلجوق عمر کے والد کا حکم ترسیل کر کے قدرے شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھی۔

"میرا ان سے ملنا ازحد ضروری ہے۔" وہ پریشانی سے گویا ہوئی۔ جواباً" سیکریٹری نے شانے اچکا کر اپنی مجبوری ظاہر کی تھی۔

"آپ صرف انہیں یہ کہہ دیں کہ بختاور علی ان سے ملنا چاہتی ہے اگر وہ انکار کریں گے تو میں چلی جاؤں گی۔" وہ ملتجی انداز میں اپنے گویا ہوئی کہ سیکریٹری ریسیور تھامنے پر مجبور ہو گئی۔

"آئی ایم سوری سر!" دوسری جانب سے شاید اسے درشت انداز میں ڈپٹا گیا تھا۔

"آئی نو ویری ویل سر! آپ نے مجھے منع کیا تھا' بٹ سر! بختاور علی آپ سے ملنا چاہتی ہیں' اٹس ارجنٹ۔" وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی' مگر شاید دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا تھا۔ سیکریٹری نے نہ سمجھنے والے انداز میں فون کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ آفس کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا۔ وہ نظریں جھکائے آنے والے شخص کے قدموں پر سماعتیں مرکوز کیے ہوئے تھی۔ سلجوق عمر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے پرفیوم کی مخصوص خوشبو بختاور کے لیے تنفر کے نئے در وا کیے ہوئے تھی۔ وہ بے اختیار اس کا ہاتھ تھام گیا۔ جواب میں بختاور سے بھی بے اختیاری سرزد ہوئی تھی اس نے ایک جھٹکے سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کروائے تھے۔

"ڈونٹ ٹچ می!" دبے دبے لہجے میں کہتے ہوئے وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔ مگر وہ اس کے کسی بھی احتجاج کی پروا کیے بغیر اپنے ساتھ گھسیٹتے ہوئے کانفرنس روم میں لے آیا تھا۔

"مجھے آج یہاں نہیں آنا چاہیے تھا' میں اس شخص کا سامنا نہیں کر سکتی' مجھے سارہ کی باتوں میں نہیں آنا چاہیے تھا' میں نے یہاں آ کر غلط کیا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اس سے نظریں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔

وہ فق رنگت کے ساتھ دم بخود اور ساکت تھی۔ سلجوق عمر اس کی سراسیمگی محسوس کر کے متاسف سا ہو گیا۔ زندگی! کون کہہ سکتا تھا کہ کچھ روز پہلے تک یہ لڑکی کس قدر زندگی سے بھرپور تھی' اس کی ہنستی آنکھیں اور چمک زندگی سے زیادہ پرکشش تھیں اور اب وہ ان آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں پڑھ سکتا تھا' وہ اجنبیت محسوس کر سکتا تھا جس کا وہ عادی نہ تھا اور نہ ہی ہونا چاہتا تھا۔ وہ اس سے بات کرنے کے لیے

مناسب لفظوں کی تلاش میں تھا اور پھر وہ اپنی اس کوشش میں ناکام ہو گیا تھا۔ بختاور علی کو مخاطب کرنے کے لیے اس کے پاس الفاظ نہ تھے۔ بختاور کے تاثرات سے وہ اس کی دلی کیفیات کا اندازہ لگا سکتا تھا۔

وہ خالی الذہنی کے عالم میں اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں بختاور! تم اپنے دل میں میرے لیے نفرت محسوس کر رہی ہو شاید تم مجھے کبھی معاف نہ کر سکو۔ لیکن۔"

"نفرت!" بلند آواز میں اس لفظ کو دہراتے ہوئے اس نے اپنے اندرونی احساسات کو جانچا تھا اور تب اس پر انکشاف ہوا تھا کہ محبت کا سفر جتنی عجلت میں طے ہوا تھا' نفرت کا سنگ میل اتنی ہی رفتار سے بہت پیچھے رہ گیا تھا' نفرت کے بعد کی منزل بے نام تھی۔ وہ سلجوق عمر کو بتا دینا چاہتی تھی کہ محبت نے اسے کن کن مراحل کے بیچ لا کھڑا کیا ہے۔ مگر الفاظ نہ آواز سے ہم آہنگ ہو سکے تھے اور نہ ہی اپنی وقعت کو ظاہر کر پا رہے تھے۔

"تم جو کچھ میرے ساتھ کر رہی ہو' جو بھی رویہ میرے ساتھ روا رکھے ہوئے ہو تمہیں حق پر پاتے ہوئے بھی میں اس رویے کو برداشت نہیں کر پا رہا' میں تمہاری خفگی نہیں سہہ سکتا۔ تم کوئی بھی سزا میرے لیے تجویز کرو میں بخوشی راضی ہوں لیکن پلیز اس طرح مجھے اپنی زندگی سے خارج مت کرو۔" کانفرنس روم کے دروازے سے سہمے ہوئے انداز میں ٹیک لگائے وہ اپنے قریب کھڑے سلجوق عمر کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس کے لیے پریشان تھا' اپنی صفائی میں کہنے کے لیے اس کے پاس ایک حرف بھی نہ تھا' نفس کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کا وہ کیا جواز دے سکتا تھا' کیا صفائی پیش کر سکتا تھا۔

سارہ کی دی گئی ہدایت اپنا نقش پا بھولنے لگی تھی۔ آنسوؤں نے اپنی راہ دیکھ لی تھی۔ سلجوق نے اپنے دونوں بازوؤں کو دروازے کے اردگرد ایسے جمایا ہوا تھا کہ اس کے دونوں بازوؤں کے بیچ قید سی ہو گئی تھی' اس کی سانسیں الجھنے لگی تھیں' گرم سانسوں کی حرارت' اس کی قربت وہ جیسے ایک قیامت میں گھر گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے پیچھے دھکیلا تھا۔

"پلیز میرے قریب مت آؤ' تمہاری قربت نفرت اور ذلت کے احساس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔" وہ اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپتی ہوئی بیٹھتی چلی گئی۔ اس کا لہجہ قدرے بے ربط تھا۔ سلجوق عمر بے بسی اور بے چارگی کی انتہا پر اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"تم ایسے مت روؤ۔" وہ پنجوں کے بل اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بے بسی سے گویا ہوا تھا۔ اس نے اس کی بات نہیں سنی تھی یا وہ جان بوجھ کر ان سنی کر گئی تھی۔ وہ بالکل کسی بچے کی طرح بلک رہی تھی۔

"کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟" اس کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔

وہ آنکھیں پھاڑے متحیر سی اسے دیکھ رہی تھی۔ سارہ نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ شادی کی بات براہ راست اسی سے کرے اور اگر وہ انکار کر دے تو ہر طریقے سے اسے مجبور کرنے کی کوشش کرے۔ بختاور نے اسے مجبور نہیں کیا تھا' اس نے شادی کا تذکرہ تک نہیں کیا تھا اور سلجوق عمر خفت اور شرمندگی کا تاثر لیے اس سے مخاطب تھا۔

"میں جانتا ہوں' تمہارے لیے میرا وجود ناقابل قبول ہو گا مگر حالات کا تقاضا یہی ہے کہ تم مجھ سے شادی کر لو۔" وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"آج میرے والد تمہارے گھر آئیں گے۔" بختاور ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جو وہ سننا چاہتی تھی' وہ سن چکی تھی اب یہاں ایک پل بھی ٹھہرنا اس کے لیے دشوار تھا۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟ میں تمہیں ڈراپ کر دیتا ہوں۔" وہ بے ربط انداز میں کہتا ہوا اس کے پیچھے لپکا تھا۔ وہ بغیر مڑے سیڑھیاں اترنے لگی۔

"تم ایک بار مجھے معاف کر دو بختاور! تم یقین کرو۔

میں تمہیں کبھی ناخوش نہیں ہونے دوں گا۔" وہ اپنے عقب سے وہ آوازیں سن رہی تھیں جن کی اہمیت اب اپنی وقعت کھو چکی تھی۔ اب نہ تو کسی خوشی کا کوئی مطلب تھا اور نہ ہی ناخوشی کوئی معنی رکھتی تھی۔

سارہ کی استفسار کرتی نگاہوں کا اس نے محض سر ہلا کر جواب دیا تھا۔ سارہ نے ایک سکون کا سانس لیتے ہوئے اس کے سرخ چہرے کو بغور دیکھا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی آمیز انداز میں دیکھنے لگی جبکہ وہ ونڈ اسکرین سے جھانکتے ہوئے آنے والے امتحان کے لیے خود کو تیار کرنے کی سعی کر رہی تھی۔

سلجوق عمر نے اپنا پرپوزل بھجوایا تھا۔ کبھی زندگی کے خوشگوار لمحات میں اس نے بارہا اس لمحے کے بارے میں سوچا تھا' سرشاری اور خوشی اور طمانیت انگیز احساس کے علاوہ کوئی دوسرا احساس اس کے اردگرد نہیں پھٹکا تھا اور اب سرخوشی اور طمانیت کے علاوہ سب کچھ تھا۔

اس کا خیال تھا کہ ممی ڈیڈی اس سے اس رشتے کے بارے میں استفسار کریں گے اور وہ جواباً "سلجوق عمر سے اپنی محبت کا اظہار کر کے انہیں ورطہ حیرت میں ڈال دے گی' تب شاید اس کی خوشی کے پیش نظر اس رشتے کو قبول کر لیا جائے گا۔

اس کے خیالات محض ذہن تک ہی محدود رہے تھے۔ ڈیڈی نے سلجوق کے والد کو دو ٹوک انداز میں انکار کر دیا تھا' یہی نہیں صاف اور واضح الفاظ میں یہ بھی باور کروا دیا گیا تھا کہ عنقریب اس کی شادی کی ڈیٹ بھی فکس ہونے والی ہے۔ وہ ڈرائنگ روم کے باہر کھڑی ڈیڈی کے پر رعونت دو ٹوک لہجے کو سن رہی تھی۔ اسے اپنے پاؤں سن ہوتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ یہ کام اس قدر آسان نہ تھا جس قدر سارہ اور اس نے تصور کیا تھا۔ اسی طرح چلتی ہوئی اندر وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ کمرے میں آتے ہی ضبط کی تمام طنابیں ایک کے بعد ایک ٹوٹتی چلی گئیں۔

اگلی صبح سلجوق نے اسے فون کیا تھا۔

"تمہارے فادر نے واضح طور پر مجھے ریجیکٹ کر دیا ہے اور میرے فادر یہاں دوبارہ آنے کے لیے کبھی رضا مند نہیں ہوں گے۔" وہ آنکھوں میں نمی لئے حقیقت پر مبنی بیان سن رہی تھی۔ درحقیقت وہ شعوری طور پر ایسے ہی کسی لمحے کی گرفت میں تھی۔ سب کچھ بند مٹھی میں ریت کی مانند پھسلتا چلا جا رہا تھا۔

"اب فقط ایک ہی راستہ بچتا ہے۔" دوسری جانب سے اس کی پرسوچ آواز بختاور کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ "کورٹ میرج۔" اس کی خاموشی کو استفسار جانتے ہوئے اس نے اپنا خیال پیش کیا تھا اور پہلی بار بختاور نے اپنی آواز کا سہارا لیا تھا۔

"نہیں میں کورٹ میرج نہیں کروں گی۔" وہ بے ربط انداز میں تقریباً بھرائی ہوئی آواز میں چلائی تھی۔

"تم سمجھنے کی کوشش کرو بختاور! اس وقت یہی اس مسئلے کا قابل ترجیح حل ہے۔"

"نہیں میں ایسا نہیں کروں گی۔" وہ ہٹیلے انداز میں اپنی ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ دوسری جانب سے اس نے ایک گہرا سانس خارج کیا۔

"ٹھیک ہے' میں ایک بار پھر اپنے ڈیڈ کو راضی کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے فون رکھ دیا تھا۔

"تمہیں اپنی دادو کو اعتبار میں لینے کی کوشش کرنی ہوگی۔" سارہ تمام باتیں سننے کے بعد ایک اور نتیجے پر پہنچی تھی۔ جواباً وہ اپنا سر تیزی سے نفی میں ہلانے لگی۔

"نہیں' مجھ سے یہ سب نہیں ہوگا۔" وہ روہانسی سی بولی۔

"ٹھیک ہے پھر جیسے حالات چل رہے ہیں تم انہیں چلنے دو۔" قطعی اور دوٹوک انداز میں کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

سارہ کے کہنے کے مطابق وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہی تھی کہ اس سلسلے میں دادو سے کچھ بھی کہہ پاتی' حالانکہ دادو خود ہی اس سے کرید کرید کر پوچھنے کی کوشش کرتی تھیں۔ وہ اس کی ان پریشانیوں سے واقف ہونا چاہتی تھیں جو اسے لاحق تھیں ان کی آکسا دینے والی گفتگو کے باوجود وہ خاموش رہی۔

ایک ہفتے بعد سلجوق کے ڈیڈ ایک بار پھر اپنے سابقہ مدعا سمیت ان کے ڈرائنگ روم میں تھے۔ اس بار ان کی بیگم بھی ان کے ہمراہ تھیں۔

"فاروق صاحب! مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کا بیٹا well behaved ہے گریڈ اور کلچرڈ ہے مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں بزنس کمیونٹی میں آپ کا کیا مقام ہے' مجھے اس سے بھی کوئی لینا دینا نہیں۔ میں پہلے بھی آپ کو انکار کر چکا ہوں اور دوسری بار بھی مجھے انکار کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوگا۔" ڈیڈی کی سرد وسپاٹ آواز باہر کھڑی بختاور کے لہو تک میں سرائیت کر گئی تھی۔

"کوئی بھی فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں اپنی اولاد کی خوشیوں کو ضرور مدنظر رکھنا چاہیے۔" سلجوق کے ڈیڈی کسی بھی طور ہار ماننے کے موڈ میں دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"آپ کے بیٹے کے بارے میں تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا' البتہ میں اپنی بیٹی کی خوشیوں سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

"اگر آپ اس کی خوشیوں سے واقف ہوتے تو رسماً' ہی سہی ایک بار اس سے اس بابت دریافت ضرور کرتے۔" وہ ڈیڈی کی رعونت اور دوٹوک انداز سے متاثر ہوئے بغیر کہہ رہے تھے۔ کمرے میں ایک دم خاموشی چھا گئی' اس خاموشی کو چند ساعتوں بعد ڈیڈی نے ہی توڑا تھا۔

"میں چھ سال پہلے اس سے اس کی مرضی دریافت کر چکا ہوں۔ رشتہ جوڑنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے' ہم نے سوچ سمجھ کر ہی اس کا رشتہ طے کیا ہے۔ آپ نے خواہ مخواہ یہاں آنے کی زحمت کی اور میں چاہتا ہوں کہ آپ آئندہ ایسی زحمت نہ کریں تو بہتر ہے۔" اس کے بعد کمرے میں کیا گفتگو ہوئی۔ اسے سننے کی ذرہ برابر چاہ نہیں رہی۔ وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں پلٹ آئی۔

(یہ چوتھا اور آخری حصہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

چوتھا اور آخری حصہ

لبنیٰ رانا

مکمل ناول

چند ساعتوں بعد دادو اس کے کمرے میں آئی تھیں۔ ان کے چہرے کا خاموش تاثر استفسار طلب تھا۔ اس کا شاک ابھی کم نہیں ہوا تھا کہ دادو کی آمد نے اس کی الجھتی سوچوں کو مزید گنجلک کر دیا تھا۔ "تم سلجوق عمر کو جانتی ہو؟" وہ زیادہ دیر تک اپنی خاموشی برقرار نہیں رکھ سکی تھیں۔ ان کے سوالیہ انداز میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔ بختاور انہیں مکمل طور پر نظر انداز کیے اپنے ہاتھوں کو اضطراری انداز میں مسل رہی تھی۔

"اس کا مطلب ہے تم اسے جانتی ہو۔ کیا اس نے اپنے والدین کو تمہاری مرضی کے بعد یہاں بھیجا ہے۔" اس نے اس بار بھی کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"تم بختاور! مجھے پریشان کر رہی ہو۔ اس طرح گونگی بہری بن کر تم مجھ پر جو کچھ ثابت کرنا چاہ رہی ہو' وہ میں کسی بھی طور پر برداشت نہیں کرپا رہی۔ کچھ کہو بختاور خاموش مت رہو کم از کم میری غلط فہمی ہی دور کر دو۔" اب دادو کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا تھا۔ ایک لمبی خاموشی کے بعد بھی اس کے لب کچھ بھی کہنے سے قاصر تھے۔

"اس کا مطلب ہے تم سلجوق عمر سے شادی کرنا چاہتی ہو۔" اضطرابی کیفیت نے اسے وحشت کے سمندر میں دھکیل دیا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دادو کے اس قیاس کی تردید یا پھر تصدیق کر سکتی۔

"تم ثاقب سے شادی کرنا نہیں چاہتیں۔" ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ وہ دادو کی معدوم ہوتی آواز سن رہی تھی۔

"تم اگر ثاقب کو پسند نہیں کرتی تھیں تو تم اس بارے میں مجھ سے ڈسکس کر سکتی تھیں۔ کوئی زبردستی تو نہیں کی گئی تھی تمہارے ساتھ' تمہاری رضامندی کے بعد ہی تمہاری منگنی کی گئی تھی۔ چپ مت رہو بختاور! یہ خاموش رہنے کا وقت نہیں ہے۔" وہ اسے جھنجھوڑ رہی تھیں۔

"معمولی سی شناسائی' سلجوق عمر کو یہاں دوبارہ آنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔" اس کا چہرہ تاریک ہو گیا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے ان بھیانک لمحات کی زد میں تھی جب محبت جیسا لفظ اس کی زندگی سے خارج ہو چکا تھا اور اب دادو اسی محبت کا اقرار چاہ رہی تھیں۔ معاً اس کے چہرے کی تاریکی اس کی آنکھوں میں اتر آئی تھی اور اس کے بعد اس نے اپنے وجود کو کسی خلا میں معلق پایا تھا۔ اس کی نظروں نے آخری بار دادو کو اپنی طرف لپکتے دیکھا تھا۔

اس کی بے دار ہوتی ساعتوں اور اعصاب نے کمرے میں دبے دبے لہجے میں ہوتی آوازوں کو جذب کیا تھا' مگر دماغ ابھی بھی اس قابل نہیں ہوا تھا کہ ان آوازوں

کا مفہوم جان پاتا۔ اس نے بہت آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔ دھندلی آنکھوں سے وہ اپنے اردگرد کھڑے دھندلے ہیولوں کو شناخت کرنے کی سعی کر رہی تھی، اس کی اس سعی کو بلند ہوتی آواز نے حقیقت کی دنیا میں لا کھڑا کیا تھا۔ ہاں یہ آواز ڈیڈی ہی کی تھی۔

ڈیڈی چلا رہے تھے، ان کا یہ انداز اور لہجہ اس نے کبھی نہیں سنا تھا، مگر اس کے باوجود وہ ان کی آواز کو پہچان گئی تھی۔ اس آواز کے بعد کچھ بھی مبہم نہ رہا تھا۔ اس نے پوری طرح آنکھیں کھول دی تھیں۔ کوئی بھی اس کی جانب متوجہ نہیں تھا، سب کی نگاہوں کا مرکز اس وقت صرف ڈیڈی تھے، وہ بے تاثر چہرے کے ساتھ اس سارے منظر کا حصہ ہوتے ہوئے بھی تماشائی کی طرح اسے ملاحظہ کر رہی تھی۔ ڈیڈی کے سرخ چہرے نے اس کے چہرے کو بے تاثر نہیں رہنے دیا تھا۔ کچھ غیر معمولی ہونے والا تھا، اس کے وجود پر ایک خوف سا مسلط ہو گیا تھا۔ دادو ڈیڈی کو کول ڈاؤن کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ جیسے اپنے آپے میں آنے کو تیار ہی نہ تھے۔

"آپ کچھ مت کہیں اماں، کچھ کہنے اور سننے کا وقت تو ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ آج اس عورت نے مجھے پاتال میں لا کر کھڑا کر دیا ہے۔ یہ تربیت دی ہے اس نے۔ اس طرح تو کوئی جانور بھی اپنی اولاد کو پال لیتا ہے۔ ساری زندگی میں نے اس کی آسائشات، تعیشات کی نذر کرتے ہوئے محنت کرتے گزار دی صرف اس لیے کہ یہ بدلے میں میری اولاد کی کیئر کرے، ایک مرد ایک عورت کو بیوی بنا کر اس کی خواہشات پوری کرنے کے لیے اپنے گھر میں نہیں لاتا۔ زندگی عمل اور ردعمل کے نظریے کے تحت دو فریقین کے مابین بنیاد بنتی ہے اور آج میری بنیادوں تک کو اس عورت نے ہلا کر رکھ دیا ہے۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو اس قدر کھوکھلا اور کمزور محسوس نہیں کیا تھا۔" وہ یاسیت سے کہہ رہے تھے اور پھر وہ ممی کی اور جارحانہ انداز میں بڑھے تھے۔

"میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں تمہارا گلا گھونٹ دوں۔ یہ گناہ تنہا بختاور سے سرزد نہیں ہوا، تم بھی اس گناہ میں برابر کی شریک ہو۔" ممی کی سسکیاں بری طرح مجھے احساس جرم میں مبتلا کر رہی تھیں۔ ڈیڈی غصے سے بپھرے ہوئے تمام تر لحاظ بالائے طاق رکھے ہوئے ممی پر برس رہے تھے اور وہ جو اس تمام معاملے کی ذمہ دار تھی آنکھیں کھولے اس تمام منظر کو ایک تماشائی کی حیثیت سے دیکھ رہی تھی۔

"آج اس عورت نے مجھے کہیں منہ دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا، اب میں تمام عمر کسی سے نظر ملا کر تو کیا نظر جھکا کر بھی بات کرنے کے قابل نہیں رہا۔ کتنی اکڑ کے ساتھ میں نے فاروق آفریدی کو جواب دیا تھا۔ ایک پل کے لیے بھی میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ میری دی گئی آزادی اس گھر میں ایک سانپ کو پنپنے میں مدد دے رہی ہے۔ آج یہی سانپ اژدھا بن کر سب کچھ نگل گیا، میرا مان، میرا غرور، میرا نظریہ، لبرل ازم۔ یہ ذلت، یہ بے عزتی یہ سب میرے غرور کا حاصل ہے، کتنی اکڑ کے ساتھ میں نے اس شخص کو کہا تھا کہ میں اپنی بیٹی کی خوشیوں سے اچھی طرح آگاہ ہوں۔ وہ یقیناً" دل ہی دل میں ہنس رہا ہو گا میری بے خبری پر، کتنا بے خبر ہوں میں۔ اب میں کس منہ سے اس شخص کے در پر دستک دوں جسے خود میں نے اپنی دہلیز سے دھتکارا تھا، ایک بار نہیں دو بار۔"

معاً" وہ ایک جھٹکے سے بختاور کی طرف پلٹے تھے۔ اس تند و تیز گفتگو نے ڈیڈی کے ذہنی انتشار کو بختاور کی طرف منتقل کر دیا تھا۔ بختاور کو بیڈ پر آنکھیں کھولے لیٹے دیکھ کر ان کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔ بختاور فق رنگت کے ساتھ دم بخود سی انہیں اپنی جانب بڑھتے دیکھ رہی تھی۔ جلد یا بدیر یہ لمحہ اس کی زندگی میں آنا تھا اور یہ لمحہ بالآخر اس کی زندگی میں در آیا تھا اپنے ہاتھوں کی سخت اور سفاکی لی ہوئی گرفت سے انہوں نے بختاور کو اپنے سامنے کھڑا کر دیا تھا۔ ان کی آنکھوں سے اڈتے تنفر کے شرارے بختاور کے ہوش اڑا گئے تھے۔

"میں اس لڑکی کا منحوس وجود ایک پل کے لیے بھی اپنی نظروں کے سامنے برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ تقریباً" اسے گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب لپکے، ان کے پیچھے پیچھے دادو اور ممی بھی بے قراری سے لپکی تھیں۔ بختاور بے جان وجود کے ساتھ ان کے ساتھ گھسٹ رہی تھی۔

"میں کہتی ہوں علی خدا کے واسطے بختاور کو چھوڑ دو، اس کی حالت پر رحم کرو۔" دادو، ڈیڈی کی گرفت سے اسے آزاد کرانے کی سعی کرتے ہوئے تقریباً" روتے ہوئے فریاد کر رہی تھیں اور وہ اس کیفیت میں بھی ڈیڈی کے غصے کی گہرائیوں کو جانچنے کی سعی میں منہمک تھی۔

"اب میں کسی کو بھی اپنے راستے کی دیوار بننے نہیں دوں گا۔ آج سے اس کا اس گھر سے اور اس گھر کے مکینوں سے کوئی تعلق نہیں اور خبردار اگر کسی نے میرے راستے کی دیوار بننے کی کوشش بھی کی۔" وہ دو سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے، وہ سیڑھیوں سے لڑھکتے بختاور کے وجود کی تکلیف سے بے نیاز تھے۔ لاؤنج میں پہنچ کر انہوں نے اسے کسی بے جان شے کی طرح فرش پر پٹخ دیا تھا۔ وہ اس وقت اپنی ہر تکلیف سے بے نیاز تھی۔ محبتوں کی شدتوں میں لپٹا ڈیڈ کا لہجہ آج اسے اپنی وہ جھلک دکھا رہا تھا جو مجسم بے یقین تھا۔
دو کسی نے تمہاری زندگی تباہ نہیں کی میں سلجوق کو ہرگز بھی گناہ گار تصور نہیں کرتی اگر تمہارے ساتھ کچھ بھی برا ہوا ہے تو اس کی ننانوے فیصد تم خود ذمہ دار ہو۔" سارہ کا دوٹوک انداز اسے آئندہ زندگی کا ادراک دے گیا تھا اور اب ڈیڈی کا یہ اجنبی رویہ تمام حقائق کو قبول کرنے کے باوجود ناقابل قبول تھا۔

اس نے ڈیڈی کا ہاتھ خود پر اٹھتے دیکھا تھا۔ ان پر جیسے کوئی جنون سوار تھا، ہاتھوں اور پھر لاتوں سے اس کے وجود کو رگیدتے ہوئے وہ ایک ہیجانی کیفیت کی لپیٹ میں تھے۔ ہر چیز اپنے مقام سے ہٹ گئی تھی۔ بختاور نے کبھی بھی ڈیڈی کو اس روپ میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ سب کچھ اس گھر میں شروع نہیں ہوا تھا، مگر سب کچھ ختم ضرور ہو گیا تھا۔ جو کچھ بچا تھا، وہ سب بے جان تھا۔ دادو اور ممی کی منتوں کا اثر لیے بغیر ڈیڈی اس کے بے جان وجود کو اپنے جنون کی نذر کر رہے تھے۔ اس کے تینوں بھائی اپنے اپنے کمروں سے نکل آئے تھے۔ پھر فصیح نے اپنی تمام تر جسمانی قوت صرف کرنے کے بعد ڈیڈی کو قابو میں کیا تھا۔ ملامت، پچھتاوا، وضاحت ہر لفظ اپنی اہمیت اپنے معانی کھو چکا تھا۔ لاؤنج کی دیوار کے ساتھ ٹکا اس کا گٹھڑی بنا وجود محض اپنی سانس سے چھٹکارا پانے کا متمنی تھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں کو بوجھل ہوتے محسوس کیا تھا، شاید موت اسے اپنی طرف گھسیٹ رہی تھی۔ شاید تمام مصائب ختم ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ چہرے، آوازیں الفاظ سب معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ گڈمڈ ہوتی سرگوشیوں اور سسکیوں کو سن رہی تھی۔ ہر چیز اپنا ربط کھو رہی تھی۔ جینے اور زندہ رہنے کی ہر رمق کسی گہری تاریکی میں گم ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

جینے اور زندہ رہنے کی ہر رمق کسی گہری تاریکی میں گم ہو گئی تھی اور اب مجھے اپنی زندگی کے ہر خوش کن احساس کو اس گہری کھائی سے ڈھونڈ کر واپس لانا تھا۔ اب مجھے صرف اپنے لیے جینا تھا۔ اگلے روز میں موسو اور ارتقٰی کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی ان کی شرارت

بھری معصوم آوازوں سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ جب زندگی انقلابات کی زد میں آتی ہے تو ہر تبدیلی اپنا احساس دلاتی ہے اور میں بھی اسی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے موموکی رواں اور شفاف ہنسی میں کھوئی ہوئی تھی۔

لاشعوری طور پر میں اس وقت زیاد آفاق کی گاڑی کے مخصوص ہارن کی منتظر تھی اور پھر مجھے زیادہ دیر تک انتظار کی کوفت نہیں اٹھانی پڑی تھی۔

ڈور بیل کی آواز کے بعد پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز اور پھر کاریڈور سے ابھرتی آوازوں کا سلسلہ' میری سماعتیں انہیں کی منتظر تھیں۔

ارتضٰی مجھے موموکے ساتھ کھیل جاری رکھنے کی تاکید کرتا ہوا ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا تھا۔ مما کی خانساماں کو ہدایات اور کچن میں ہونے والی ہلچل سے میں اندازہ لگا سکتی تھی کس قسم کے لوازمات کی تیاری عمل میں آرہی تھی۔ مما کے چہرے کا خاموش اور غمگین سکوت ٹوٹ گیا تھا۔ ان کی چال سے میں ان کی سرخوشی اور طمانیت کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

ڈرائنگ روم سے ابھرتے چھوٹے چھوٹے قہقہے اندر کے خوشگوار ماحول کے غماز تھے۔ میں لاؤنج میں بیٹھی بخوبی ان آوازوں کو سن سکتی تھی۔ مہمانوں کے رخصت ہونے کے بعد میں کافی دیر تک میں بابا کی جانب سے اپنے بلائے جانے کی منتظر رہی۔

ایک گھنٹے کے بعد میرا بلاوا آگیا تھا۔ اسٹڈی میں ریلنگ چیئر پر نیم دراز ان کا وجود یقینی طور پر میرا منتظر تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" سرد و سپاٹ آواز میں انہوں نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ میں کوئی بھی سوال جواب کیے خاموشی سے ان کے سامنے بیٹھی ان کے بولنے کی منتظر تھی۔

"میں نے زیاد آفاق کے گھر والوں کو ہاں کہہ دی ہے۔" وہ غالباً" میرے رد عمل کے منتظر تھے میں نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا۔ جو وہ چاہتے تھے میں نے اس پر عمل کیا تھا اور اب جو میں چاہتی تھی وہ اسے

تسلیم کر چکے تھے۔ غالباً" ایک خاموش معاہدہ ہمارے بیچ طے پا گیا تھا۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد ان کی آواز ایک بار پھر گونجی تھی۔ وہ متاسف سے گویا ہوئے۔

"مجھے کبھی بھی لڑکیوں کا لڑکوں کے ساتھ آزادانہ میل جول پسند نہیں رہا' اسی بنا پر میں تمہارے جاب کرنے پر معترض ہوا تھا۔ کل جب میں نے تمہیں ایک سگنل پر زیاد آفاق کے ساتھ دیکھا تو میں نے سوچا تھا کہ میں تم سے اس سلسلے میں ضرور بازپرس کروں گا۔ مگر پھر مجھے اپنے اس خیال کو رد کرنا پڑا تھا۔ تم میری اس ناپسندیدگی سے ناواقف تو نہ تھیں کہ میں تمہیں نئے سرے سے سمجھاتا۔ رات کے گیارہ بجے تم ایک غیر مرد کے ساتھ تنہا اس کی گاڑی میں سفر کر رہی تھیں' میں صرف غصے اور غیرت کے مارے کھول سکتا تھا اور میں کھول رہا تھا۔ تم نے جو میری ہر بات کے جواب میں ضد کا پہلو اپنانے کی عادت بنالی ہے اس نے مجھے اس فیصلے میں کسی تامل کا شکار نہیں ہونے دیا۔ جب اولاد اپنی زندگی کے فیصلے اپنے والدین کی رائے جانے بغیر کر سکتی ہے تو والدین کو بھی اس کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرنے کی قطعی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔" وہ مصنوعی شکستہ انداز میں کہتے ہوئے اس وقت خود کو دنیا کے مظلوم ترین باپ ثابت کرنے کی سعی میں منہمک تھے۔

میں دل ہی دل میں ان کی ڈپلومیسی کی قائل ہو گئی تھی۔ لفظوں کا استعمال کب اور کیسے کرنا ہے ان سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ آج ان کا یہ انداز دیکھ کر نہ تو مجھے دکھ ہوا تھا اور نہ ہی غصہ آرہا تھا' بلکہ میں تو زیاد آفاق کی ناصحانہ گفتگو کو خود پر اپلائی کر رہی تھی۔ میں بابا کو جیسے ہیں ویسے ہی قبول کرنے کی بنیاد پر سوچ رہی تھی۔ یہ واحد مثبت تبدیلی تھی جو میری ذات کے تشخص پر ثبت ہو گئی تھی۔ میں بابا کی باتوں پر نہ تو کلس رہی تھی اور نہ ہی کڑھ رہی تھی' اور نہ میں یہ سوچ رہی تھی کہ بابا میرے ساتھ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ اگر یہ تبدیلی میرے اندر نہ در آتی تو میں یقیناً" ان سے

ضرور دریافت کرتی کہ جہیز والے معاملے میں انہوں نے میرے راستے میں رکاوٹیں کیوں کھڑی کیں۔ جب ماضی کا دروازہ بند ہو گیا تھا تو ایسے سوالات کے جنم لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

بعض لوگ خود اپنے رتبے کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ شادی جلد از جلد ہو جائے" وہ خود کلامی کرتے ہوئے گویا ہوئے تھے۔

ان کی زندگی کا مقصد میرے وجود سے چھٹکارہ پانا تھا اور زیاد آفاق کے توسط سے میں نے انہیں یہ موقع بھی فراہم کر دیا تھا۔ میں متذبذب انداز لیے اسٹڈی سے باہر نکل آئی۔

اگلے چند روز میرے لیے تحیر خیز تھے۔ میں متعجب تھی بابا کو اپنی شادی کے حوالے سے پرجوش انداز میں تیاری کرتے ملاحظہ کر رہی تھی۔ انہوں نے شادی اور مہندی کے فنکشن کے لیے کراچی کے بہترین ہوٹل کی بکنگ کروائی تھی۔ جہیز کی اشیا کی خریداری کے لیے وہ جس طرح پانی کی طرح پیسے بہا رہے تھے اس نے ایک بار پھر بابا کی ذات کے اسرار وا کر دیے تھے۔

دور پرے کے عزیزوں کو کارڈ ارسال کرتے ہوئے' ارتضٰی کو انتظامات کے حوالے سے تاکید کرتے ہوئے وہ مجھے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہے تھے۔ میں ان کی کسی بھی حرکت سے متاثر نہیں ہوئی تھی اور غالباً" وہ یہ سب کچھ مجھے متاثر کرنے کے لیے کر بھی نہیں رہے تھے' جنہیں وہ متاثر کرنا چاہتے تھے وہ تو ویسے ہی ان سے اس قدر مرعوب تھیں کہ موجودہ جوش و خروش ان کی نظر میں بابا کی اہمیت کو بڑھانے یا پھر گھٹانے میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتا تھا۔ میں اس وقت مما کے بارے میں سوچ رہی تھی۔

ڈیٹ فکس ہونے کے باوجود میں نے آفس جانا ترک نہیں کیا تھا۔ میں اپنے سابقہ تسلسل کے ساتھ آفس آرہی تھی۔ میرے اس عمل سے سب سے زیادہ جسے تکلیف ہو رہی تھی وہ مسز شیرازی تھیں۔

"تم آج پھر آگئیں۔ مانا کہ تم اپنے کام کے معاملے میں خاصی مستعد ہو۔ مگر ایسی بھی کیا مستعدی کہ اپنی شادی تک کی پروا نہیں ہے تمہیں۔" آفس میں داخل ہوتے ہی مجھے ان کی آواز سنائی دی تھی۔ میں مسکراتے ہوئے ان کے سامنے آبیٹھی۔

"آپ کہتی ہیں تو میں کل سے آفس نہیں آؤں گی۔" میں نے فائل اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے انہیں تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ جواب میں ان کے چہرے کا تاثر تبدیل نہیں ہوا تھا۔

"تمہیں آج بھی نہیں آنا چاہیے تھا۔ اگلے ہفتے تمہاری شادی ہے اور تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑ رہا اور زیاد آفاق کو دیکھو وہ بھی تمہیں منع نہیں کر رہا۔" اب ان کی ناراضی زیاد کی طرف منتقل ہو گئی تھی۔ جواباً" میں مسکرا دی۔

چھوٹی پھپھو کی آمد نے مجھے خوشگوار حیرت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ دبئی سے خاص میری شادی میں شرکت کی غرض سے آئی تھیں۔ انہوں نے بہت محبت سے مجھے گلے لگایا تھا۔ ان کے وجود کی گرمی' اپنائیت اور محبت کا احساس خالص تھا' بڑی پھوپھو اور بابا کی طرح اس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ میں پانچ سال بعد ان کی اسی محبت کو محسوس کر رہی تھی۔ ان کی آمد سے گھر کا ماحول یکسر تبدیل ہو چکا تھا۔ آتے ہی انہوں نے ارتضٰی سے کہہ کر ڈھولکی کا انتظام کروایا۔ اور پھر رات گئے تک یہ ہنگامہ جاری رہا۔ پھوپھو خود اس ہنگامے کا حصہ تھیں' خوش دلی اور خوش مزاجی میں ان کی دونوں بیٹیاں ان کا پرتو تھیں۔ مجھے ہمیشہ سے ان کی آمد کا انتظار رہتا تھا' ان کے ساتھ گزرا ہر پل میرے لیے یادگار ہوتا تھا۔

اگلے روز میں مسز شیرازی کی خاطر آفس نہیں گئی تھی۔ فوراً" زیاد آفاق کا فون آگیا۔

"تم آفس کیوں نہیں آئیں۔" اس نے چھوٹتے ہی دریافت کیا تھا۔ میں ایک دم مسکرا دی۔

"ایکچولی سر! پانچ روز بعد میری شادی ہے۔" میں نے اطلاع دینے والے انداز میں کہا تھا۔ وہ بھی مکمل طور پر میرے فقرے سے محظوظ ہوا۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن شادی تو پانچ روز بعد ہے۔ آپ

نے چھٹی آج کس خوشی میں کی ہے۔" دوسری جانب شاید وہ مسکرایا تھا۔

"اپنی شادی کی خوشی میں۔" میں نے برجستگی سے جواب دیا تھا۔ دوسری جانب سے بے اختیار قہقہہ ابھرا تھا۔

"یہ پٹی بھی تمہیں مسز شیرازی نے پڑھائی ہوگی۔ ان سے تو میں پوچھ لوں گا اور تم فوراً" آفس پہنچو۔" آخری میں اس کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا تھا۔ اس کا یہ انداز میرے لیے تفخر آمیز تھا' بالکل معیز جیسا' دھونس جماتا' اپنا حق مانگتا۔ مگر اب میری سوچوں اور خیالات پر معیز کا چہرہ کسی دکھ اور — غم کے بغیر تھا۔ معیز نے مجھے اپنی محبت سے آزاد نہیں کیا تھا مگر۔ میں اس کی خاطر اس کی محبت سے آزاد ہوگئی تھی۔ اور اب احساس جرم جیسا کوئی ناسور نہیں تھا' لیکن یہ بھی نہیں تھا کہ میں مکمل طور پر اپنی زندگی سے مطمئن تھی' البتہ خوش رہنے کی کوشش بھی میرے لیے ایک مثبت تبدیلی تھی۔

اگلے دو روز تک مہمانوں کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ چھوٹی پھپھو نے مجھے اپنے کمرے تک محدود کر دیا تھا۔

"اب تم مایوں بیٹھ چکی ہو' اس لیے باہر نکلنے کی کوشش بھی مت کرنا۔" وہ سنجیدگی سے تنبیہہ کرتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

مہندی کے فنکشن کو انفرادی طور پر منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ پہلے یہاں سے مہندی زیاد آفاق کے گھر جانی تھی اور پھر وہاں سے یہاں آنی تھی۔ تمام انتظامات مکمل کیے جا چکے تھے۔ جس دن یہاں سے مہندی جانی تھی' صبح سے ہی پورے گھر میں ایک ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی۔ گھر میں ایک ہنگامہ سا بپا تھا۔ یہ گھر تو ویسے بھی خاموشیوں کا عادی تھا اور اب اس قدر شور؟ اجنبی ہوتے ہوئے بھی یہ ماحول میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔ ہر کسی کو اپنی تیاری کی فکر تھی۔ بالآخر بابا کے سخت احکامات کے بعد دونوں لورفنز میں کھلنڈری پن آتی تھی۔ سب عجلت میں پورچ میں کھڑی گاڑیوں کی جانب روانہ ہو رہے تھے۔ سب کچھ ایک خواب جیسا تھا۔

گاڑیوں کے روانہ ہوتے ہی گھر میں ایک دم سناٹا چھا گیا تھا۔ اسی سناٹے میں ٹیلی فون کی بیل ایک بازگشت کی طرح ابھری تھی۔ فون اٹھانے پر دوسری طرف سے مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ میرے ہیلو ہیلو کرنے کے باوجود دوسری طرف سناٹا تھا۔ تھک ہار کر میں فون رکھنا ہی چاہتی تھی جب میری سماعتوں نے معیز کی سرگوشی نما آواز سنی تھی۔ یکلخت مجھے اپنے ہاتھ پاؤں سن ہوتے محسوس ہوئے۔

"عینی!" اس کا جذبوں سے چور آنچ دیتا سلگتا انداز میرے لیے غیر متوقع تھا۔

"میں تمہیں اپنی محبت سے آزاد کرتا ہوں۔ جو کچھ بھی ہوا' آئی ہوپ تم اسے بھول کر نئی زندگی کی شروعات کرو گی۔ میں تمہیں بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں' بالکل اس طرح جس طرح تم نے کیا۔ میں ہمیشہ تمہیں ایک بزدل اور کمزور لڑکی تصور کرتا رہا اور آج مجھے یہ ادراک ہوا ہے کہ قرۃ العین اس دنیا کی سب سے مضبوط لڑکی ہے اور معیز حیدر ایک کمزور ترین شخص۔" میرے ہونٹ کسی بچے کی طرح کپکپا رہے تھے۔ معیز حیدر کے سامنے میں اب بھی ایک کمزور لڑکی تھی۔ دس سال پہلے کا ایک ایک لمحہ کسی فلم کی طرح چل رہا تھا۔

"اس دنیا میں مجھے صرف عینی کی پروا ہے۔"

"مجھے پتا ہے کہ تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو۔ دنیا کی کوئی لڑکی عینی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عینی صرف ایک ہے جسے میری بیوی بننا ہے۔ فاریہ عینی نہیں ہو سکتی۔" ریسیور پر میری گرفت سخت ہوگئی تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے یہ بات مجھے کسی سے بھی چھپانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تو یہ بات صرف تم سے چھپانا چاہتا تھا۔" میں نے اپنی آنکھوں میں دھند اترتی محسوس کی تھی۔

دوسری جانب سے فون رکھ دیا گیا تھا۔

میرے پاس معیز کی کسی بھی بات کا جواب نہ تھا' وہ مجھ سے جواب طلب بھی نہیں کر رہا تھا۔ اس کا انداز حقائق کو تسلیم کیے ہوئے تھا۔ معیز مکمل طور پر میری زندگی سے نکل گیا تھا اور یہ آخری تکلیف وہ سوئی بھی نکل چکی تھی۔ اب مجھے خوش رہنے کی ایکٹنگ نہیں کرنی تھی۔ اب مجھے خوش رہنا تھا۔ اپنی خاطر' زیاد آفاق کی خاطر۔ میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے کمرے میں آگئی۔ میں سونا چاہتی تھی' بیڈ پر دراز ہوتے ہی میری آنکھیں خود بخود بوجھل ہونے لگیں۔ یہ آسودگی تھی یا پھر طمانیت کا احساس' اب مجھے معیز کی جانب سے کسی قسم کے خدشات کا سامنا نہ تھا۔ معیز کی یادیں' آوازیں' خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ نجانے کتنے لمبے سفر کی تکان میرے وجود پر حاوی ہو گئی تھی۔

ایک عجیب سی کیفیت کے تحت میری آنکھ کھل گئی تھی۔ تھوڑی دیر تک میں یونہی لیٹی رہی مگر "مومو" کے خیال کے تحت میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ مومو میرے ساتھ سونے کی عادی تھی اور اب وہ یہاں نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا سب کی واپسی ابھی نہیں ہوئی تھی۔ لائٹ آن کرتے ہوئے میں نے وال کلاک پر نظر مبذول کی تو میں ایک دم پریشانی سے دروازے کی طرف دوڑ پڑی۔ گھڑی رات کے تین بجا رہی تھی۔ میں متفکر انداز لیے اپنے کمرے سے نکلی۔ مگر لاؤنج میں ادھر ادھر سوئے ہوئے افراد نے مجھے گوناگوں سکون کا احساس دیا تھا۔ مومو یقیناً" ارتضیٰ کے کمرے میں تھی یا پھر مما کے پاس شاید مجھ سے دوری کی عادت ڈالی جا رہی تھی۔

اپنے کمرے میں واپس آتے ہوئے میرے قدم پرسکون تھے۔ مگر "اسٹڈی سے ابھرتی دبی دبی آوازوں نے میرے قدم ساکت کر دیے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ بابا ابھی تک سوئے نہیں تھے' مگر اس وقت وہ کس سے باتیں کر رہے تھے۔ میری متجسس خو نے میرے قدموں کو اسٹڈی کی طرف پلٹنے پر مجبور کر دیا۔ دبی دبی آواز اپنا مفہوم واضح کر رہی تھی' بابا کی آواز بری طرح میرے اعصابوں کو منتشر کر گئی تھی۔

بے وقعتی کا احساس اس سے قبل اس قدر شدید تر نہ تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میرے دماغ کی کوئی شریان پھٹ جائے گی۔ اپنے ناکردہ گناہ جاننے کے لیے میں نے بارہا بابا کی باتیں چھپ کر سنی تھیں' پھپھو کے رویے کو پرکھا تھا اور اب جب حقیقت اپنا لبادہ اتار کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی تو میرا اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا تھا۔ میں واضح طور پر اپنے قدموں کی لرزش کو محسوس کر سکتی تھی۔

یہ کیسا انکشاف تھا۔ میرا وجود کسی بھربھری ریت کی مانند بکھر رہا تھا۔ لرزتے قدموں کے ساتھ اپنے کمرے کی راہ لیتے ہوئے میں شکستگی کی اس انتہا پر تھی جہاں سے واپسی اب ناممکنات میں شمار ہو چکی تھی۔

تھوڑی دیر پہلے کا ماحول' خوشگوار قہقہے' چہل پہل اب ماتم میں تبدیل ہو چکی تھی۔ سوگوار سناٹا چاروں اور چھا گیا تھا۔ میں اپنی اصل دنیا میں لوٹ آئی تھی اور یہی میرا مرکز تھا۔

چوبیس سال تک اس حقیقت پر پردہ ڈالے رکھا گیا تھا۔ میں پھپھو اور بابا کی نفرت کو بے نام گردانتی رہی' میری نظر میں اس نفرت کے کوئی معانی ہی نہ تھے۔ میں نے خود کو خود ترسی اور زود رنجی میں مبتلا رکھا۔ میں بابا کے اس نفرت انگیز رویے کو حق پر ہونے کی سند نہیں دے سکتی تھی اور اب مجھے ایسا ہی کرنا تھا۔

میری آنکھوں میں آنسو کا ایک بھی قطرہ نمودار نہیں ہوا تھا۔ میں حقیقت جان گئی تھی۔ میری بے بسی نے مجھے نہیں رلایا تھا۔ ایک وحشت تھی جس نے میرا نوزائیدہ سکون درہم برہم کر دیا تھا۔ رات کے تیسرے پہر سے صبح تک کی مسافت ایک عذاب ناک مسافت تھی۔

ایک بار پھر گھر میں وہی ہلچل تھی' وہی شور بپا تھا جو کچھ دیر پہلے تک طمانیت انگیز تھا۔ اب یہ آوازیں مجھے متاثر نہیں کر رہی تھیں۔

"ہم واپس آئے تو تم سو رہی تھیں' ایسی کون سی نیندیں ہیں جو پوری ہونے میں نہیں آ رہیں۔" دریہ شرارتی انداز میں کہتے ہوئے میرے بیڈ پر دراز ہو گئی۔

میں بس ٹکر ٹکر اس کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ میں اسے نہیں بتا سکتی تھی کہ کچھ دیر پہلے کی نیند میری زندگی کی سب سے پر سکون نیند تھی اور اب ایسی نیند میری زندگی میں کبھی نہیں آسکتی تھی۔ معاً" چھوٹی پھوپھو کمرے میں داخل ہوئیں۔ وہ عجلت میں سب کو اپنی اپنی تیاریوں کے حوالے سے ہدایات سے نواز رہی تھیں۔ اور وہ جو سب کل کے فنکشن کی روداد سنانے کو بے تاب تھیں' برے برے منہ بناتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"تم ابھی تک ایسے ہی بیٹھی ہو۔ جلدی جلدی مہندی لگوا کر آرام کرلو۔ پھر تمہاری سسرال والے مہندی لے کر آجائیں گے۔ ان کی واپسی تک مہندی لگوانے کا موقع ہی نہیں ملے گا ویسے بھی فنکشن اٹینڈ کرنے کے بعد اس قدر تھکن ہو جاتی ہے پھر کسے اتنی فرصت ہوگی کہ وہ تمہیں مہندی لگائے۔ تمہیں اپنا خیال خود رکھنا ہوگا۔ ان لوگوں کی آس پر رہیں تو ہو چکی تمہاری شادی۔" کمرے میں پھیلی ہوئی چیزوں کو عجلت میں اپنے اپنے ٹھکانوں پر منتقل کرتے ہوئے وہ درپردہ اپنی بیٹیوں کی نااہلی ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس گھر کے در و دیوار کو آگ لگا دوں۔ اس گھر کے ایک ایک مکین سے اپنی اذیت کا حساب طلب کروں۔ سب کچھ فنا کردوں اور خود ایسی جگہ چلی جاؤں جہاں کوئی بھی نہ ہو۔ کم از کم اس گھر کا کوئی بھی فرد نہ ہو۔

پھوپھو کے باہر جانے کے چند منٹوں بعد ان کی چھوٹی بیٹی کمرے میں وارد ہوئی تھی۔ شکل سے صاف ظاہر تھا کہ اسے زبردستی بھیجا گیا تھا۔ مگر پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ بڑے خوشگوار انداز میں میری جانب لپکی۔

"قسم سے عینی آپی! آپ نے رات کا فنکشن اٹینڈ نہ کرکے بہت برا کیا۔ پتا ہے ہم نے کتنا انجوائے کیا۔" وہ اپنی ماں کی طرح اپنائیت آمیز لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ میں کسی بت کی مانند اسے دیکھ رہی تھی یہاں تک کہ اس نے میرا ہاتھ تھام کر مہندی لگانا شروع کر دی۔ وہ اپنی مہندی لگانے کی مہارت کے بارے میں خود ہی رطب اللسان تھی۔ بقول اس کے کہ اس جیسے دیدہ زیب ڈیزائن کسی ٹاپ بیوٹیشن کے پاس بھی نہیں ہوسکتے تھے۔ اگر میں ہوش و حواس میں ہوتی تو یقیناً" سامیہ کی اس عرق ریزی کی تعریف ضرور کرتی' مگر میرے اندر تو اس وقت ایک جوار بھاٹا سا ابل رہا تھا۔

دو گھنٹے بعد سامیہ اپنے نصف کام سے فارغ ہو چکی تھی۔

"توبہ ہے عینی آپی! کتنا شوق ہے آپ کو مہندی لگوانے کا مجال ہے جو آپ ذرا سا بھی ہلی ہوں۔" میرے لب اب بھی ایک دوسرے میں پیوست تھے۔

زندگی کے ان گنت لمحات میرے لیے تکلیف دہ تھے' جنہیں میں بھول کر بھی یاد کرنا نہیں چاہتی تھی' معیز کی محبت کو ٹھکرا دینے کے بعد آج کے یہ لمحات ان تمام لمحات پر بھاری تھے' جن کی اذیت نے مجھے پل پل رلایا تھا' مگر انہیں میں پھر بھی سہہ گئی تھی۔ مگر آج جو تکلیف دہ انکشاف ہوا تھا وہ میرے ضبط کی تمام حدیں عبور کر چکا تھا۔

اب سامیہ کے نقش و نگار کی مہارت میرے پیروں پر ظاہر ہو رہی تھی۔ مہندی لگاتے ہوئے وہ کس کس پر کیا تبصرہ کر رہی تھی' کون سے موضوعات زیر بحث لا رہی تھی۔ کس کی تعریف کر رہی تھی اور کون اس کی برائی کی زد میں آ رہا تھا' میں سن نہیں سکتی تھی نہ ہی میرا دھیان اس کی لگائی گئی مہندی کی جانب تھا۔

معاً" موبائل کی بیپ مجھے خیالوں کے گرداب سے کھینچ لائی۔ میں بیڈ پر خود سے کچھ فاصلے پر پڑے موبائل کو دیکھ رہی تھی۔ موبائل کی آواز میرے وجود میں کسی قسم کی جنبش کا باعث نہیں بنی تھی۔

موبائل کی اسکرین پر نظر ڈالتے ہوئے سامیہ معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنے لگی تھی۔ پھر مہندی ایک سائیڈ پر رکھ کر اس نے فون میرے کان کے ساتھ لگا دیا تھا۔ جسے میں نے اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ جواب میں سامیہ چلائی تھی "کمن میں قصداً" اس کی جانب متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ بظاہر میری توجہ کا مرکز فی الحال

فون کرنے والا تھا۔

"کین آئی ڈسٹرب یو میڈم؟" میرے ہیلو کہنے سے پہلے ہی زیاد آفاق کی آواز تمام تر شوخیوں سمیت ابھری تھی۔ مجھے اپنے اعصاب جھنجھناتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس مقام پر اس شخص کا سامنا؟ میرے وجود پر ایک اور بوجھ آ گرا تھا۔ اپنے ساتھ ساتھ میں اس شخص کو بھی اس عذاب ناک دلدل میں کھینچنے کا سامان کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے۔ کیا تم مجھ سے شرمانے کی کوشش کر رہی ہو؟" الفاظ کیسے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں' زبان کیسے ساتھ دینے سے قاصر ہو جاتی ہے۔ میں یہ محسوس کر سکتی تھی۔

"اس کا مطلب ہے تم واقعی شرما رہی ہو؟" زیاد آفاق نے میری خاموشی کو جو لبادہ اوڑھایا تھا وہ میرے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا اور پھر میں زبردستی ہی سہی خود کو خاموش نہیں رکھ پائی تھی۔

"نہیں! میں شرما نہیں رہی۔" میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"کچھ دیر تو مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا ہوتا۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا اور میں چاہتے ہوئے بھی اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔

"بائی دا وے تم اس وقت کیا کر رہی ہو۔ میں تو اس وقت خوب بور ہو رہا ہوں یہ شادی کروانا بھی ایک آرٹ ہے اور میں کم از کم اتنا آرٹسٹک بندہ نہیں ہوں۔ میں تو سمپل نکاح سیرمنی پر بلیو کرنے والا انسان ہوں۔" اس کا لب و لہجہ سرشاری کی انتہا پر تھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔" اس بار وہ میری خاموشی محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا تھا اور میں اسے اپنے اوپر بیتی قیامت کا پتا دینا نہیں چاہتی تھی۔

"میں سامیہ سے مہندی لگوا رہی ہوں۔" میں نے مختصراً" کہا۔

"کیسی لگ رہی ہے؟" اس نے استفسار کیا تھا۔

"کون سامیہ؟" اس عرصے میں پہلی بار میں برجستگی

سے گویا ہوئی تھی۔

"میں تمہاری مہندی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

اس نے سنجیدگی سے میری تصحیح کی تھی۔

"خیر کوئی بات نہیں تم مجھ سے تمام بدلے ابھی لے سکتی ہو۔ آنا تو تمہیں میرے پاس ہی ہے۔"

چند منٹ تک وہ ادھر ادھر کی گفتگو کرتا رہا تھا اور پھر اس نے کال ڈسکنیکٹ کر دی تھی۔ اس سے باتوں کے دوران میرے ذہن میں بننے والا خیال فیصلہ کن مراحل میں داخل ہو چکا تھا۔ اب مجھے کسی مناسب موقع کی تلاش تھی۔

☼ ☼ ☼

اب انہیں کسی مناسب موقع کی تلاش تھی مگر بختاور کی خاموشی نے ان کے لبوں پر قفل سا ڈال دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں، ان کی یہ بات سن کر وہ پھٹے سے اکھڑ سکتی تھی، فی الحال وہ خود کو اس کی خاموشی کا عادی بنائے رکھنے کی کوشش جاری رکھے ہوئے تھیں۔ بختاور کو یوں تنہا اور خاموش بیٹھا دیکھ کر ان کا دل اداس ہو گیا تھا۔

"اتنی چپ مت رہو بختاور! میرا دل کٹتا ہے۔"

جواب میں وہ کچھ بولے بغیر ان کا منہ دیکھتی رہی تھی۔ اس کے چہرے کی وحشت اب اس کے چہرے کا لازمی جز بن چکی تھی۔ اس کی آنکھ کا خاموش تاثر اور خالی پن انہیں نئے سرے سے دکھ میں مبتلا کر گیا تھا۔

"ڈاکٹر نے تمہیں سختی سے چہل قدمی کی تاکید کی ہے۔ اس طرح بند کمرے کا گھٹن زدہ ماحول نہ صرف تمہارے لیے نقصان دہ ہے بلکہ۔" اس کی نظروں کا خاموش ارتکاز جو ابھی تھوڑی دیر پہلے سامنے کی دیوار پر مرتکز تھا، یکلخت ان کے چہرے پر آ جما تھا اور وہ اپنا فقرہ مکمل نہیں کر سکی تھیں۔ اب اس کی آنکھوں میں وہ سراسیمگی اور خوف کا عنصر نمایاں ہوتے دیکھ رہی تھیں۔ وہ زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ پچھلے کچھ ماہ سے وہ اس سے اسی طرح زبردستی کرنے کی عادی ہو گئی تھیں۔ زبردستی کھانا کھلانا، ڈاکٹر سے چیک اپ کروانا۔ میڈیسن دینا۔ بختاور کی خاموشی اور ساکت انداز اسی رویے کا متقاضی تھا۔ اب بھی وہ اسے زبردستی لان میں گھسیٹ لائی تھیں۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح مشینی انداز سے ان کے ساتھ واک کر رہی تھی۔ ان کی بہت کوششوں کے باوجود نہ تو اس کا خوف کم ہوا تھا اور نہ ہی اجنبیت کا تاثر۔

دادو اسے اس کے مخصوص کمرے میں چھوڑ کر باہر نکل گئیں، غالباً" نماز پڑھنے گئی تھیں۔ وہ اسی طرح چلتی ہوئی بیڈ پر دراز ہو گئی۔

مرنے کی خواہش رکھنے کے باوجود زندہ رہنا کتنا دشوار ترین عمل تھا۔ گزشتہ سات ماہ سے وہ اپنی زندگی کے ناپسندیدہ ترین دن گزار رہی تھی۔ ہر لمحہ نفرت انگیز تھا، ہر پل اذیت آمیز تھا اپنی درماندہ زندگی سے چھٹکارہ پانے کا فیصلہ تو وہ اسی روز کر چکی تھی جب ڈیڈی نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ ایک کے بعد ایک رشتہ بند مٹھی سے ریت کی مانند پھسل گیا تھا۔ دادو کی سخت نگرانی کے باوجود اس کی وضع کی گئی حکمت عملی، عملی اقدام سے محض چند انچ کی مسافت پر تھی۔ اپنے مقرر کیے گئے وقت پر وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر کچن کی جانب بڑھی تھی۔ رات کے اس پہر دادو کے جاگ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اسی چیز کی یقین دہانی نے اسے اس پہر کا انتخاب کرنے میں مدد دی تھی۔

تیز چھری کیبنٹ سے نکالتے ہوئے اس کے ہاتھ نہیں کانپے تھے۔ اس کے وجود میں ہیجان آمیز جنبش نہیں ہوتی تھی۔ وہ بس اس تکلیف دہ احساس سے نجات پانا چاہتی تھی۔ کچن سے اپنے کمرے کی راہ لیتے ہوئے دفعتاً" اس کی سماعتوں نے دادو کی درشت آواز جذب کی تھی۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے کے باوجود وہ ان کی آواز واضح طور پر سن سکتی تھی۔ بختاور کے اپنے کمرے کی طرف بڑھتے قدم ساکت ہو گئے تھے۔

"بس علی گوہر! بہت من مانی کر لی تم نے، اب میں تمہیں ایسا کچھ نہیں کرنے دوں گی۔ ایک گناہ نادانستگی میں بختاور سے سرزد ہوا لیکن میں تمہیں دانستہ دوسرا گناہ نہیں کرنے دوں گی۔ بختاور کا ابارشن کسی صورت نہیں ہو گا۔"

اس کا جی چاہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں جا سمائے مگر اس پل تو جیسے پیروں تلے زمین بھی نہیں باقی رہی تھی۔ سب کچھ تو وہ گنوا چکی تھی، فقط ایک دھڑکتا دل ہی بچا تھا اور اسی سے وابستہ چلتی سانسوں کو وہ ختم کر دینا چاہتی تھی، جب ڈیڈی نے اسے احساس دلایا تھا کہ وہ تنہا مرنے نہیں جا رہی تھی اپنے ساتھ ایک اور زندگی کو ختم کرنے جا رہی تھی۔

"آپ مجھے سب کے سامنے تماشا بنوا دینا چاہتی ہیں۔ میں جانتے بوجھتے اس ذلت کو قبول نہیں کر سکتا۔" ڈیڈی کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ دادو کے مضبوط لہجے سے ہرگز بھی متاثر نہیں ہوئے تھے۔

"تماشا.....؟" وہ درمیان میں چلائی تھیں۔

"تمہارے لیے اب بھی یہ سب تماشا ہے۔ آنکھیں کھولو علی! زندگی تمہیں اپنا ایک رخ دکھا رہی ہے، حقیقت سے آنکھیں چراؤ گے تو روز یونہی کرچی کرچی ہو گے۔ روز بکھرو گے۔"

"کون سی حقیقت اماں! یہی کہ میری بن بیاہی بیٹی ماں بننے جا رہی ہے، مجھے واقعی خوش ہونا چاہیے۔ میں نانا بننے والا ہوں۔ اونہہ اتنا لبرل نہیں ہوں میں اماں! اس معاملے میں اتنا ہی دقیانوسی ہوں جتنا کہ اس معاشرے کا کوئی بھی باپ ہو سکتا ہے۔" ان کے لہجے میں استہزا تھا۔

"اتنی دقیانوسیت تم اگر اپنی اولاد کی تربیت میں استعمال کرتے تو شاید تمہیں یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔ رنگینیوں کے در وا کر کے تم یہ کیسے توقع کر سکتے تھے کہ تمہارے بچے پارسائی کا دامن تھامے رہیں گے۔ رنگینی انہیں اپنی طرف نہیں کھینچے گی۔" دادو ان کے کسی بھی انداز سے مرعوب نہیں ہوئی تھیں۔

"بہر طور میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ ہاں تمہارا سوشل سرکل بہرحال اس حقیقت سے بے خبر رہے گا۔ اس کی گارنٹی میں تمہیں دیتی ہوں۔" اندر خاموشی چھا گئی تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے پچھلے دو ماہ سے وہ صرف آنسو بہا رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر دادو کے کمرے کے دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ دادو اب بھی گناہ ثواب کے حساب و کتاب میں گم تھیں، اب بھی وہ زندگی اور اس سے وابستہ حقیقتوں کے روزن روشن کیے ہوئے تھیں، اب بھی ان کے لیے راہ دکھانے والا جگنو ٹمٹما رہا تھا، اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود ان کا ضبط قائم تھا، بختاور نے اپنا جھکا سر اٹھا کر، اپنی الجھی بکھری سوچوں کو مجتمع کر کے ایک نقطے پر مرکوز کرنا چاہا تھا۔ اس نے مرنا چاہا تھا۔ مگر باوجود یہ سوچنے کے کہ اس کی وجہ سے سب کی زندگیاں خارزار پر گھسٹ رہی تھیں۔ وہ اپنے ساکت قدموں کو آگے نہیں بڑھا پائی تھی۔ وہ زندہ رہنا چاہتی تھی، اس سوچ میں کوئی مغالطہ نہ تھا، کوئی غلط فہمی نہیں تھی، محض دادو کی خاطر وہ ایک اور گناہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ تیز دھار چھری یکلخت اس کے ہاتھوں سے پھسل کر فرش پر جا گری۔ اس کی سوچوں کے تنے ہوئے تار ایک کے بعد ایک ٹوٹتے چلے گئے اور پھر یہ ذلت آمیز زندگی اس نے قبول کر لی تھی، مگر سابقہ انداز واپس نہیں آ سکتا تھا۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے کے ساتھ گھسٹ رہی تھی کیونکہ دادو ایسا چاہتی تھیں۔

عزیز رشتہ داروں میں یہ مشہور کر دیا گیا تھا کہ وہ دادو کے ساتھ لندن میں مقیم اپنے رشتے داروں سے ملنے گئی ہے، جبکہ وہ دادو کے ساتھ انیکسی میں اپنی پریگننسی کے دن گزار رہی تھی۔

اس روز کے بعد اس نے شجوق عمر سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا، البتہ وہ بار بار رابطے کی کوشش کر چکا تھا۔

"وہ صرف ایک بار تم سے ملنا چاہتا ہے۔" سارہ کی لجاجت سے کی گئی سفارش کو بھی اس نے درخور اعتنا نہیں جانا تھا۔

وہ خالی الذہنی کے عالم میں اپنے نیم تاریک بیڈ روم

میں بیٹھی کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھنے میں مصروف تھی جب اس نے باہر سے ابھرتی ایک غیر معمولی مگر قدرے خوشگوار ہلچل کو محسوس کیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اٹھ کر کھڑکی کے نزدیک آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کی پہلی نظر حمزہ بھائی پر پڑی تھی۔ ان کی اس کی جانب پشت تھی۔ وہ اسے نہیں دیکھ سکتے تھے' لیکن وہ بخوبی انہیں دیکھ رہی تھی' بہت عرصے بعد اس نے اپنی آنکھوں میں گہری دھند اترتی محسوس کی تھی' محض ایک پل نے کیسے اس سے خون کے رشتے چھین لیے تھے۔ وہ دھندلی آنکھوں سے حمزہ بھائی کے ساتھ ان کی نئی نویلی دلہن کو دیکھ رہی تھی۔ حمزہ بھائی سوٹ کیسز ڈگی میں ڈال رہے تھے' وہ دور سے بھی ان کے چہرے کا اطمینان اور خوش کن احساس محسوس کر سکتی تھی۔

پورچ میں انہیں رخصت کرتے اس کے دونوں بھائی اور ممی' ڈیڈی اسے یاسیت میں مبتلا کر گئے تھے اگر یہ سانحہ اس کی زندگی میں رونما نہ ہوتا تو وہ اس طرح اپنے عزیز از جان رشتوں کو حسرت سے اس کھڑکی کے پار سے دیکھنے پر مجبور نہ ہوتی مگر اب وہ مجبور تھی' ان کے قریب نہیں جا سکتی تھی' ان کی محبتوں کو ایک بار پھر قریب سے محسوس نہیں کر سکتی تھی۔ شدت کرب سے وہ آنکھیں میچ گئی۔ وہ اس منظر سے بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی' کھڑکیوں کے پٹ بند کرنے کے باوجود وہ منظر ہنوز اس کی نگاہوں کے سامنے زندہ و جاوید تھا۔ وہ اس سے چھٹکارہ نہیں پا سکی تھی۔ تب اسے احساس ہوا تھا کہ اس کے والدین کی محبت پانی پر ثبت تحریر کی مانند غیر مستقل ثابت ہوئی تھی' محض ایک طوفانی لہر نے یکلخت اس تحریر کے نقش پا مٹا دیے تھے جبکہ دادو کی محبت آج بھی قائم تھی۔ ممی' ڈیڈی اور اس کے بھائیوں کی طرح انہوں نے اسے نہیں دھتکارہ تھا' حالانکہ ان کے چہرے پر بختاور کے لیے سابقہ نرمی' حلاوت اور محبت عنقا تھی' مگر اس کے باوجود وہ اس کے وجود سے بے خبر نہ تھیں۔ دادو کے اس رویے کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ان کے احکامات بجا لا رہی تھی' ان کا ہر حکم کسی بھی احتجاج کے بغیر تعمیل کی سند پا رہا تھا۔

جس رات دادو اسے اپنی شریک راز ڈاکٹر کی کلینک میں لے کر گئیں۔ اس کی حالت تشویش ناک حد تک نازک تھی۔ لیبر روم سے ملحق روم میں وہ دادو کی آغوش سے لپٹی کرب ناک تکلیف سے دوچار تھی۔ اور دادو سے اس کی حالت دیکھی نہیں جا رہی تھی۔

"ہمیں آپریشن کرنا ہو گا۔" ڈاکٹر زریں اس کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے خاصی پریشانی سے گویا ہوئی تھیں۔

"میں نے آپ کو پہلے ہی کہا تھا کہ آپ بختاور کو ٹینشن فری ماحول میں رکھیں گی' تب ہی نارمل ڈلیوری عمل میں آسکتی ہے۔" دادو کے لیے ان کا تادیبی انداز بے معنی تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات نے ڈاکٹر کو مزید کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔ وہ تمام معاملے سے کماحقہ واقف تھیں' لہٰذا مزید تنبیہی رویہ بے سود تھا۔

وہ خاموشی سے آپریشن کی تیاری کی خاطر دوسرے روم میں چلی گئی تھیں۔

"دادو!" بختاور کی درد و کرب میں ڈوبی سسکی نما آواز ان کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔ وہ پوری جان سے اس کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔ آنسوؤں سے تر بتر چہرہ دیکھ کر ان کا دل کرب کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب رہا تھا۔ انہوں نے بے اختیار اسے خود سے لپٹا لیا تھا۔

"دادو بس میں مزید جینا نہیں چاہتی' میں نے آپ سب کو بہت دکھ دیے ہیں۔ آپ کا سر شرم سے جھکا دیا ہے دادو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

"پلیز! میری زندگی کی دعا مت کیجیے گا۔ آپ اللہ سے میری موت مانگیے گا۔ کیونکہ میں ایسا چاہتی ہوں۔ آپ نے ہمیشہ میری ہر خواہش پوری کی آج آخری بار پوری کر دیں۔" دادو صدمے کی سی کیفیت میں اسے اس انداز میں فریاد کرتے دیکھ رہی تھیں۔

"ممی' ڈیڈی' فصیح' حمزہ اور رضا بھائی کے بغیر میں مزید زندہ نہیں رہ پاؤں گی۔ مجھے ان محبتوں کے بغیر زندہ نہیں رہنا۔ وہ سب میرے بغیر جینے کے عادی ہو گئے' انہوں نے کہا کہ بختاور ان کے لیے مر گئی اور بختاور واقعی مر گئی۔ انہوں نے ایک بار بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے کہا اور سب کچھ ختم ہو گیا۔ لیکن دادو! سب کچھ ختم کیوں نہیں ہو رہا۔"

"بختاور! ایسے مت کہو۔ ایسے مت روؤ۔ تیری دادو کو آج بھی بختاور کی ضرورت ہے۔"

دادو کے آنسو اس کے چہرے پر گر رہے تھے۔

"لیکن ممی' ڈیڈی کو میری ضرورت نہیں ہے اور میں ایک بار پھر ان کی ضرورت بننا چاہتی ہوں۔ میں بس ایک بار ان دونوں کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ آخری بار" دادو روتے ہوئے اسے اسٹریچر پر آپریشن تھیٹر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ پانچ گھنٹے کے جاں لیوا انتظار کے بعد ڈاکٹر زریں نے انہیں اس کی زندگی کی خوش خبری سنائی تھی۔ اس کی زندگی بچالی گئی تھی۔ اب ان کی آنکھوں میں تشکر کے آنسو تھے۔ وہ بہت ممنونیت سے ڈاکٹر زریں کو دیکھ رہی تھیں۔

"ماں اور بچی دونوں خیریت سے ہیں آپریشن تو میں نے کر دیا ہے لیکن اس کے بعد بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ میں چند ضروری ادویات لکھ دیتی ہوں' لیکن میڈیسن سے زیادہ۔ آپ کو اس کے اٹھنے اور بیٹھنے کا خیال رکھنا ہو گا۔ کم از کم ایک ہفتے تک تو اس کا بستر سے اٹھنا خطرناک ہو گا۔ البتہ آہستہ آہستہ آپ یہ عمل شروع کروا سکتی ہیں۔" ڈاکٹر زریں انہیں ہدایات دے رہی تھیں۔

"بچی کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟" دھیمے انداز میں کہتے ہوئے وہ استفہامیہ انداز میں ان کی جانب دیکھنے لگیں۔ یکلخت دادو کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا تھا۔ حالانکہ اس بارے میں وہ فیصلہ کر چکی تھیں اور اپنے فیصلے میں وہ ڈاکٹر زریں کو بھی شامل کرنے کی غلطی کر چکی تھیں۔ شاید اسی فیصلے پر مضبوطی سے قائم رہنے کا اندازہ کرنے کے لیے انہوں نے استفسار کیا تھا۔ پہلی بار انہوں نے خود کو کسی فیصلے کے بعد متزلزل پایا تھا۔

"ابھی میں نے اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کیا۔" نظریں چراتے ہوئے وہ متذبذب انداز میں گویا ہوئیں۔

☼ ☼ ☼

جس پل کا مجھے انتظار تھا' بالآخر وہ دن میری زندگی میں آیا ہی چاہتا تھا۔ اس سے قبل جب بھی میں نے اپنی شادی کے حوالے سے امی سے بات کی تھی' انہوں نے مجھے ٹوک دیا تھا' اپنی جگہ وہ بھی درست تھیں' وہ چاہتی تھیں کہ میں اپنی تعلیم مکمل کروں' ہر بار میں ان کے استدلال پر خاموش ہو جاتا تھا۔ مگر اس بار ان کے استدلال پر کیسی دراڑیں پڑی تھیں کہ انہوں نے خود ہی مجھے انہی دنوں شادی کی پیش کش کی تھی اور میں بس حیران سا انہیں سن رہا تھا۔ میں ان سے اس اچانک تبدیلی کی وجہ جاننا چاہتا تھا کہ جب وہ خود وضاحتی انداز میں گویا ہوئیں۔

"میں تو یہ چاہتی تھی کہ بختاور تعلیم مکمل کرے تب میں اس کی ماں کے سامنے شادی کا خیال رکھوں گی۔ مگر اب اس کی ماں خود چاہتی ہے۔ وہ جتنی جلدی ہو سکے یہ شادی کرنا چاہتی ہیں' حیرت تو مجھے بھی ہوئی تھی مگر بہت بعد میں جا کر مجھے پتا چلا کہ ان کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اور وہ اپنی زندگی میں بختاور کو اپنے گھر کا ہوتے دیکھنا چاہتی ہیں۔"

وجہ کوئی بھی تھی۔ اس لمحے مجھے اپنا آپ ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس ہوا تھا' سارا منظر جیسے ایک عجیب سی نغمگی لیے ہوا تھا۔

میں اگلے روز ہی پہلی فلائیٹ سے پاکستان پہنچ گیا تھا۔ مگر ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ میری آمد کسی کے لیے بھی خوشی کا باعث نہیں بن سکی تھی۔ میں نے اپنے گھر والوں کے رویوں اور چہروں کو سپاٹ دیکھا تھا۔ بے

چینی اور متضاد سوچوں کی شورش نے میرے اندر باہر بے قراری سی پیدا کردی تھی اب سب کا رویہ میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

اور پھر میں نے اپنی ماں اور بہن کے منہ سے بختاور کے لیے وہ کلمات سنے تھے جس نے حقیقی معنوں میں میرے اندر کی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ فقط دو دن کے اس مختصر دورانیے میں ایسی کون سی قیامت آگئی تھی کہ وہ اس طرح برملا بختاور سے اپنی نفرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ میرے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا تھا۔

ان کے مبہم انداز نے میری برداشت کی تمام حدود کو ختم کر دیا تھا اور پھر میں نے وہ لہجہ اپنایا تھا جو کم از کم میرا شیوہ نہ تھا‘ میں نے کبھی بھی امی اور آپی کو اتنے تلخ اور کڑوے انداز میں مخاطب نہیں کیا تھا۔ میرا یہ انداز دیکھ کر ان کی زبانیں گنگ ہو گئی تھیں۔ وہ متحیر انداز میں میری سمت دیکھ رہی تھیں۔

”تمہیں شرم آنی چاہیے ثاقب! ایک دو ٹکے کی لڑکی کے لیے تم اپنی ماں اور بہن سے بدتمیزی کر رہے ہو۔“ آپی جس طرح شرم دلانے والے انداز میں بولیں وہ میرے لیے قابل قبول تو تھا‘ مگر قابل اثر ہرگز بھی نہ تھا۔

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ کل تک جو لڑکی انمول ہیرا تھی آج وہ دو ٹکے کی کیسی ہو گئی؟ اس انقلابی نوعیت کی تبدیلی کا کوئی نہ کوئی تو پس منظر ہو گا۔“

”پس منظر جاننے کی کوشش کرو گے تو کسی سے بھی نظر ملانے کی ہمت نہیں کر سکو گے۔ تمہارے لیے محض اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ ہم نے بختاور سے تمہاری منگنی ختم کر دی ہے۔ وہ لڑکی ہمارے خاندان کی بہو بننے کے ہرگز بھی قابل نہیں ہے۔“ امی کی بجائے آپی بڑھ چڑھ کر بول رہی تھیں۔ امی کے چہرے کے تاثرات بھی کم و بیش اسی رویے کے غماز تھے۔ زندگی کے معاملات جذباتی اور جلد بازی سے بگڑتے ہیں سنورنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یقیناً“ امی کا بختاور کی امی سے کسی معاملے پر اختلاف ہوا تھا۔ یہی اختلاف اب کسی سنگین صورت حال کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔

چھ سال کا یہ تعلق ان کے لیے شاید مضبوط نہ رہا ہو۔ لیکن یہ تمام عرصہ میری ستائیس سالہ زندگی کا کل سرمایہ تھا۔ اپنی ماں اور بہن کی کسی نام نہاد انا کی خاطر میں اپنے اندر پھیلی محبت کی جڑوں کو آسانی سے اکھاڑ کر نہیں پھینک سکتا تھا‘ جس قدر آسان وہ دونوں تصور کر رہی تھیں۔ اس لیے مجھے نہ تو ان دونوں کی پروا تھی اور نہ ہی ان دونوں کی جانب سے کیے گئے منگنی توڑنے کے فیصلے کی۔ میرے لیے میری محبت ہی کافی تھی۔ میں ان دونوں کو نظر انداز کرتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔

صحیح معنوں میں مجھے آپی پر شدید غصہ آرہا تھا۔ بختاور انہیں شروع سے ہی ناپسند رہی تھی‘ اگرچہ کہ ان کی ناپسندیدگی منگنی سے قبل مجھے سمجھانے کی حد تک محدود رہی تھی مگر اب جس طرح انہوں نے مجھے دوٹوک انداز میں منگنی ٹوٹنے کی اطلاع دی تھی۔ اس سے میں ان کی مخاصمت کا اندازہ لگا سکتا تھا‘ انہوں نے مجھے خود سے بدگمان کر دیا تھا‘ میری عدم موجودگی میں امی کو بختاور سے بدگمان کرنا ان کے لیے مشکل نہیں رہا ہو گا۔ رہ رہ کر مجھے اپنے لندن میں قیام کے عرصے پر غصہ آنے لگا۔ نہ میں لندن جاتا اور نہ یہ نوبت آتی‘ نجانے کتنی ساعتوں تک میں ان دونوں کے اس غیر متوقع رد عمل پر کھولتا رہا۔

وہ دونوں اچھی طرح جانتی تھیں کہ میرے لیے بختاور کی کیا اہمیت تھی‘ اس سے رشتہ ختم کرنا تو درکنار میں اس کے خلاف بولا گیا ایک لفظ بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ امی اور آپی میری اس کیفیت کا ادراک رکھنے کے باوجود ایسا کر رہی تھیں۔

یقیناً“ امی کی بختاور کی ممی سے کسی قسم کی تلخ کلامی ہوئی تھی۔ اگرچہ کہ وہ ایک عرصے سے بہترین دوستیں چلی آرہی تھیں مگر بہرحال اس رشتے کے بعد دونوں فریقین کے رشتے کی نوعیت بھی تبدیل ہو چکی تھی۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا کہ بختاور میں ایسی کوئی

بات نہیں تھی جسے میری ماں اور بہن جواز بنا کر اس رشتے کو رد کر سکی تھیں۔ وہ اپنے خاندان کی نسبت خاصی مختلف نیچر کی لڑکی تھی‘ اگرچہ کہ اس کی ماں ایک بہت ماڈرن عورت تھی مگر بختاور کو میں نے کبھی بھی الٹے سیدھے فیشن کرتے نہیں دیکھا تھا۔ درحقیقت مجھے اس کی سادگی اور خاموشی نے اپنی جانب مائل کیا تھا۔ ٹین ایج میں بھی اس کے اندر ایک عجیب سا گریس تھا جو عموماً“ اس عمر کی لڑکیوں میں عنقا تھا اور پھر وہ تو نادیہ جیسی باتونی لڑکی کی بھی دوست تھی۔

نجانے کب میری نگاہوں نے اسے ایک نئے رشتے کی نظر سے جانچا تھا۔ مگر یہ یقینی بات تھی کہ اس نظر کے بعد میرا خود پر اختیار برائے نام رہ گیا تھا وہ مجھ سے چھ سال چھوٹی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ کم عمر ہے اور میری پسندیدگی کا اظہار اس گھر میں تو کیا اس کے گھر میں بھی انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔

اس کے فرسٹ ایئر میں آتے ہی میری محبت نے اپنا آپ منوانا چاہا تھا‘ جب کسی شک اور شبے کی گنجائش نہ تھی‘ جب سب کچھ صاف تھا تو میری محبت منظر پر آنے کے لیے واضح نقوش کی متقاضی تھی۔

اگرچہ کہ میں اپنے گھر والوں کے سخت رد عمل سے کم و بیش واقف تھا‘ مگر اس کے باوجود میں نے بختاور سے اپنی وابستگی کا اظہار کر دیا تھا۔ پھر وہی ہوا تھا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ میرے گھر والوں کو میرے اس اظہار پر شدید ترین جھٹکا لگا تھا۔ وہ شاید مجھ سے یہ سب توقع نہیں کر رہے تھے مگر میری سنجیدگی اور پھر اٹل انداز میں اس فیصلے پر ڈٹے رہنے کو انہوں نے خاصا سیریس لیا تھا اگر تھوڑا بہت تامل بھی تھا تو صرف آپی کی وجہ سے‘ وہ اپنی نند کا رشتہ مجھ سے کرنا چاہتی تھیں۔ آپی کی شدید ترین ناپسندیدگی کے باوجود میری بختاور سے منگنی کر دی گئی تھی۔ میرے خدشات اور اندیشے اپنی موت آپ مر گئے تھے۔ اب مجھے بختاور کے چھن جانے کا کوئی خوف نہ تھا۔ اب میں یکسوئی سے اپنی اسٹڈی پر توجہ دے سکتا تھا۔

ایم ایس کمپلیٹ کرنے سے پہلے لندن میں ہی مجھے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں انٹرنل شپ کے دوران ایک پرکشش جاب آفر ہوئی تھی۔ پاکستان کے مقابلے میں مجھے یہاں اپنا مستقبل زیادہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ اپنے والدین کو راضی کرنا مجھے کبھی بھی دشوار ترین عمل نہیں محسوس ہوا تھا‘ لندن میں مستقل طور پر رہائش رکھنے کا اپنا یک طرفہ فیصلہ بھی میں ان سے منوا چکا تھا‘ اب تو بس اگر زندگی میں کسی کی کمی تھی تو وہ بختاور تھی۔ جاب ملتے ہی میں نے اپنی شادی کے سلسلے میں امی سے بات کی تھی‘ ہرچند کہ بختاور کے حوالے سے میری یہ بے قراری انہیں اچھی نہ لگتی ہو گی مگر میں پھر بھی ان سے اپنی یہ بے قراری پوشیدہ نہیں رکھ پاتا تھا۔

اگلے دو سال بعد تک میرے پاکستان آنے کے کوئی چانسز نہ تھے اور میں کم از کم شادی کے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی بختاور کے ایم بی اے کا فرسٹ سمسٹر چل رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی تعلیم کے حوالے سے خاصی پکی تھی‘ لیکن تعلیم کا کیا تھا وہ وہاں لندن سے بھی اپنا ایم بی اے کمپلیٹ کر سکتی تھی۔ میں کم از کم ایسے مردوں میں شامل نہیں تھا جو شادی کے بعد تعلیم حاصل کرنے پر کسی قسم کا اعتراض کرتے ہیں۔

امی نے میرا یہ مدعا سنا ضرور تھا مگر مجھے کسی بھی قسم کی آس میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا۔ انہوں نے مجھے صاف اور واضح الفاظ میں انکار کر دیا تھا۔

”تم اسے اپنی ایجوکیشن کمپلیٹ کرنے دو۔ شادی کے لیے تم دونوں کی عمریں نکلی نہیں جا رہیں۔“ خفیف سے طنز کے ساتھ انہوں نے اپنی بات مکمل کی تھی۔ اس کے بعد میں بھی کسی قسم کا اعتراض اٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

ایک سال کسی نہ کسی طرح گزر گیا تھا‘ میرا فی الحال پاکستان جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ معاً“ ایک روز امی کی کال نے مجھے تحیر زدہ کر دیا تھا۔ وہ میری جلد از جلد شادی کرنا چاہ رہی تھیں‘ میری خوشیوں کا تو جیسے کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا۔ کمپنی کانٹریکٹ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے میں اگلے ہی دن کی فلائیٹ سے کراچی پہنچ گیا تھا اور

یہاں پہنچ کر ایک تکلیف دہ اور گمبھیر صورت حال نے میرا استقبال کیا تھا۔ جب سب کچھ دسترس میں تھا‘ میری خواہشات‘ میرے خواب اور اس کی تعبیریں تو آپی کہہ رہی تھیں کہ بختاور اس گھر کی بہو بننے کے ہرگز بھی قابل نہ تھی۔ کچھ بھی تھا میں اتنی آسانی سے حالات کو آپی کی مٹھی میں جاتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں اتنی آسانی سے اس فیصلے کو قبول نہیں کر سکتا تھا۔ جب منزل کا تعین ہو چکا تھا‘ جب پڑاؤ ڈالنے کا وقت آیا تھا‘ تو سب کچھ امی اور آپی کے لیے غیر مناسب ہو گیا تھا۔ اس بار تو ڈیڈی بھی ان دونوں کا ساتھ دے رہے تھے۔

نجانے کتنی دیر تک میں خود سے لڑتا رہا تھا‘ معا" کسی خیال کے تحت میں چونک سا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼
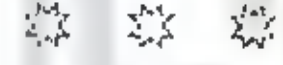
معا" وہ کسی خیال کے تحت چونک سی گئی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ گہری نیند میں تھی۔ اس نے خواب نہیں دیکھا تھا‘ مگر اس کی سماعتیں وہ آہٹیں محسوس کر رہی تھیں‘ جس سے ناتا ٹوٹنے کا اسے ذرہ برابر افسوس نہیں ہوا تھا۔ ایک تند و تیز لہر آئی تھی اور سب کچھ فنا کر گئی تھی۔ اسے اپنے وجود پر خار ہی خار اگتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔ ان عجیب سے احساسات کو نظر انداز کرتی وہ کروٹ بدل کر ایک بار پھر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

معا" کمرے میں ایک بار پھر وہی آواز گونجی تھی جو غالبا" اس کی بے داری کا سبب بنی تھی۔ ایک مہینہ گزرنے کے باوجود وہ اس آواز کی عادی نہیں ہوئی تھی۔ یہ آواز نہ تھی بلکہ وہ اذیت‘ وہ عذاب تھا جس سے کسی بھی صورت مفر ممکن نہ تھا۔

قصدا" منہ پر تکیہ رکھ کر اس نے اس آواز کا سدباب کرنا چاہا تھا۔ جب اختیار کے دھاگے ایک کے بعد ایک ٹوٹ چکے تو وہ کیسے اپنی مرضی کر سکتی تھی۔

"تم اس کو یہاں سے کیوں نہیں لے جاتیں‘ جانتی ہو نا کہ مجھے اس کی آواز سے‘ اس کے وجود سے کس قدر نفرت ہے۔" آواز سے چاہتے ہوئے بھی فرار نہ پا کر وہ چہرے پر تکیہ رکھے رکھے چلائی تھی۔ جوابا" صابرہ نے کسی قسم کا مزاحمتی ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا حالانکہ اپنے گزشتہ رویے کے برعکس آج وہ پہلی بار اس پر چلائی تھی۔

ایک بے نام زندگی‘ بے مقصد مسافت اور بے نشان منزل تقدیر ٹھہری تھی‘ تو کیونکر زندگی کا مفہوم واضح ہو پاتا‘ اپنے درماندہ وجود کے لیے پناہ گاہ کا حصول پس پشت چلا گیا تھا۔ فرار کے تمام راستے مسدود ہونے کے باوجود ایک آواز سے نجات حاصل کرنا اس کے لیے دشوار ہو گیا تھا۔ کاٹ میں لیٹا وہ وجود رو رہا تھا‘ وہ یہ آواز سننا نہیں چاہتی تھی‘ وہ سن نہیں سکتی تھی‘ زندگی پاتال کی گہرائیوں میں سانس لے رہی تھی اور نکلنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ وہ صبر سے اس آواز کو سن کر نظر انداز کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ صابرہ اس کے چلانے کے باوجود اسے باہر لے کر نہیں گئی تھی۔ کروٹ لے کر تاریکی میں صابرہ کو ڈھونڈنا چاہا تھا۔ معا" اسے اپنے سے کچھ فاصلے پر تاریک ہیولہ دکھائی دیا تھا‘ تاریکی کے باوجود وہ جان سکتی تھی کہ چند فٹ کے فاصلے پر کھڑا یہ وجود نہ تو دادو کا تھا اور نہ صابرہ کا۔ اذیت آمیز آواز بند ہو چکی تھی‘ کیونکہ روتا بلکتا وجود اب اس دراز قامت ہیولے کی آغوش میں منتقل ہو گیا تھا۔

بختاور نے سراسیمگی کے عالم میں آنکھیں بند کر کے اس منظر کو بدلنا چاہا تھا۔ مگر آنکھیں کھولنے پر وہی منظر اس کے سامنے تھا۔ اس کے سرسراتے اندیشے ایک کے بعد ایک عود کر سامنے آ رہے تھے۔ یکلخت اس نے سائیڈ لیمپ روشن کر دیا تھا۔

روشنی نے ہر منظر عیاں کر دیا تھا‘ وہ دھندلا ہیولہ اپنی حقیقی ہیئت سمیت اس کے سامنے تھا۔ وہ اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑے سلجوق عمر کو دیکھ رہی تھی۔ خواب میں بھی اب وہ اس شخص کے وجود کو برداشت کرنا نہیں چاہتی تھی اور وہ بہ نفس نفیس اس کے سامنے کھڑا تھا‘ یہی نہیں جس استحقاق سے اس نے اس وجود کو اپنی آغوش میں بھینچا ہوا تھا‘ جسے اس نے دو

اذیت کے ہزار ہا پل صراط سے گزرنے کے بعد جنم دیا تھا۔ سامنے کھڑے اس شخص کے چہرے پر فتح مندی کے عجیب سے تاثرات محض سرشاری کے غماز تھے۔ اسی سرشاری نے اسے اس کی جانب پیش قدمی پر مجبور کیا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس سے یہ اقدام کیوں سرزد ہوا تھا۔ وہ اپنے دل میں ابھرتے عجیب سے احساسات کو بھی سمجھنے سے قاصر تھی۔

سلجوق کے قریب پہنچ کر اس نے جھپٹنے کے سے انداز میں اس وجود کو کھینچ کر اپنی آغوش میں بھر لیا تھا۔ اس کے وجود کا گوشہ گوشہ ایک تسکین آمیز احساس سے سیراب ہو گیا تھا۔ اس کے وجود کی گرمی‘ اس کا دھڑکتا دل‘ اس کی چلتی سانسیں‘ وہ ایک نئے تجربے سے روشناس ہو رہی تھی‘ وہ ایک نئے زاویہ نگاہ سے اپنے احساسات کو پرکھ رہی تھی۔ سلجوق دم سادھے یہ عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ بے تابی سے اپنی بیٹی کے چہرے کو چوم رہی تھی‘ اس کی دادو نے اس کے متعلق جو کچھ بھی بتایا تھا یہ منظر سراسر اس بات کی نفی کر رہا تھا۔ اس کے یہ تیور نہ تو کچھ سمجھانے والے تھے اور نہ ہی جتانے والے‘ وہ تو بس ایک فطری تقاضے کی لپیٹ میں تھی۔ اس کے ذہن و دل میں جھکڑ سے چلنے لگے تھے‘ جس فعل کو سرانجام دینے کی خاطر وہ یہاں آیا تھا‘ اب اس کے لیے اس فعل کی تکمیل ناممکن ہو چکی تھی۔ ماں کی سوئی سرشت بے دار ہو چکی تھی‘ نفرت کا خود رو پودا اپنی موت آپ مر گیا تھا۔

جانے کتنی ساعتوں کے بعد اس نے بختاور کو اپنی جانب متوجہ پایا تھا۔ اس کی آنکھوں کا سابقہ متوحش تاثر ختم ہو چکا تھا۔ جو کچھ اس وقت وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ محض سرشاری اور کچھ پا لینے کا احساس تھا۔ بختاور براہ راست اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دبے دبے لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟" اس سوال کا جواب سادہ تھا‘ وہ اپنی بیٹی کو یہاں سے لینے آیا تھا۔ وہ اس کی ماں کی نفرت میں اسے پروان چڑھتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہر چند کہ یہ خیال شروع سے اس کے دل میں تھا مگر بختاور کی دادو کا انداز اس خیال کو مہمیز کرنے کا موجب بنا تھا۔ جو کچھ انہوں نے اسے بختاور کے متعلق بتایا تھا‘ اس کے برعکس اس نے بختاور کو پایا تھا۔ اس کے لہجے کی بازگشت اب بھی اس کے اردگرد گونج رہی تھی‘ مگر وہ پھر بھی گنگ سا کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم نے سلجوق عمر مجھے کہیں کا نہیں رکھا‘ میرا مان‘ میرا غرور وہ سب جو میرا تھا وہ تم نے مجھ سے ایک پل میں چھین لیا۔" اس کی آواز تھی یا کوئی الاؤ سا جل رہا تھا۔

"آئی ایم سوری!" سابقہ فقرہ تھا مگر سابقہ استحقاق عنقا تھا۔

"تم جانتے ہو سلجوق کہ میں تم سے کتنی نفرت کرتی ہوں۔" اس نے بہت رسان سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔ جوابا" وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی۔ "نہیں‘ تم نہیں جان سکتے۔ اگر جان سکتے تو کبھی بھی میرے سامنے نہ آتے۔" وہ اس کا سامنا کرنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر جیسے تردید کے لیے کوئی لفظ بنا ہی نہ تھا یا اس وقت وہ محض اسے سننا چاہتا تھا۔

اس کا جنون جو اس وقت بپھرا ہوا سمندر بنا ہوا تھا‘ یہ تلاطم خیز سمندر سلجوق عمر کے لیے تحیر خیز تھا‘ حالانکہ بختاور کا سامنا کرنے کے خیال سے وہ شعوری طور پر تو کیا لاشعوری طور پر بھی تیار نہ تھا مگر پھر بھی وہ اسے سن رہا تھا۔

"تم نے یہ کیسے سوچ لیا تھا سلجوق کہ تم اسے مجھ سے جدا کرنے میں کامیاب ہو جاؤ گے۔ اس کا تم سے کوئی تعلق نہیں‘ کوئی رشتہ نہیں‘ تم نے تو کسی رشتے کی بنیاد رکھی ہی نہیں‘ تو تم کس رشتے سے اسے لے جانا چاہتے ہو۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکی تھی۔

"اس پر تمہارا کوئی حق نہیں‘ اسے لے جانا تو بہت دور کی بات ہے میں تو اسے تمہیں دکھانا بھی نہیں چاہتی۔" وہ پرعزم لہجے میں کہہ رہی تھی۔ انداز سرد تھا۔ سلجوق عمر نے ایک گہرا سانس خارج کرتے ہوئے اچٹتی سی نظر اس پر ڈالی تھی اور پھر اپنا رخ موڑتے ہوئے رسانیت سے گویا ہوا تھا۔

"تمہاری اجنبیت تمہاری نفرت بجا ہے مگر میں اس نفرت کا کیا کروں کیا جواز دوں جو میں خود سے کرتا ہوں میرے جیسے شخص کو محبت نہیں کرنی چاہیے تھی میری ہوس نے میری محبت کو اس مقام پر زیر کر دیا تھا جب سب کچھ میری دسترس میں تھا۔ میرا نفس میری مضبوط شخصیت کے مقابلے میں زیادہ مضبوط ثابت ہوا اور میں ایک بودا اور ہوس پرست شخص نکلا۔ لیکن بختاور اس کے باوجود میں اپنی محبت سے دستبردار نہیں ہو پا رہا کیا ایسی ہار بھی کسی کا نصیب بنی ہو گی۔ نظروں سے گرا ہوا میرا وجود تمہارے لیے ہی نہیں خود میرے لیے بھی ناقابل برداشت ہے۔

مجھ سے زیادہ بھی تمہیں کسی نے چاہا ہو گا تمہاری فکر کی ہو گی مجھ سے زیادہ محبت کی ہو گی مجھ سے زیادہ سوچا ہو گا مگر یہ میری بدنصیبی کی انتہا ہے کہ میں تمہیں حاصل کر کے بھی حاصل نہیں کر پایا۔ تمہارے لیے جینا پھر بھی دشوار نہ ہو گا کیونکہ تمہارے پاس۔ قرۃ العین ہے اور میرا جینا تو بے معنی ہو گا کیونکہ میرے پاس بختاور نہیں ہو گی۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکا تھا مگر بختاور کے لب محض ایک نام کی جنبش کو دوہرا رہے تھے۔

"قرۃ العین!" اس کے لبوں نے خاموش جنبش کی تھی۔ وہ وجود جسے اس نے جنم دیا تھا تکلیف جھیلی تھی جسے گود میں اٹھانا تو دور کی بات ایک نظر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا آج وہ وجود بے نام نہیں رہا تھا۔ سلجوق کی آواز اسے خیالات کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔

"یہ مجھے سن نہیں سکتی دیکھ نہیں سکتی مگر میری محبت کی شناخت ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی۔ میں جانتا ہوں کہ تم اسے یہ نام کبھی بھی نہیں دو گی مگر میرے لیے اس کے وجود کی پہچان اسی دو لفظی شناخت میں قید رہے گی۔ قرۃ العین!" اس نے ایک بار پھر اس نام کو دوہرایا تھا۔ چند ساعت تک وہ اسے یاسیت آمیز نگاہوں سے اپنی نظروں میں جذب کرتا رہا اور پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا۔ دلوں پر فقط محبت سفر کرتی ہے اور محبت ان دونوں کے درمیان نہیں رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

دلوں پر محبت سفر کرتی ہے اور محبت ہم دونوں کے درمیان نہیں رہی تھی ہر چند کہ بختاور اس سفر میں میرے ساتھ ضرور تھی مگر صرف تصورات اور تخیلات کی حد تک میں نے اپنی زندگی میں خود کو کبھی اتنا کم تر اور حقیر تصور نہیں کیا تھا جتنا کہ میں اس انکشاف کے بعد خود کو محسوس کر رہا تھا۔

اگرچہ کہ یہ انکشاف میرے لیے ناقابل یقین حد تک ناقابل قبول تھا مگر ممی اور آپی کی اتنے وثوق سے کیے گئے دعوے کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور پھر تمام ثبوت اور شواہد میری اس خوش فہمی کی بلند عمارت کو کہ بختاور کبھی ایسا نہیں کر سکتی کہ گرنے سے بچا نہیں پائے تھے۔ میں فیصلہ کن انداز میں اس کے گھر گیا تھا اس کے خاندان کے ایک ایک فرد کا جھکا سر سچائیوں کا اعتراف کر رہا تھا۔

کیا سچائی اس حد تک تکلیف دہ بھی ہو سکتی ہے کیا سچ سے منہ موڑنا اس قدر آسان تھا۔ اس انکشاف سے قبل نجانے میں اپنی ماں اور بہن کے متعلق کیا کچھ سوچنے لگا تھا میں بدگمانی کی انتہا پر تھا اور جب بدگمانی کے بادل چھٹے تھے تو میں خود میں اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا کہ ان سے نظر ملا پاتا۔

لندن کی فلائیٹ کے ٹکٹ کنفرم ہوتے ہی میں اپنے گھر والوں کو مطلع کیے بغیر لندن آ گیا۔ مگر سکون یہاں بھی نہیں تھا۔ میرا دل میرا اندر اس تکلیف دہ انکشاف کو قبول کرنے سے قاصر تھا۔ ساری دنیا میرے لیے بدہیت پھیلاؤ کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ ہر شے اپنی خوب صورتی اور مفہوم کھو چکی تھی۔ آج سے کچھ روز پہلے تک سب کچھ اتنا کھوکھلا تو نہ تھا۔

خالی احساسات اور بھیگتی آنکھوں کے ساتھ میں اسے بھولنے کی سعی میں مبتلا تھا جس کی محبت میری رگوں میں خون کی مانند ہی تھی۔ جس کی قربت کے

خواب میں نے جاگتی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اپنی محبت کی شدت پسندی کو میں نے صرف بختاور کے لیے سنبھال رکھا تھا ایک زندگی اس شدت پسندی کے اظہار کے لیے مختصر تھی ناکافی تھی اور اب اسی زندگی کا ایک ایک پل اذیت ناک تھا۔

چھ ماہ گزرنے کے باوجود میں بختاور کو نہیں بھلا پایا تھا۔ اس کے ساتھ جو حادثہ ہوا تھا یا وہ جان بوجھ کر اس حادثے کا حصہ بنی تھی حقیقت کا کوئی بھی پہلو مجھے بختاور سے برگشتہ نہیں کر پایا تھا۔ میں ایک اعلا ظرف شخص ہرگز بھی نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر بختاور کو اپنانا چاہتا تھا تو میرے اس عمل میں ہرگز بھی میری اعلا ظرفی شامل نہیں رہی تھی۔ مجھے بختاور سے محبت تھی اور یہی محبت مجھے ایک بار پھر پاکستان جانے پر اکسا رہی تھی۔

گو کہ اس بار میری آمد گزشتہ آمد سے قدرے مختلف نہ تھی مگر اس بار میں قصداً" بھی مسکرا نہیں سکا تھا۔ جو فیصلہ میں کر کے آیا تھا وہ محض طمانیت انگیز تھا سرشاری کا شائبہ تک نہ تھا۔ میرے والدین اور بہن بھائیوں نے میرا استقبال نہایت خوشگوار انداز میں کیا تھا۔ ان کے کسی بھی انداز میں گزشتہ واقعہ کی جھلک تک نہ تھی اتنی آسانی سے انہوں نے سب کچھ فراموش کر دیا تھا یا پھر ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے ایسا تاثر دینا چاہ رہے ہوں۔ میرے ساتھ ڈرامہ کرنے کی انہیں قطعاً" ضرورت نہ تھی کیونکہ میں ایک حقیقت پسند شخص تھا ہر چند کہ میں گزشتہ چھ ماہ سے اسی حقیقت سے دانستہ نظر چراتا رہا مگر اب میں دانستہ یا پھر نادانستہ اپنی اندرونی کیفیات کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا خواہ مجھے اپنے خاندان کی مخالفتوں کا ہی کیوں نہ سامنا کرنا پڑتا۔

اگلے ایک ہفتے تک میں خاموشی سے اپنے گھر والوں کا جائزہ لیتا رہا کہ آیا وہ میرے اس فعل کی کس حد تک مخالفت کر سکتے ہیں اور وہ میرے احساسات سے بے خبر میری خاطر کبھی پکنک کا پروگرام بناتے اور کبھی کسی فنکشن کا انعقاد عمل میں لایا جاتا۔ میرے منہ سے ایک نیا انکشاف سننے کے بعد ان کا ردعمل کیا ہو سکتا تھا فی الحال میں نے اس بابت سوچنا ترک کر دیا تھا۔ میرے پیش نظر فی الحال اپنے مدعا کا اظہار کرنا تھا اور مناسب الفاظ کی کمیابی میرے ذہنی انتشار کا باعث بن رہی تھی۔

اور پھر میں نے مناسب الفاظ کے انتخاب کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ میری ماں اور باپ نے جن نظروں سے مجھے دیکھا تھا۔ میں دانستہ اس جانب متوجہ نہ تھا۔ میں فی الحال انہیں اپنے اندرونی احساسات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اگرچہ کہ مجھ سے یہ عمل قدرے تاخیر سے سرزد ہوا تھا۔ اگر میں اپنے خیالات کا اظہار دو سال بعد بھی کرتا تب بھی ان کے تاثرات ایسے ہی ہونے تھے۔ درحقیقت یہ چیز کسی کے لیے بھی ناقابل برداشت ہو سکتی تھی مگر مجھے اپنی محبت کی زیادہ پروا تھی جو مجھ سے قصداً" سرزد نہیں ہوئی تھی۔ جب سب کچھ اختیارات سے باہر تھا۔ تو امی اور ڈیڈی کے تاثرات میرے اختیار میں کیسے ہو سکتے تھے۔

چند لمحوں کے توقف کے بعد امی نے سرد و سپاٹ انداز میں مخاطب کیا تھا۔

"تم تمام عمر ہم سے کٹ کر گزارا کر سکتے ہو۔ اگر ہاں تو جاؤ اپنا لو اسے لیکن اس کے بعد ہم سے کوئی تعلق کوئی رابطہ رکھنے کی کوشش مت کرنا۔" ان کا انداز بہت کچھ باور کروا گیا تھا۔ اس رویے کے باوجود میں اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا تھا۔

اپنے نکتۂ نظر کو بیان کرنے کا موقع انہوں نے مجھے خود فراہم کیا تھا۔ ان کے سامنے اپنے خیالات کا برملا اظہار اب میرے لیے ناگزیر حیثیت اختیار کر گیا تھا۔

"میں جانتا ہوں یہ سب آپ سب کے لیے ناقابل قبول ہو گا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اب میرے اختیارات میرے ہاتھ میں نہیں رہے۔" یہ فیصلہ کرتے ہوئے میں اپنی بے بسی کی انتہا پر تھا۔

"میں آپ لوگوں کی تکلیف کا اندازہ لگا سکتا ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں بختاور سے اپنا تعلق ختم نہیں

کر سکتا۔"

"تم ہم سے تعلق ختم کر سکتے ہو؟" امی کا دو ٹوک قطعی انداز میری بات قطع کر گیا تھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"شاید..... نہیں!" میں نے کمزور لہجے میں کہا تھا۔

"شاید؟" ان کا انداز استہزائیہ تھا۔ "بختاور کے لیے تمہارے انداز میں کوئی ابہام نہیں ہے' تم اس کی خاطر ایقان کی بلندی پر پہنچے ہوئے ہو اور اپنے خاندان کے لیے تمہارے پاس فقط ایک لفظ ہے 'شاید!' تو جاؤ کر لو شادی۔" وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میرے لیے بختاور سے شادی کرنا کوئی مشکل فعل نہیں ہے۔ مشکل صرف آپ لوگوں کے حوالے سے ہے۔ مجھے آپ لوگوں کے بغیر شادی کرنی ہوتی تو کبھی بھی یہ مدعا آپ لوگوں کے سامنے نہ رکھتا' آپ لوگوں کی رضامندی میرے لیے ضروری ہے۔"

"ہم اپنی رضا مندی نہیں دے سکتے۔ تمہاری طرح ہماری آنکھوں پر کسی نام نہاد محبت کی پٹی نہیں بندھی۔" اس بار ڈیڈی نے اپنا خیال واضح کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"آپ لوگ مجھے اپنی زندگی سے خارج کر سکتے ہیں؟" میں نے سوالیہ انداز سے انہیں دیکھا تھا۔

"ایسا ہم نہیں' تم خود کر رہے ہو اپنے ساتھ۔" انہوں نے جیسے میری غلط فہمی کو دور کرنا چاہا۔

"آپ صرف مجھے بختاور سے شادی کرنے دیں' اس کے بعد آپ لوگ جو کہیں گے جیسا کہیں گے' مجھے قبول ہوگا۔ مگر پلیز اس وقت میری راہوں میں رکاوٹ مت کھڑی کریں۔ میرے قدم مت روکیں' یہ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے۔"

میرے والدین مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گڑگڑاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اپنی دانست میں تو وہ میری آمد کو ایک خوشگوار تبدیلی تصور کر رہے تھے' ان کے خیال میں' میں اس تکلیف دہ مرحلے سے نکل آیا تھا' مگر میرے اس ٹوٹے پھوٹے اظہار کے بعد ان کے چہرے کے تاثرات زلزلے کی زد میں تھے۔

بعض اوقات جن سے محبت کی جاتی ہے' ان سے نفرت انگیز عمل سرزد ہونے کے باوجود نفرت نہیں ہو پاتی۔ آپ کوشش بھی کریں تب بھی آپ کی ہر کوشش بے سود ثابت ہوتی ہے۔ گزشتہ چھ ماہ سے میں خود کو بختاور سے نفرت کرنے پر اکسا رہا تھا' مگر میرے اندر چھ سالہ محبت کی جڑوں نے اس نفرت کے بیج کو پنپنے نہیں دیا تھا۔ میرے پاس حقیقت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا اور حقیقت یہ تھی کہ میں آج بھی بختاور سے محبت کرتا تھا۔ گو کہ سب نے اپنی دانست میں میری زندگی سے بے دخل کر دیا تھا' اس کے کردار کے حوالے سے مجھے بہت کچھ باور کروا دیا گیا تھا' ان باتوں کا مفہوم میں جان بھی گیا تھا۔ مگر تمام تفکرات اور مفہوم اس محبت نے زیر کر دیے تھے جو مجھے بختاور سے تھی۔ غصہ اشتعال' نفرت سب کچھ اپنے معانی کھو چکے تھے۔ فقط لفظ محبت اب بھی زندہ تھا اور میرے اندر سانس لے رہا تھا۔

میرا یہ انداز دیکھ کر میرے والدین کے چہرے کے تنے ہوئے نقش یکلخت ڈھیلے پڑنا شروع ہو گئے تھے۔ میں ان کے سامنے پہلی بار اس انداز میں رویا تھا۔

"تم کس قسم کے انسان ہو ثاقب' تمہاری عزت نفس ہے بھی کہ نہیں۔ تم اس دو کوڑی کی لڑکی کی خاطر رو رہے ہو جس کے دل میں تمہارے لیے ذرہ برابر جگہ نہیں۔ تم ایک خود غرض ترین شخص ہو۔ تمہیں اپنے والدین سے زیادہ اپنا خیال ہے۔ تم کبھی ایسے تو نہیں تھے جب بختاور میں کوئی کمی نہیں تھی تو میں نے تمہیں اس سے شادی کرنے سے نہیں روکا تھا' مگر اب جانتے بوجھتے میں تمہیں کیسے اس دلدل میں دھکیل دوں۔ تم خود کو تو اپنی محبت کا جواز دے کر تسلی دے سکتے ہو مگر ہمیں کس چیز کی سزا دے رہے ہو۔"

امی کی آواز بھرا گئی تھی۔ میں اپنی آنکھیں صاف کرتا ہوا ان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"آپ بار بار ان باتوں کو مت دہرائیں' مجھے اس کی پروا نہیں ہے کہ وہ میرے بارے میں کیا احساسات رکھتی ہے' سر دست مجھے اپنے احساسات کی پروا

ہے۔" ان کے چہرے کا خاموش تاثر میرے چہرے پر آ جما تھا۔ بختاور کی پریگننسی شاید ان کے لیے اتنی تکلیف دہ نہ تھی جتنا کہ میرا یہ انداز' ان کا چہرہ اس بات کا ماخذ تھا۔ میں نے ایک بار پھر انہیں تسلی دینے کی خاطر الفاظ تلاشے تھے۔

"جو کچھ ہو چکا ہے یا ہونے جا رہا ہے' کچھ عرصے بعد ماضی کا حصہ بن جائے گا' جو کچھ ہو چکا ہے وہ دوبارہ پلٹ کر نہیں آئے گا' ہاں اگر آپ انہیں یاد رکھنے کی کوشش کریں گی تو آپ کے زخم ہرے رہیں گے۔ معاف کر دیں بختاور کو' بھلا دیں وہ سب کچھ جو اس کے ساتھ ہوا۔ اپنی فطری محبت اور اپنائیت کو نفرت کی نذر مت کریں۔" میں ان کے آنسو پونچھ رہا تھا' ان کی موجودہ خاموشی ان کا تذبذب ظاہر کر رہی تھی۔ اب ان کے انداز میں قطعیت نہ تھی۔ جب آپی کو اس تمام معاملے سے آگاہی ہوئی تو انہوں نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ ایک ہفتے تک گھر کی فضا کشیدہ رہی' حتی المقدور آپی نے مجھے اپنے اس فیصلے سے ہٹانے کی ہر ممکن سعی کی تھی' تمام اقسام کی دھمکیاں بھی آزما ڈالیں۔ مگر میں جوں کا توں رہا۔ البتہ امی اور ڈیڈی کی خاموشی ان کی جانب سے اقرار کا ماخذ تھی۔ آپی کے لیے ان کا مان جانا ناقابل یقین تھا' تب ہی ان کا انداز نہ صرف میرے لیے بلکہ ان دونوں کے لیے بھی جارحیت آمیز تھا۔ میں نے فی الحال خود کو کچھ بھی بولنے سے باز رکھا تھا' امی ہی انہیں تسلی دے رہی تھیں اور وہ اپنے آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھیں۔

"تم ثاقب! ایک خود غرض اور بے غیرت ترین شخص ہو۔" گھر سے نکلتے نکلتے یہ آخری فقرہ انہوں نے میری نذر کیا تھا۔ جن باتوں کا کوئی جواب نہ تھا اس کے بارے میں سوچنا اور اپنے دماغ کو پراگندہ کرنا عبث تھا۔

بالآخر سب میرے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ منگنی توڑنے کے بعد ایک بار پھر میری ماں میرے لیے بختاور کا ہاتھ مانگنے گئی تھیں' آج سے چھ سال پہلے ان کے جانے میں اور آج کے جانے میں بہت فرق تھا' مگر اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔

توقع کے خلاف بختاور کے والدین نے واضح جواب نہیں دیا تھا۔ اور امی اور ڈیڈی کے انداز سے صاف ظاہر تھا کہ میں اپنے آپ کو خوش فہمی کے سمندر سے نکال لاؤں۔ بختاور کے معاملے میں تو میں ہمیشہ ہی خوش فہم رہا تھا اور ہر بار ہی اس نے میری خوش فہمیوں کو دھتکارا تھا۔ بختاور کی جانب سے جو تامل سامنے آیا تھا اس نے ایک بار پھر مجھے نئے رخ پر سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میرے گھر والوں نے اب میری کسی بھی حرکت پر حیران ہونا چھوڑ دیا تھا' وہ میری خواہشات کی انتہا دیکھ رہے تھے' یا اپنا ضبط آزما رہے تھے' لیکن اب انہوں نے مجھے ٹوکنا یا پھر میرے معاملے میں بولنا ہی ترک کر دیا تھا۔ مگر میں اپنی ماں کی ٹھہری ہوئی اور منجمد آنکھوں سے دو قطرے ٹوٹ کر گرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ اپنی ماں کی ٹھہری ہوئی اور منجمد آنکھوں سے دو قطرے ٹوٹ کر گرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ مگر وہ بالخصوص ان کی جانب متوجہ نہیں ہوئی تھی۔ سب کچھ بے اختیاری سے سرزد ہوا تھا۔ وہ پورے آٹھ ماہ بعد انہیں دیکھ رہی تھی' مگر کسی خوش کن احساس نے اس کے دل پر دستک نہیں دی تھی۔ ان کی یہاں آمد کس سلسلے کی کڑی ہو سکتی تھی۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی اور نہ ہی سمجھنا چاہتی تھی۔ وہ دانستہ انہیں نظر انداز کرتی ہوئی' کاٹ کی جانب لپکی تھی پھر اس نے اس ننھے منے وجود کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ انہوں نے بہت حیرت سے اسے دیکھا تھا۔ بختاور کے متعلق جو کچھ بھی اماں نے ان کے گوش گزار کیا تھا' بختاور کا عمل اس کی نفی کر رہا تھا۔ وہ اسے اپنے سینے سے چمٹائے اس وقت ایک عجیب و غریب منظر کا حصہ بنی ہوئی تھی۔ وہ اس کی ماں تھیں اور ہر ماں اپنی بیٹی کا یہ روپ دیکھنا چاہتی ہے —— اولاد کی اولاد کی محبت اسی طرح بے خود کرنے والی ہوتی ہے' مگر بختاور کو اس روپ میں دیکھ کر انہیں شدید جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

ایک ماں کا پیار لٹاتا انداز وہ دیکھ رہی تھیں۔ ایک بیٹی کا محبت وصول کرتا انداز وہ سن سکتی تھیں۔ آوازوں کی بازگشت ان کے اردگرد تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتی۔ بس آپ ڈیڈی سے میری گاڑی کے متعلق بات کریں۔"

"ممی اب میری ڈرائیونگ اتنی بھی بری نہیں ہے کہ میں آپ کو مسز صدیقی کے گھر نہ چھوڑ سکوں۔"

"مجھے ایم بی اے کرنا ہے۔"

"مجھے ابھی شادی نہیں کرنی۔" وہ بھیگتی آنکھوں سے خود سے کچھ فاصلے پر رخ موڑے کھڑی بختاور کو دیکھ رہی تھیں۔

"بختاور!" انہوں نے بہت دھیمے انداز میں اسے پکارا تھا۔ وہ بھی انہیں چونک کر دیکھنے لگی۔

"مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔" اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا تھا' وہ تو بس گنگ سی انہیں دیکھ رہی تھی۔

اور جب انہوں نے اسے اس مدعا سے آگاہ کیا تھا جو ثاقب کے والدین لے کر آئے تھے تو اچنبھے سے اس کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"وہ اب بھی تم سے محبت کرتا ہے۔" ممی جھکی آنکھوں سے نجانے کون سی حقیقت جتانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"محبت!" اس کے لبوں نے خاموش جنبش کی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی اور طنزیہ مسکراہٹ براجمان ہو گئی۔

"ممی! میں اب کسی کی محبت کے قابل نہیں ہوں' اب میرے لیے زندگی کا مفہوم تبدیل ہو گیا ہے۔ مجھے اب کسی کی محبت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے اب نفرت سہنے کی عادت ہو چکی ہے لیکن اگر ثاقب ایسا چاہتا ہے تو وہ دنیا کا سب سے بے وقوف ترین شخص ہے مجھے اگر کسی کے جذبات اور محبت کی قدر ہوتی تو میں دوسری طرف قدم ہی کیوں بڑھاتی۔ میرے دل میں اب کسی کی محبت کی گنجائش نہیں۔ میرے لیے میری بیٹی کا وجود ہی کافی ہے۔" وہ قطعی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"میں اب کسی کے جذباتی عمل کا حصہ بننا نہیں چاہتی۔"

"اس کا یہ فیصلہ جذباتی نہیں ہے' اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" بختاور نے ان کے اس قیاس کی تردید نہیں کی تھی۔ وہ خاموش ہو گئی۔ اسے اپنی بیٹی کو اپنے وجود سے جدا نہیں کرنا تھا اور ثاقب سے تو کیا کسی سے بھی شادی کرنے کا مطلب تھا اپنے خون سے جدائی۔ ممی نے مزید اسے قائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اس کے چہرے پر جو ماما کا نور تھا اس نے انہیں کچھ بھی کہنے سے باز رکھا تھا۔ وہ گزشتہ ایک ماہ سے ایک ابنارمل زندگی گزار رہی تھی۔ اپنے ہی وجود سے ناراضی برت رہی تھی اور اب جب وہ نارملٹی کی جانب لوٹ آئی تھی تو ثاقب حسن درمیان میں آگیا تھا۔ اس کی اعلا ظرفی کی تو وہ قائل ہو ہی گئی تھیں اور اب بختاور کو قائل کرنا ان کے لیے مشکل تھا۔ وہ انہیں یہ باور کروانا چاہتی تھیں کہ اس کی ثاقب سے شادی کے بعد وہ اس کی بیٹی کا اسی طرح خیال رکھیں گی جیسے کہ وہ رکھ سکتی تھی۔ مگر اس سلسلے میں بختاور اپنے پروں پر پانی ہی نہیں پڑنے دے رہی تھی۔

"ماں جیسی محبت کوئی بھی اس سے نہیں کر سکتا۔ البتہ دعوے ضرور کر سکتا ہے اور میں اپنی محبت کو بودے دعوؤں کی نذر نہیں کر سکتی۔" وہ یاسیت آمیز لہجے میں گویا ہوئی تھی ایک ہفتے بعد ثاقب کے والدین ایک بار پھر آئے تھے۔ بختاور کے والدین جو ان کی گزشتہ آمد کو ثاقب کی جذباتیت پر محمول کر رہے تھے۔ اس بار ان کی نئی پیش کش نے ان کے اردگرد روشنیاں سی پھیلا دی تھیں۔

اس بار دادو اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"تم نے کہا تھا کہ ایک بار پھر تم ان رشتوں کو پانا چاہتی ہو جن سے تم محروم ہو۔" دادو نے اسے کچھ یاد دلانے والے انداز میں مخاطب کیا۔ "آج تمہیں انہیں رشتوں کو ایک بار پھر پانے کا موقع مل رہا ہے۔"

"اور اگر میں اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہ چاہوں۔ اگر میں اس شادی سے انکار کر دوں جس کی پلاننگ آپ لوگ کر رہے ہیں تو کیا ہو گا۔" وہ سرد و سپاٹ انداز میں دریافت کر رہی تھی۔ فطری رشتوں کے مابین تعلقات کا استحکام بھی مشروطیت کا متقاضی تھا۔ وہ یاسیت سے سوچ رہی تھی۔ اگر وہ شادی کے لیے ہاں کہہ دیتی تو اس کے والدین ایک بار پھر اسے اپنا لیتے مگر اس چیز کی کوئی گارنٹی نہ تھی کہ یہ استحکام سابقہ گرمجوشی و اپنائیت لیے ہو گا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ثاقب اب بھی تم سے محبت کرتا ہے اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ تمہارے ساتھ اسے بھی قبول کرنے پر راضی ہے۔ وہ اسے اپنا نام دینا چاہتا ہے۔"

مزاحمت اپنی موت آپ مر گئی تھی۔ وہ ششدر سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ یہ محبت کا کون سا رخ تھا' درحقیقت اس کے لیے ثاقب کی محبت ناقابل یقین حد تک ناقابل فہم تھی۔ کیا کوئی شخص اس حد تک اعلا ظرفی کا مظاہرہ کر سکتا تھا۔ کیا کوئی شخص ایک بدکردار عورت سے اپنی سابقہ محبت کی وفاداری ثابت کر سکتا تھا' کوئی کسی کی ناجائز اولاد کو قبول کر سکتا تھا' اسے اپنا نام دے سکتا تھا۔ وہ شخص ثاقب حسن تھا۔ اس کی شخصیت کا کون سا پہلو تھا۔ درحقیقت اس نے کبھی ثاقب کی محبت کو درخور اعتنا نہیں جانا تھا۔ اس نے دانستہ اس کے جذبات کی نفی نہیں کی تھی' اس کے جذبات کی آنچ کبھی اس تک پہنچی ہی نہیں۔ اس کے نزدیک تو وہ ایک ایسا شخص تھا' جو دکھائی تو دیتا تھا مگر ہرگز بھی نگاہوں کا مرکز نہیں بن سکتا تھا۔ اس نے کبھی بھی بختاور کو اپنی جانب متوجہ نہیں کیا تھا اور آج اس شخص نے اپنی محبت کو منوایا تھا۔ اپنا آپ منوایا تھا' با دل نخواستہ ہی سہی وہ اسے سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

دادو کے سامنے اپنا سر جھکانے کے بعد اس نے ممی کے ساتھ ڈیڈی کو اپنے کمرے میں آتے دیکھا تھا۔ ان کی آمد کس سلسلے کی کڑی تھی اس سے وہ بخوبی واقف تھی۔ لیکن پھر بھی جیسے وہ اس آمد کی منتظر رہی تھی۔

آٹھ ماہ بعد اس نے انہیں دیکھا تھا اور انہوں نے اسے' پھر بھی وقت گزر گیا تھا بنا آہٹ کیے' بنا احساس دلائے۔ اس کی نظریں بار بار دھندلا رہی تھیں جنہیں وہ اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے صاف کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں چاہتا ہوں کہ یہ شادی جلد از جلد ہو جائے۔" اس نے ڈیڈی کو کہتے سنا تھا۔ وہ یقیناً" دادو سے یا پھر ممی سے مخاطب تھے۔ ڈیڈی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر چند لمحوں کے توقف کے بعد باہر نکل گئے۔

"میں جانتی ہوں پرانے حالات اب لوٹ کر واپس نہیں آسکتے اور نہ ہی ہماری کھوئی ہوئی عزت واپس آسکتی ہے' گو کہ حتی المقدور ہم اس واقعہ کو دنیا کی نظروں سے چھپائے ہوئے ہیں مگر کب تک ایسی باتیں کبھی چھپ تو نہیں سکتیں' لیکن اب جب کہ ثاقب ہمارا ساتھ دینے کو تیار ہے تو ایسی باتوں کو چھپایا جا سکتا ہے۔"

ممی اور ڈیڈی کا اطمینان بے بنیاد نہ تھا' بختاور کی شادی ان کے معاشرے میں مستحکم قدموں کے لیے ناگزیر تھی اور بختاور یہ شادی کرنے پر راضی ہو گئی تھی۔ اس سے زیادہ کوئی بات بھی قابل اطمینان نہیں ہو سکتی تھی۔ ایک ہفتے بعد کی شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی تھی۔ اندیشوں کی فکر اب نہ تو اسے تھی اور نہ ہی اس کے والدین کو تب ہی اب وہ انیکسی کی بجائے اپنے گھر میں منتقل ہو گئی تھی۔

وہ اسٹیج پر بیٹھی دور سے ہی ثاقب کے گھر والوں کی سرد مہری کو محسوس کر سکتی تھی' مگر اس کے قریب اطمینان سے بیٹھے ثاقب کا قربت بخشتا لمس تمام حقائق سے نظریں چرانے پر مجبور کر رہا تھا۔ اور تب اس نے ثاقب سے زیادہ اس کے تصور سے عہد کیا تھا کہ وہ کبھی اس کے اس فیصلے کو غلط ثابت نہیں ہونے دے گی۔ جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا تھا اب وہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔ اب ایک نئی زندگی اس کی منتظر تھی گو کہ اتنی جلدی یہ سب قبول کرنا اس کے لیے اس قدر آسان نہ تھا مگر اب وہ اپنی ذات کی پرچھائیوں سے نکل

کر ایک نئی زندگی' ایک نئے تعلق کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ اس ضمن میں دادو نے بھی اس کی رہنمائی کی تھی کہ اب وہ محض مثبت پہلوؤں پر غور کر رہی تھی۔ زندگی کو بہر طور تبدیلیوں کی ضرورت ہر گام رہتی ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں تھا کہ وہ اپنی زندگی کے تمام اختیارات ثاقب کو سونپ دیتی۔ وہ اس کی بیٹی کو نام دے رہا تھا۔ اس حقیقت کے سامنے سب کچھ ہیچ تھا' اس کی عزت نفس' اس کے اختیارات اس کی خواہشات' سب کچھ ثاقب کی نذر کر دیا گیا تھا' کوئی بے اطمینانی اور بے سکونی اس کی راہ میں کانٹے کھڑے نہیں کر پائی تھی۔

اس کے نزدیک ثاقب کے گھر والوں کا موجودہ رویہ بجا تھا' ثاقب کے ساتھ اس کی شادی کرنے کا جو کڑوا گھونٹ انہوں نے بھرا تھا' اور جواب میں جس قسم کا رویہ روا رکھا ہوا تھا وہ بختاور کے نزدیک کسی بھی طور ناقابل برداشت نہ تھا' ان کا غصہ' ان کا تنفر' ان کے چہرے کی شکنیں اس حقیقت کے سامنے کچھ نہیں تھیں جو انہوں نے قبول کی تھی' یہی نہیں تمام عمر اس راز کو پوشیدہ رکھنے کا وعدہ بھی لیا تھا' یہ اگر ان کی اعلا ظرفی تھی تو قابل تحسین تھی اور اگر اپنے بیٹے کی وجہ سے کسی مجبوری کے تحت طے پا جانے والا فیصلہ تھا' تب بھی بختاور کے دل میں ان کا مقام بڑھ گیا تھا۔

شادی کے بعد بختاور نے ثاقب کے ساتھ اس کے گھر میں قدم نہیں رکھا تھا' جہاں ثاقب نے اپنی زندگی کے خوشگوار و ناخوشگوار لمحات کا ایک ایک پل جیا اور محسوس کیا تھا۔ ایک ہوٹل کے سوئیٹ میں اس نے ثاقب کے ساتھ اپنی شادی کی پہلی رات گزاری تھی۔ ثاقب اپنے والدین کے اس رویے سے ناخوش تھا یا نہیں البتہ بختاور ان کی نفرت کی اس جھلک پر گنگ سی ہو گئی تھی۔ ان کی ثاقب کی بختاور سے شادی کے لیے ہاں کر دینا بختاور کے لیے اس بات کا غماز تھا کہ ثاقب اپنے والدین کو ہر لحاظ سے رضامند کر چکا تھا' مگر اب اس مقام پر ان کی یہ سرد مہری معاملے کی سنگینی کا اشارہ دے رہی تھی' لیکن اس بارے میں اس نے ثاقب سے کسی بھی قسم کا استفسار نہیں کیا تھا۔

ولیمے کے اگلے ہی روز ثاقب اسے ہنی مون ٹور پر شمالی علاقہ جات لے آیا تھا۔ اس کی خوشی اس کی سرشاری اس کے ہر ہر عمل سے ہویدا تھی۔ بختاور کے لیے اس کا اس درجے کا اطمینان ناقابل فہم تھا۔ اس کے گھر والوں نے اس سے منہ موڑ لیا تھا اور اسے اس بات کا دکھ تک نہ تھا۔ وہ تو جیسے ایک نئی دنیا سے آشنا ہوا تھا۔ وہ محبتوں کی کس انتہا پر پہنچا ہوا تھا' بختاور اس سے ناواقف تھی۔ کن لمحوں کی اسیری نے اسے اس حد تک بے بس کر دیا تھا۔ وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

اس لمحے بھی وہ اس کے اس عجیب و غریب رویے کے بارے میں قیاس لگا رہی تھی' جب اس نے بہت آہستگی سے اس کا رخ اپنی جانب موڑا تھا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اور وہ اسے چاہتے ہوئے بھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں کر سکی تھی۔

"کچھ نہیں۔" مختصراً" جواب دیتے ہوئے وہ ایک بار پھر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی تھی۔ اس کی محبت پاش نظریں' اس کا اپنائیت آمیز لہجہ کسی بھی پشیمانی سے عاری تھا۔ وہ اپنے والدین کی محبتوں سے محروم ہو چکا تھا لیکن اس چیز کا اس کے چہرے پر شائبہ تک نہ تھا' معا" اس کی متاسف آواز بختاور کی سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔

"میں اب بھی تمہاری گڈبک میں شامل نہیں ہوا۔" وہ ایک دم ٹھٹک گئی تھی۔ یہ محبت کی کون سی منزلوں تک کی رسائی تھی۔

"بلیو می! میں کچھ نہیں سوچ رہی تھی۔" اس نے جیسے بھرپور انداز میں اسے یقین دلانے کی کوشش کی تھی۔ جواب میں وہ ایسے سر ہلانے لگا تھا جیسے بختاور کا یہ فقرہ اسے یقین دلانے سے قاصر رہا ہو۔

"میں جانتا ہوں کہ تم کس بارے میں سوچ رہی تھیں۔" وہ پر سوچ انداز میں گویا ہوا تھا۔ وہ ایک دم چونک سی گئی۔

"تم یقیناً" اس ننھی منی گڑیا کے بارے میں سوچ رہی تھیں۔ جسے تم نے ایک مہینے سے نہیں دیکھا۔"

بختاور کے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا تھا۔ یہ شخص مجسم بے یقینی تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ تم میرے اس خیال کی تائید نہیں کرو گی' خواہ اس کے لیے تمہیں کتنی ہی اذیتوں سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔" اس کے لیے اب اس شخص کے سامنے کھڑے رہنا دشوار ہو گیا تھا۔ چند ثانیوں تک وہ اس کی طرف نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھتی رہی پھر بیڈ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"آج سردی کچھ زیادہ نہیں۔" وہ ایک دم مسکرا دیا تھا۔

"کراچی والے سردی محسوس بھی بہت زیادہ کرتے ہیں۔" وہ بہت ہلکے پھلکے انداز میں گویا ہوا تھا۔

"تو کیا آپ کراچی والے نہیں ہیں۔" وہ دانستہ ایک لایعنی بحث کو تحریک دینے کی سعی کر رہی تھی۔ جواب میں وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے نزدیک آبیٹھا تھا۔

"لندن جیسے سرد شہر میں دس سال گزارے ہیں ہم! کراچی کے تمام اثرات زائل ہو چکے ہیں۔ بائی دا وے تم مجھے ٹاپک سے ہٹانا کیوں چاہ رہی ہو۔" بختاور نے اپنے پورے وجود میں ایک سنسنی سی محسوس کی تھی۔ وہ بے اختیار نفی میں سر ہلانے لگی تھی۔

"ایسا تو نہیں ہے۔" اس نے یقین دلاتے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے ایسے شانے اچکائے تھے جیسے اس کی بات کا یقین آگیا ہو۔ بختاور نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔ مگر زیادہ دیر تک وہ اپنا اطمینان برقرار نہیں رکھ پائی تھی۔

"بائی دا وے تم نے اس کا نام بھی رکھا ہے یا وہ ہنوز بے نام ہے۔" بختاور کی آنکھوں میں یکلخت نمی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ یہ شخص اس کے زخم ادھیڑ رہا تھا۔ اس کا یہ موضوع سخن بختاور کے درماندہ احساسات پر کسی کوڑے کی طرح پڑ رہا تھا۔ وہ اس سے نظریں نہیں ملا پا رہی تھی اور ثاقب کو اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ غالباً" وہ اس وقت خود کو ہمدردی کے سمندر میں ڈوبا ہوا محسوس کر رہا تھا۔

"قرۃ العین!" نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سرگوشی کرتے انداز میں بتایا تھا۔

"یہ مجھے سن نہیں سکتی۔ دیکھ نہیں سکتی مگر میری محبت کی شناخت ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی میں جانتا ہوں کہ تم اسے یہ نام کبھی نہیں دو گی مگر میرے لیے اس کے وجود کی پہچان اسی دو لفظی شناخت میں قید رہے گی۔" اور بختاور نے دانستہ اس پہچان کو قید کر دیا تھا۔ سلجوق نے غلط سوچا تھا۔ حقیقتاً" یہ نام بنا ہی اس وجود کے لیے تھا۔

"نائس نیم!" ثاقب اس نام کو سراہ رہا تھا۔

ہنی مون سے واپسی پر اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی نہ کسی طرح یہ سفر مختصر ہو جائے اور وہ اڑ کر قرۃ العین کے پاس پہنچ جائے۔ پورا سفر وہ فقط قرۃ العین کے متعلق سوچتی رہی تھی۔ کراچی پہنچ کر ثاقب اسے ایئرپورٹ سے ڈائریکٹ ہوٹل لے آیا تھا۔ ہوٹل کی لابی میں کھڑا اس کا وجود مایوسی کی انتہا پر تھا۔

"رات بہت ہو گئی ہے' ہم صبح تمہارے گھر چلیں گے۔" بظاہر اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا مگر اندر اس کا اپنا آپ جس بے چینی کے حصار میں تھا' ثاقب اس سے بے خبر رہا۔ پوری رات اس نے کروٹیں لیتے گزار دی تھی۔ جب تک وہ اس سے دور تھی محض اس کی یاد اسے بے چین رکھتی تھی مگر اب جب کہ وہ اس سے زیادہ فاصلے پر نہ تھی۔ اسی شہر میں تھی تو جیسے ہر احساس خار بن گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ تیار ہو کر ثاقب کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ مگر وہ نجانے کتنی راتوں کا جاگا ہوا تھا کہ اب بھی اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ مایوس ہو کر قریبی صوفوں پر بیٹھ کر اس کے جاگ جانے کا جاں لیوا انتظار کرنے لگی۔ بالآخر وہ اٹھ گیا تھا' بختاور جس بے چینی کے زیر اثر تھی وہ اتنا ہی پر سکون تھا۔ اسی سکون کے پیش نظر اس نے باتھ لیا تھا' شیو بنائی تھی اور اب نہایت اطمینان کے ساتھ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے

کھڑا پرفیوم کا فراخ دلی سے استعمال کر رہا تھا۔

اور جب اس نے اسے چلنے کا عندیہ تو جیسے بختاور کے پورے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ اس سے قبل قرۃ العین کا وجود اس کے لیے اس قدر اہم نہیں رہا تھا اور اب اس کے پاس جانے کے خیال سے اس کا ذہنی خلفشار ختم ہو گیا تھا۔

ممی ڈیڈی، دادو اور فصیح نے ان کا نہایت خوشگوار انداز میں استقبال کیا تھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات حقیقی رنگوں سے مزین تھے مگر اس وقت وہ صرف ایک حقیقت سے واقف تھی اور اس حقیقت کا نام تھا قرۃ العین۔

اپنے کمرے میں آکر اس نے بے تابانہ انداز میں اس کی جانب پیش قدمی کی تھی۔ اپنے اندر سے امڈتے پیار کو اس پر نچھاور کرتے ہوئے وہ اس وقت ایک دیوانگی کے زیر اثر تھی۔ لنچ کے بعد ثاقب اسے اپنے گھر جانے کا بتا کر چلا گیا تھا۔ اس نے رسماً بھی اسے ساتھ چلنے کی دعوت نہیں دی تھی۔ مگر اس بارے میں زیادہ سوچ کر اس نے خود کو زودرنجی میں مبتلا نہیں کیا تھا۔ جس حقیقت کا اسے سامنا تھا وہاں ایسی چھوٹی موٹی باتوں کو بھی قبول کرنا ضروری تھا۔ وہ ایک ہفتے تک اپنے والدین کے گھر رہی تھی۔ اس دوران صرف نادیہ نے اسے فون کرنے کی زحمت اٹھائی تھی۔ اس واقعہ کے بعد نادیہ نے پہلی بار اسے مخاطب کیا تھا، اس کی خیریت دریافت کی تھی اور وہ بھی سابقہ لب و لہجے میں۔

اگلے ہفتے ثاقب اسے اپنے ساتھ لندن لے آیا تھا جس دوران وہ اپنی اور قرۃ العین کی پیکنگ کر رہی تھی۔ اس دوران دادو نے اس سے ایک عجیب و غریب مطالبہ کیا تھا۔ وہ ششدر سی انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"تمہاری ثاقب کے ساتھ نئی نئی شادی ہے، ابتدائی دنوں میں یہ رشتہ بہت سی احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ آج وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہارے لیے سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہے لیکن ایسا ضروری بھی نہیں ہے کہ وہ آئندہ برسوں تک اپنی اس محبت کو برقرار رکھ سکے۔" وہ حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

"آپ کہنا کیا چاہ رہی ہیں؟"

"وہی جسے تم سمجھنا نہیں چاہ رہیں۔ تم یہ کیوں نہیں مان لیتیں کہ تمہارا ثاقب کے ساتھ رشتہ نازک ترین حالات کا شاخسانہ ہے۔ اب قرۃ العین کو اپنے ساتھ لے جا کر تم اپنی زندگی کو داؤ پر لگانے جا رہی ہو۔"

"دادو آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ آپ جانتی ہیں کہ میں نے ثاقب کے ساتھ شادی کے لیے خود کو تیار فقط اس شرط کے عوض کیا تھا کہ وہ میرے ساتھ قرۃ العین کو قبول کرنے کو تیار ہے اب مجھے کون سے ڈراوے دے رہی ہیں۔ میں سمجھ نہیں پا رہی۔" وہ تقریباً" رو دینے والے انداز میں گویا ہوئی تھی۔

"تم کچھ بھی سمجھنا نہیں چاہتیں۔ تمہاری زندگی اس وقت نازک دوراہے پر کھڑی ہے اور تم اب بھی بچکانہ رویہ اپنائے ہوئے ہو۔ میری بات غور سے سنو۔ اس وقت تمہارا صرف تمہارا ثاقب کے ساتھ جانا ضروری ہے۔ قرۃ العین کی فکر مت کرو۔ اس کے خیال کرنے والے بہت ہیں۔ تم صرف اپنے اور ثاقب کے رشتے کی فکر کرو۔" وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"ہرگز بھی نہیں دادو! میں ایسا نہیں کروں گی۔ مجھے اس کے بغیر کہیں بھی نہیں جانا۔" وہ ہٹ دھرمی سے کہتے ہوئے ان کے سامنے سے ہٹ گئی۔ لندن آنے کے باوجود کافی عرصے تک دادو کے استدلال پر کڑھتی رہی تھی۔ لیکن یہ نہیں تھا کہ وہ دادو سے متنفر ہو گئی تھی۔

دن بہت سبک رفتاری سے گزر رہے تھے۔ یہاں آکر ثاقب اپنی جاب میں مصروف ہو گیا تھا۔ وہ گھر اور قرۃ العین کی ذمہ داریوں میں مگر اس مصروفیت میں بھی بختاور ثاقب کے بدلتے رویے کو نظر انداز نہیں کر پائی تھی۔ اس سے قبل ثاقب اس قدر کم گو کبھی نہیں رہا تھا۔ جتنا کہ آج کل رہنے لگا تھا۔ لیکن اس بارے میں بختاور نے اسے کریدنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ فی الحال وہ خاموشی سے اس کی کم گوئی کا جائزہ لینا چاہتی تھی اور ضروری نہیں تھا کہ اس کی خاموشی کا پس منظر قابل گرفت ہوتا اسے کوئی آفیشلی پرابلم بھی ہو سکتی تھی جو شاید وہ اس سے شیئر کرنا غیر ضروری تصور کر رہا تھا۔

اس رات وہ فیصلہ کن انداز میں جاننے کی خواہاں تھی۔ بیڈ پر دراز وہ کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ قرۃ العین کو سلانے کے بعد وہ بیڈ پر آبیٹھی، ابھی وہ کچھ کہنے کے لیے مناسب الفاظ کی ترتیب میں مصروف تھی جب اس نے کتاب بند کر کے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی اور اپنی سائیڈ کا لیمپ آف کر کے کروٹ بدل کر لیٹ گیا تھا۔ بختاور بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

"آپ کو نیند آ رہی ہے؟" بالآخر وہ خاموش نہیں رہ پائی۔ جواب میں "ہوں!" کہنے پر اکتفا کیا گیا تھا۔ آنسو خود بخود بہنے لگے تھے۔ پوری رات اس نے آنسوؤں کی نذر کر دی تھی۔ اگلے چند روز تک ثاقب کا رویہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔

جیسے جیسے اس کی سیکنڈ ڈیلیوری کے دن قریب آ رہے تھے اس کی زودرنجی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس روز وہ چاہنے کے باوجود اٹھ کر ثاقب کی آفس جانے کی تیاری میں مدد نہیں دے سکی تھی۔ جب ثاقب نے اسے عرصہ بعد مخاطب کیا تھا۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ اس سے دریافت کر رہا تھا، یا اپنی رائے دے رہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ بس خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

شام کو جب اس کی واپسی ہوئی تو اس کے ساتھ ایک مقامی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ وہ قرۃ العین کے لیے گورنس لایا تھا اسے اس کا خیال تھا مگر نجانے کون سی چیز اس کی گہری چپ کا پس منظر بنی ہوئی تھی۔ بختاور نے دانستہ اس بات کو محسوس کرنا ترک کر دیا تھا۔

اگلے روز آفس جانے سے قبل وہ اسے شام کو تیار ہونے کی تاکید کر رہا تھا۔

"کہیں جانا ہے۔" اس نے استفسار کیا۔

"ہوں۔" وہ اپنے کف بند کرتے ہوئے بولا۔

"شام کو آفیشل ڈنر ہے۔ ہم دونوں انوائیٹڈ ہیں۔" وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی۔

ڈنر کے دوران وہ جس طرح اس کا اپنے کولیگز سے تعارف کروا رہا تھا۔ اس نے بختاور کو اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ شاید محفل کا تقاضا بھی یہی تھا، مگر نہیں باہر نکلتے ہی اس کا رویہ تبدیل نہیں ہوا تھا۔ ہلکی ہلکی بوندا باندی میں وہ اس کا ہاتھ تھام کر پارکنگ لاٹ میں لے آیا تھا۔ پھر اس سے تائید طلب لہجے میں دریافت کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں نا تھوڑی سی چہل قدمی کی جائے۔" وہ گنگ سی اس کے بدلتے موڈ کو دیکھ رہی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وہ سوچوں کی گہری دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔ نہ تو وہ اس کی اچانک گہری خاموشی کی وجہ جان پائی تھی اور نہ ہی اس سے اس کا یہ خوش گوار انداز ہضم ہو رہا تھا۔

چہل قدمی کے دوران وہ ہی ہلکے پھلکے انداز میں گفتگو کرتا رہا تھا۔ وہ تو بس اسے سن رہی تھی۔ اس کی دبی دبی مسکراہٹ اور کھنکتا لہجہ بختاور کے لیے قطعی اجنبی نہ تھا۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ اسی لہجے کی عادی تھی۔ مگر اتنے عرصے بعد اس کا یہ انداز اجنبیت کا عکاس تھا۔ اس کا خیال تھا کہ گھر جا کر اس کا رویہ تبدیل ہو جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا۔ اگلے روز چونکہ تعطیل تھی اس لیے وہ رات گئے تک اس سے خوش گوار انداز میں گفتگو کرتا رہا تھا۔

اگلے دن کا سورج ثاقب کی جامد چپ کے ساتھ طلوع ہوا۔ وہ ایک بار پھر سابقہ انداز میں لوٹ آیا تھا۔ تب بختاور کی ازلی متجسس خو نے اسے اس بارے میں جاننے کے لیے اکسایا تھا۔ ایک ہفتے کے خاموش جائزے نے اسے نتائج کی جس کسوٹی پر لا کھڑا کیا تھا۔ اس نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ اس کی خاموشی قرۃ العین کے وجود سے منسلک تھی۔ وہ اگر اس کی نظروں کے سامنے نہیں ہوتی تھی۔ تو خاموشی بھی کہیں نہیں ہوتی تھی۔ وہ بلا تکان بولتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ اس کے لبوں کا لازمی جزو بن جایا کرتی

تھی۔ اور جب وہ اس کے سامنے ہوتی تھی تو صرف خاموشی اپنا احساس دلاتی تھی۔

یہ کیسا انکشاف تھا، جس نے اسے اندر تک ہلا ڈالا تھا۔ اپنے اس مشاہدے کو غلط ثابت کرنے کی خاطر اس نے کئی بار یہ عمل دہرایا تھا۔ اور نتیجہ وہی نکلا تھا۔ اس کے احساسات کی دنیا میں ہلچل سی برپا ہوگئی تھی۔ وہ نجانے کتنی دیر تک خود سے الجھتی رہی تھی۔ زندگی کے معاملات کبھی بھی رونے دھونے سے بہتر نہیں ہوتے۔ اس نے بھی رونے دھونے سے احتراز برتا تھا۔ وہ فی الحال خود کو اس تکلیف دہ انکشاف سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

ہر گزرتا دن اس کی بے بسی میں اضافے کا باعث بن رہا تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی ثاقب سے اس معاملے میں استفسار نہیں کرسکی تھی۔ جو رویہ وہ قرۃ العین سے اپنائے ہوئے تھا وہ فطری تھا، اس میں کوئی بناوٹ نہ تھی اور وہ اسے زبردستی اپنی قرۃ العین سے محبت کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی تھی۔ اور اس محبت کا تو اس نے وعدہ بھی نہیں کیا تھا۔ یہ تو اس کی خوش فہمی تھی جس نے اس بارے میں اس حد تک خوش گمانی تک رسائی حاصل کی تھی۔ اس نے تو صرف اسے اپنا نام دینے کا عہد کیا تھا اور اس نے اپنا وعدہ پورا بھی کیا۔

دادو کے خدشات درست ثابت ہوئے تھے۔ اس کی ازدواجی زندگی میں سرد لہر در آئی تھی۔ ثاقب کے سامنے وہ قرۃ العین کے وجود سے غافل ہوجاتی۔ وہ لپکتے ہاتھوں سے اس کی جانب بڑھتی اور وہ اس کے ہاتھ جھٹک دیتی، ہنس ہنس کر اپنی جانب متوجہ کرتی۔ اور وہ اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریز کرتی۔ کتنا روح فرسا اور اعصاب شکن، رویہ تھا۔ جو اس نے اپنی بیٹی سے اپنایا ہوا تھا۔ اور یہ رویہ اسے اندر سے مار رہا تھا۔ ختم کررہا تھا۔ مگر جو شخص اس کے اس رویے سے خوش تھا۔ وہ ثاقب تھا۔ اپنی ازدواجی زندگی کو بچانے کی خاطر وہ یہ سب کررہی تھی۔ اپنی ممتا درگور کرکے وہ ثاقب کی محبت کا علم بلند کیے ہوئے تھی۔ محض اس خیال سے کہ اس کی بیٹی بے نام نہ ہوجائے، جو عزت و تکریم اسے اس نام سے وابستہ رہ کر مل سکتی تھی اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہوسکتا تھا، وہ چاہتی تو اس بارے میں ثاقب سے استفسار کرسکتی تھی۔ بحث کرسکتی تھی۔ لیکن اس بحث کے کیا نتائج نکل سکتے تھے۔ اسی اندیشے نے اس کے لبوں پر قفل لگادیے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے سائبان کی خاطر اس سے اختلاف رائے نہیں کرسکتی تھی۔ اعتبار اور یقین کے رشتوں میں ضبط اور سعی اپنا آپ منوا رہی تھی۔ اب ثاقب کے ساتھ اس کا رشتہ محض ذہنی تناؤ کے سوا کچھ نہ تھا۔ الجھی ہوئی بکھری ہوئی اس کی ذات کی کرچیاں اس کے احساسات میں پیوست ہوکر رہ گئی تھیں۔

اس کی معصوم بچی اپنی ناکردہ غلطیوں کا خمیازہ بھگت رہی تھی۔ اپنے باپ کی شفقتوں سے تو وہ محروم ہوچکی تھی، اور اب ماں کے وجود کی قربت کے باوجود وہ دوری جھیل رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کا مفہوم بخاور جانتے بوجھتے نظر انداز کررہی تھی۔ یہ اس کی شکستگی کی انتہا تھی، ارتضٰی اور پھر موموکی پیدائش کے بعد جو تھوڑا بہت وقت وہ قرۃ العین کی نذر کرتی تھی، دونوں نے اپنی جانب مبذول کرالیا تھا۔ اب صرف سوچوں اور خیالوں تک ہی وہ قرۃ العین سے محبت کرسکتی تھی۔ اور وہ ایسا ہی کرتی تھی۔ زندگی کو اس رخ پر جینا اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ اس نے تصور کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی کو اس رخ پر جینا اتنا آسان نہیں تھا جتنا کہ میں نے تصور کیا تھا۔ کہنے کو تو میں نے کہہ دیا تھا کہ میں قرۃ العین کو اپنا نام دوں گا ایک باپ ہونے کا احساس دوں گا اور جب عملی اقدامات کی باری آئی تو میرا ہر کھوکھلا دعوا میرا منہ چڑا رہا تھا۔

میں نے قرۃ العین کو نہیں دیکھا تھا مگر لاشعوری طور پر ہم دونوں کے مابین ایک رشتہ ہمیشہ کے لیے طے پاگیا تھا۔ اور وہ رشتہ تھا ناپسندیدگی کا۔ گزرتا وقت اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتا ہے۔ انہیں نشانات کے سبب آج میں وہ زندگی گزار رہا تھا۔ جو بے رنگ تھی۔ کسی بھی خوش کن احساس سے عاری تھی۔ زندگی کی مخصوص زندہ رہنے کی خواہش اندر کہیں دم توڑ گئی تھی۔ میں مسکرانے کی کوشش کرتا۔ لیکن مسکرا نہیں پاتا تھا۔ سوچ کا عمل اور سمجھنے کا سلسلہ محض نفرت کے گرداب میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

میں نے اپنی ماں کے سامنے گڑگڑا کران سے زندگی کی سب سے بڑی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ جو میرے لیے اذیت ناک تھی اور انہوں نے بلا حیل و حجت زندگی دان بھی کردی۔ اور اب میں یہ سوچ رہا ہوں کہ کاش میرے والدین مجھے اس عمل سے باز رکھنے کے لیے ہر ممکن سعی کرتے، کم از کم بخاور سے شادی کرنے سے ہی روک پاتے۔ لیکن انہوں نے مجھے حالات کے دھارے پر بہنے دیا تھا۔ انہوں نے رکاوٹیں تو کھڑی کی تھیں مگر غیر مستحکم، میری زندگی کے اس حصے کی شوریدہ سری، ان غیر مستحکم ستونوں کو بہا لے گئی تھی۔ کاش میں اپنی زندگی کے اس حصے کو اپنے وجود سے اکھاڑ پھینکنے کی صلاحیت رکھ پاتا۔ معجزے کی تمنا، فقط دلوں کی دنیا تک محدود رہتی ہے اور آج میری ہر تمنا بے بسی اور بے چارگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھی۔ میں وہ شخص تھا، جس نے تمام زندگی سر اٹھا کر جی تھی۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سب کا سامنا کیا تھا۔ مگر بخاور سے شادی کرنے کے بعد مجھے اپنے اس زعم سے محروم ہونے پڑا تھا مگر یہ بھی نہیں تھا کہ مجھے اس چیز کا احساس فوراً" ہی ہوگیا تھا۔

نفرتوں کو پنپنے میں لوکہ لمحے صرف ہوتے ہیں مگر جب یہ نفرت اپنے نقوش واضح کرلیتی ہے تو پھر کسی اور احساس کے پنپنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

نفرت اور محبت کے درمیان کتنا تکلیف دہ سفر تھا۔ کتنا اذیت ناک ہوتا ہے وہ عمل جب آپ کسی کو اپنی محبت کا تاثر دینا چاہتے ہیں اور آپ دے نہیں پاتے، بعض لوگوں پر زندگی بہت مہربان ہوتی ہے، لیکن بعض لوگ جانتے بوجھتے اس زندگی کو دھتکار دیتے ہیں۔ میرا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے، میرے لیے میری زندگی کا مفہوم ناقابل فہم تھا۔

مجھے بخاور سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی اور اس بات کا خیال مجھے اس سے شادی کرنے کے دو سال بعد ہوا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں بخاور سے شادی کے بعد ایک عجیب سے ذہنی خلفشار میں مبتلا تھا۔ بخاور سے میری محبت آج بھی اپنا وجود رکھتی تھی۔ مگر بخاور سے منسلک ایک رشتہ میری زندگی کی پھانس بن گیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کسی سے اتنی نفرت نہیں کی تھی جتنی میں قرۃ العین سے کرتا تھا۔ جب جب میری اس پر نظر پڑتی تھی تب تب سلجوق عمر کے ساتھ بتایا گیا ایک ایک لمحہ کسی فلم کی طرح میری نگاہوں کے سامنے چلنے لگتا تھا۔ پہلے تو میں اسے لاشعوری طور پر اگنور کرتا تھا، مگر اب میرا ہر عمل میرے شعور کے احکامات کی زد میں تھا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں، میں بخاور سے جس رویے کا متقاضی تھا، اس رویے تک کی چھاپ اس کے انداز میں نہ تھی۔ لیکن میں نے اس چیز کو محسوس نہیں کیا۔ میں تو اسے پالینے کی سرشاری میں اس حد تک مگن تھا کہ میں اس کی گہری چپ کا پس منظر بھی جاننا نہیں چاہتا تھا۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ بخاور میری زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔ زیادہ عرصے تک میں اپنی اس سرشاری کو برقرار نہیں رکھ پایا تھا۔ میری اس قدر محبت کی شدت کے جواب میں اس کا گہرا سکوت اس کی آنکھوں کا جامد ٹھہراؤ، اس کے چہرے اور جسم کے ایک ایک عضو پر ثبت ایک گہری چپ نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔ اس کا یہ سکوت میرے لیے کس قدر تکلیف دہ تھا۔

وہ اس سے بے خبر تھی۔ گوکہ اس سے قبل بھی اس نے کبھی میری محبت کی شدتوں کو پذیرائی کا شرف نہیں بخشا تھا، مگر اب اس کی یہی لاپروائی قابل گرفت ہوتی جارہی تھی۔

میں ایک اعلا ظرف شخص ہرگز بھی نہیں تھا۔ مگر بخاور کے خاندان والوں نے مجھے اس مسند پر لا بٹھایا تھا۔ اگر بخاور سے میری محبت کو اعلا ظرفی سے تعبیر کیا گیا تھا تو مجھے اس احساس کو اپنے اوپر طاری کرنے میں

کوئی تامل نہیں تھا۔ اور لاشعوری طور پر میں اپنی اسی نام نہاد اعلا ظرفی کی بختاور سے توصیف چاہتا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھے ممنونیت کا احساس نہیں دیا تھا کہ وہ مجھے کوئی اعلا ظرف شخص گردانتی۔ میں بختاور کی خاطر اپنے خاندان سے کٹ گیا تھا۔ ان کی محبتوں سے محروم ہو گیا تھا۔ یہ کوئی احسان نہیں تھا جو میں نے اس پر کیا تھا۔ مگر قرۃ العین کو اپنی بیٹی کی حیثیت سے نام دیتے ہوئے میں لاشعوری طور پر منتظر تھا کہ بختاور میرے اس عمل کو سراہے، ایک بار مشکور ہو مگر اس نے میرے تمام افعال کو ایک حق کی طرح وصول کیا تھا۔

لندن شفٹ ہونے کے بعد میری زندگی میں ایک واضح تبدیلی رونما ہوئی تھی، اور وہ تبدیلی تھی میری مصروفیات، انہیں مصروفیات میں گم ہو کر اب میں سابقہ زودرنجی کی دنیا سے باہر نکل آیا تھا۔ اور شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ بختاور بھی مختلف تغیرات سے دوچار تھی۔ پہلے کی طرح وہ اپنا زیادہ تر وقت قرۃ العین کے ہمراہ یا اس کے متعلق سوچنے میں نہیں گزار رہی تھی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میں اس کی توجہ کا مرکز بن جایا کرتا تھا۔ میں جب تک گھر میں موجود ہوتا تھا وہ یکسر قرۃ العین کو فراموش کیے ہوتی تھی۔ میں جانتا تھا کہ بیٹی کی محبت اس کی رگوں میں خون کی مانند دوڑ رہی تھی۔ اپنے دل میں اس کی بیٹی کے حوالے سے احساسات رکھنے کے باوجود میں اسے قرۃ العین سے جدا نہیں کر پایا، البتہ وہ اپنی بیٹی کی خاطر اس سمجھوتے کا حصہ بن گئی تھی۔ جو بظاہر ہم دونوں کے مابین کبھی طے نہیں پایا تھا۔

گزرتا وقت میرے اندر کسی بھی قسم کی تبدیلی کا موجب نہیں بنا تھا۔ اگرچہ کہ اب میں دو بچوں کا باپ بن گیا تھا۔ ارتضیٰ اور مریم کی پیدائش پر بھی میں فطری جوش و خروش کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔ قراۃ العین کے جیتے جاگتے وجود کے سامنے میری ہر خوشی ہیچ تھی۔ بے رنگ تھی۔ میں خوش ہونا بھی چاہتا تھا تب بھی خوشی جیسا احساس میرے لیے ریت بن گیا تھا۔ جو میری دسترس میں ہوتے ہوئے بھی نہیں تھی۔

اگرچہ کہ وہ عام بچوں سے مختلف عادات و فطرت کی مالک تھی مگر اس کے باوجود اس نے کبھی بھی مجھے اپنی جانب متوجہ نہیں کیا تھا۔ جس طرح ارتضیٰ اور مومو مجھ سے پیار کسی حق کی طرح وصول کرتے تھے وہ بس ایک تماشائی کی مانند اس منظر کو دیکھا کرتی تھی، اس نے کبھی بھی اس منظر کا حصہ بننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اور ایسا کرنے سے اسے بختاور نے منع کیا تھا یا وہ فطری طور پر اس قدر جھجک رکھتی تھی، میں اس بات سے بے خبر تھا۔ مجھے کبھی بھی اس کی نظروں کے سکوت نے بے چین نہیں کیا تھا۔

حالانکہ بار بار اس معاملے میں میں نے اپنے دل کو کھنگالا تھا۔ کوئی تاسف آمیز احساس نہیں ابھرا تھا۔ وقت گزر رہا تھا۔ اور قرۃ العین سے وابستہ میری خود ساختہ نفرت پروان چڑھ رہی تھی۔

دس سال لندن میں گزارنے کے بعد اب میں نے مستقل طور پر پاکستان شفٹ ہونے کے بارے میں بڑی سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔ میری اس سوچ میں میرے گھر والوں کا عمل دخل بھی شامل تھا۔ دس سال بعد محبت سے مجبور ہو کر انہوں نے مجھے معاف کر دیا تھا مگر بختاور کے لیے اب بھی دروازہ نہیں کھلا تھا۔ اور میرے لیے یہ بھی بہت تھا۔

پاکستان شفٹ ہونے کے بعد میں نے قرۃ العین میں ایک عجیب سی تبدیلی رونما ہوتے دیکھی تھی۔ وہ وقتاً" فوقتاً" اپنی خواہشات کا اظہار کرنے لگی تھی۔ کبھی کھلونوں کے حوالے سے، کبھی کپڑوں کے حوالوں سے، اگرچہ اس کا یہ انداز بر استحقاق نہ ہوتا تھا مگر اس کے باوجود مجھے اس کا یہ رویہ کھل رہا تھا۔ میری نظر میں اس لڑکی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اور وہ اپنی اہمیت جتانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے اس عمل کے عقب میں کون سی طاقت کار فرما تھی۔

اگر اس روز میں آفس سے جلدی نہ آتا تو مجھے کبھی بھی معیز اور اس کی دوستی کی خبر نہیں ہو سکتی تھی۔

معیز اسے کسی استاد کی طرح نصیحت کر رہا تھا۔ اسے بتا رہا تھا کہ اپنا حق لینے کے لیے اسے کیا کرنا ہو گا۔ مجھے معیز پر غصہ نہیں آیا تھا۔ میرے تنفر کا مرکز فقط قرۃ العین کی ذات تھی۔ کوشش کے باوجود میں معیز کو اپنے گھر آنے سے باز نہیں رکھ پا رہا تھا غالباً" میرے پاس مناسب الفاظ ہی نہ تھے جسے استعمال کرنے کے بعد میں اسے یہاں آنے سے روک دوں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں آپی مجھے ایک بار پھر مورد الزام ٹھہرائیں۔ عمران کا بیٹا میرا ہر منصوبہ ناکام بناتا جا رہا تھا۔ قرۃ العین پر ڈھائے جانے والے مظالم کا اس نے سنجیدگی سے نوٹس لیا تھا، یہی نہیں وہ اس کا برین واش بھی کر رہا تھا۔ اور جب میں نے قرۃ العین کو ایم بی اے کرنے سے منع کیا تو معیز میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ وہ مجھ سے میرے اس انکار کا جواب طلب کر رہا تھا۔ وہ جیسے قرۃ العین کے لیے ایک ڈھال بن گیا تھا۔ اسے سرد و گرم سے بچائے رکھنا اس کا اولین فرض بن گیا تھا۔

جب آپی کو اس کی اور معیز کی اس قدر دوستی کی بھنک پڑی تھی تو انہوں نے ایک ہنگامہ سا کھڑا کر دیا تھا۔ بائیس سال قبل بھی وہ اسی طرح کے ایک ہنگامہ کا حصہ بنی تھیں۔ مگر تب میں ایک مضبوط چٹان کی مانند ان کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اور آج بائیس سال بعد ان ہی کا بیٹا چٹانی عزائم کا اعادہ کرتے ہوئے میرے روبرو تھا۔ تب میں ایک جذباتی لمحہ کا اسیر تھا اور آج معیز کو اس لمحے سے نکال لانے کا مضبوط عزم میرے ارادوں سے ہویدا تھا۔ میں نے اسے صاف لفظوں میں باور کروا دیا تھا کہ میں قرۃ العین کی شادی کبھی بھی اس سے نہیں ہونے دوں گا۔ میرا مضبوط لہجہ بھی اس کے ارادوں کو منتشر نہیں کر سکا تھا۔ وہ جب میرے آفس سے باہر نکل رہا تھا تو اس کے قدم مضبوطی سے زمین پر ٹکے ہوئے تھے، اور اب مجھے ان قدموں کو اکھاڑنا تھا۔ اس کی مضبوطی کو چکنا چور کرنا تھا اور ایسا میں تب ہی کر سکتا تھا جب قرۃ العین میرے سامنے ہوتی۔

میں نے دوٹوک انداز میں اس شادی سے انکار کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں بختاور کی جانب سے کی گئی کوشش کو بھی میں رد کر چکا تھا پھر وہی ہوا تھا جو میں نے پلان کیا تھا۔ ہرچند کہ اس واقعہ کے بعد میں نے ایک نئی اور مختلف قرۃ العین کو ابھرتے دیکھا تھا۔ جو میرے ہر خیال، ہر حکم کو رد کر رہی تھی۔ مگر پھر بھی مجھے قابل قبول تھی۔ میں اسے معیز کی زندگی سے کھینچ لایا تھا اور کم از کم میرا یہ عمل میری نظر میں تقویت آمیز تھا۔ جن رشتوں کو پانے کے لیے میں نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات صرف کر دیے تھے۔ میری ذرا سی لاپروائی سے رشتوں کی یہ ڈور ایک بار پھر ٹوٹ سکتی تھی۔ اور اس بار اس ڈور کو جوڑنا کسی کے بھی بس میں نہیں ہو سکتا تھا۔

معیز کی شادی فارینہ سے ہو گئی تھی۔ وہ خوش تھا یا ناخوش مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ پروا تو مجھے قرۃ العین کی بھی نہیں تھی مگر اس کا ہر عمل مجھے اس کی جانب متوجہ کر رہا تھا، وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ مقابلہ کرتی وہ میرے ہر خیال، ہر سوچ کی ضد بن گئی تھی۔ اسی ضد میں اس نے میرے سامنے زیاد آفاق کو لا کھڑا کیا تھا۔

اب اگر وہ یہ سوچ رہی تھی کہ میں اس سلسلے میں اپنے اعتراضات سامنے رکھ دوں گا تو یہ محض اس کی خام خیالی تھی۔ مجھے معیز کو اس کی دسترس سے باہر کرنا تھا اور میں کر چکا تھا۔ معیز کے بعد وہ کسی بھی ایکس وائی زیڈ سے شادی کرتی مجھے پروا نہیں تھی۔

میں نے زیاد آفاق کے گھر والوں کو اپنی پسندیدگی کا عندیہ دے دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ شادی جلد از جلد ہو جائے۔ زیاد آفاق کی فیملی نے اس بارے میں کوئی اعتراض نہیں اٹھایا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے ناپسندیدگی کے رشتے کو ایک معتبر حوالہ دیا تھا، اور آج اس حوالے کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ میں یہ سب بختاور کو متاثر کرنے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ جس وقت میں نے صلہ چاہا تھا تو اس نے ایک گہرا سکوت میرے حوالے کیا تھا۔ مگر اب میں

اپنے ہر عمل کی تلافی کرنا چاہتا تھا جو بختاور کو گراں گزرا تھا یا قرۃ العین کو۔

زیاد آفاق کے گھر مہندی لے جاتے ہوئے میں نے بختاور کے عجیب سے رویے کو محسوس کیا تھا۔ وہ غالباً" مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہیں پا رہی تھی۔ رات دیر گئے فنکشن سے واپسی عمل میں آئی تھی۔ میں بیڈ روم میں جانے کے بجائے اسٹڈی میں آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے بختاور کو اپنے پیچھے آتے دیکھا تھا' مجھے اچنبھا ہوا تھا۔

"مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے؟"

اس نے اپنی آمد کی توجیہہ پیش کی تھی۔ میں خاموش نظروں سے اسے جانچ رہا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کہنے والی تھی۔ جب وہ بولی تھی تو اس کا ایک ایک لفظ ممنونیت کے لبادے میں ملفوف تھا۔ وہ مجھے سراہ رہی تھی کہ میں نے آج تک ایک ناپسندیدہ رشتے کو نبھایا تھا۔ وہ میری اعلا ظرفی کے گن گا رہی تھی۔ مجھے عظمت کے اونچے مسند پر براجمان کر رہی تھی۔ اور میں ششدر سا اسے دیکھ رہا تھا۔

غالباً" میرا زیاد آفاق کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دینا اس کے لیے اس قدر تقویت آمیز تھا کہ وہ مجھ سے وہ باتیں کر رہی تھی جو کچھ عرصہ پہلے اس کے لیے ناپسندیدہ ترین تھیں۔ وہ میری ممنون تھی۔ کہ میں نے اس کی بیٹی کا رشتہ ایک اچھے خاندان سے جوڑا تھا۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ میں کس درجے کا اعلا ظرف شخص تھا' جس نے ایک نامعتبر رشتے کو معتبر بنایا تھا۔

میں کسی قسم کے تفاخر میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ اب مجھے اس کی جانب سے کسی قسم کی اعلا ظرفی کی سند درکار نہ تھی۔ جب اس کی ضرورت تھی تو اس نے فاصلوں کو درمیان میں رکھ دیا تھا۔ میں نے بہت صبر سے اس کی ساری گفتگو ملاحظہ کی تھی' جب وہ اپنی بات مکمل کر چکی' تب میں نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"تمہاری دانست میں یہ انکشاف ہوگا۔ مگر میں اپنی صلاحیتوں سے تم سے زیادہ آگاہ ہوں۔ تمہیں مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں کتنا عظیم شخص ہوں۔ عظیم نہ ہوتا تو تم سے شادی ہرگز نہ کرتا۔" اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ اگر وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ میں چوبیس سال پہلے والا محبتوں میں گندھا' ثاقب حسن تھا تو یہ اس کی خوش خیالی تھی۔ اس نے میری زندگی کا وہ رخ دیکھا یا محسوس کیا تھا جو میں نے اسے دکھایا تھا۔ اور اب میں اسے وہ رخ دکھانا چاہتا تھا کہ جس کی شبیہ سے وہ واقف تھی مگر جس کا پس منظر اس کی نظروں سے اوجھل تھا۔

میں نے اس پر واضح کر دیا تھا کہ میں نے یہ چوبیس سال کیسے گزارے تھے۔ فقط اعلا ظرفی کا ٹیگ لگا لینے سے تکلیف کم نہیں ہو جاتی اور میں تو ویسے بھی دوہری تکلیف کے شکنجے میں تھا۔ چوبیس سال تک قرۃ العین کا وجود میری نگاہوں کے سامنے رہا تھا۔ چوبیس سال تک میں بے سکونی کا شکار رہا تھا۔ میں نے اپنی زندگی کو دوسروں کی خواہشوں کی بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ میں نے وہ کیا تھا جو میرے ضبط' ظرف اور سکت سے بڑھ کر تھا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ غالباً" آج سے قبل اس نے اپنی زندگی کو بند آنکھوں کے ساتھ گزارا تھا۔ آنکھیں کھلی تھیں تو آنسوؤں پر بند باندھنا اس کی برداشت سے باہر ہو چکا تھا' وہ رو رہی تھی۔

"بہت مشکل ہوتا ہے بختاور! کسی کے گناہوں کو اپنا نام دینا اور وہ بھی بغیر کسی صلے کے۔"

اپنی نوازشات اور عنایات کا تذکرہ کرنا میں نے ضروری سمجھا تھا۔ آج کے دن میں اس کے ذہن کی ساری گرہیں کھول دینا چاہتا تھا۔ تمام گرے ہوئے پردوں کو اٹھانا چاہتا تھا۔ یہ گرے ہوئے پردے اٹھے تھے یا نہیں البتہ میرا یہ کتھارسس کسی اور کی سماعتوں کا حصہ بن گیا تھا۔

قرۃ العین سب جان گئی تھی۔ جس حقیقت کو اس کی خاطر چوبیس سال پہلے راز میں رکھا گیا تھا' وہ راز طشت از بام ہو چکا تھا۔ جس کا عملی ثبوت یہ تھا کہ وہ عین اپنی شادی والے روز جب تمام مہمان آ چکے تھے' بارات آنے والی تھی' تو وہ کہیں چلی گئی تھی۔ چوبیس سال تک میں اسے اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا دیتا رہا

تھا۔ آج جب اس نے میری اس نفرت کا عملی طور پر جواب دیا تھا' تو میرے قدموں سے زمین سرک گئی تھی۔ میں موقع پرست شخص تھا۔ مگر وہ موقع شناس ثابت ہوئی تھی۔ اس نے اس مقام پر مجھ سے بدلہ لیا تھا۔ جہاں سے کھڑے ہو کر میری نظروں میں اس کا وجود چیونٹی سے بھی کم تر تھا۔ میرے وجود میں جیسے ایک سنسنی سی دوڑ گئی تھی۔ یہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا۔

☆ ☆ ☆
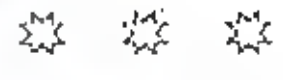
یہ سب ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ کوئی اس کے وجود کو ایک مہیب اور گہری تاریکی کی اور دھکیل رہا تھا۔ وہ کون تھا جو اسے پاتال کی گہرائیوں میں اتار رہا تھا۔ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مگر وہ لمس بہت مانوس تھا۔ باوجود کوشش کے وہ اس وجود کی شناخت نہیں کر پائی تھی۔ یکایک اس کی تمام کوششیں رائیگاں ہوتی چلی گئیں۔ وہ وجود اسے گھسیٹتا ہوا تاریکی کی اور پیش قدمی کیے ہوئے تھا۔

شدید خوف نے جیسے اس کی آواز کو کہیں گم کر دیا تھا۔ وہ چلا رہی تھی۔ مگر آواز جیسے کہیں اندر پھنس کر رہ گئی تھی۔ وہ تاریکیاں سے ایسے خوف کھا رہی تھی جیسے وہ اژدہا ہو' جو اسے نگلنے کے درپے ہو۔ وہ اور مزید قوت سے ہاتھ پاؤں مارنے لگی تھی۔ لیکن آواز کے ساتھ ساتھ جیسے اس کے تمام اعضا بھی منجمد ہو کر رہ گئے تھے۔

معا" ایک آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کیا تھا'

"مما" مدھم مگر مدھم آواز جیسے ایک بازگشت بن گئی تھی۔ اس آواز نے اسے ایک ان دیکھی سی طاقت دان دی تھی۔ کہاں تو وہ اس ان دیکھی شخصیت کے ساتھ گھسٹ رہی تھی اور کہاں اب اپنی تمام تر قوت سے اس شخص سے اپنا آپ چھڑوانے کی سعی کر رہی تھی۔ مگر شاید مقابل اس سے زیادہ طاقت ور اور قوی اعضا کا مالک تھا۔ "مما" آواز ایک بھر پر اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔ اس بار آواز کی طاقت نے اسے اس شخص سے آزاد کر دیا تھا مگر اس کے ساتھ ہی اس کا وجود کسی خلا میں معلق ہو گیا تھا۔ ہاتھ پیر مارتے ہوئے وہ فقط اس آواز تک پہنچنا چاہتی تھی۔

اچانک جیسے ایک نرم و نازک لمس نے اسے تھام کر اپنی اور کھینچ لیا تھا۔ اس نے طمانیت انگیز سانس خارج کیا تھا۔ ایسے جیسے اب کوئی چیز اسے خوفزدہ نہیں کر پائے گی۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بڑی شدت سے ہو رہا تھا کہ جو کچھ اس نے محسوس کیا وہ ایک خواب تھا۔ ایسا خواب جس نے اس کے اعصاب تک کو جھنجلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جلد از جلد حقیقت کی دنیا میں لوٹ آنا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولنا چاہیں مگر وہ ایسا نہیں کر پائی تھی۔ کسی نے جیسے اس کی آنکھوں پر بھاری بوجھ رکھ دیا تھا۔

وہ آنکھیں کھولنا چاہتی تھی۔ وہ اس بھیانک خواب سے چھٹکارا پانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے وجود کو خوف کی ان دیکھی زنجیروں سے آزاد کروانا چاہتی تھی۔ معا" اسے اپنے نزدیک کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ کوئی اپنے ٹھنڈے یخ ہاتھوں سے اس کے گال تھپتھپا رہا تھا۔ کسی کی آنکھوں کی نمی اس کا چہرہ بھگو رہی تھی۔ وہ اس آواز دینے والے وجود کو ایک بار صرف ایک بار دیکھ لینا چاہتی تھی۔ اس کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ابھر آئے تھے۔

☆ ☆ ☆

میرے چہرے پر یکلخت تشویش کے تاثرات ابھر آئے تھے۔ جنہیں چھپانے کی خاطر میں باہر نکل آیا۔ مگر میری یہ پریشانی بختاور سے پوشیدہ نہیں رہ پائی تھی۔ مہمانوں کو نظر انداز کرتی وہ میرے پیچھے تک آئی تھی اور جب اس نے مجھے اور ارتضیٰ کو لان میں ٹہلتے پایا تھا' تو ہماری یہ بے وقت کی چہل قدمی از خود سنگین صورت حال کا یقین دلا چکی تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ارتضیٰ کو کچھ بھی بتانے سے منع کرنے کا اشارہ کیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" اس کا لہجہ ہی نہیں اس کا انداز بھی

تفکرانہ تھا۔

"نہیں مما! ہم تو صرف بارات کا ویٹ کر رہے ہیں۔" ارتضیٰ نے بشاشت سے کہتے ہوئے اسے تسلی دی تھی۔ وہ اس کے جھوٹ سے مطمئن ہوئی تھی کہ نہیں البتہ خاموشی سے اندر ضرور چلی گئی تھی۔

"اب ارتضیٰ موبائل پر نجانے کون سا نمبر پنش کر رہا تھا اس کے چہرے کے تاثرات کے ساتھ ساتھ اس کی انگلیاں بھی اندرونی ہیجان کی زد میں تھیں۔

"کیا کر رہے ہو؟" کسے فون کر رہے ہو؟" میں نے اس کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا تھا۔

"پولیس کو۔" اس نے نہایت رسان سے کہا تھا۔ اور میں یونہی کھڑا رہا۔

میری صاف شفاف زندگی لوگوں کے قیاس اور چہ میگوئیوں کا سامان بننے والی تھی۔ قرۃ العین نے اپنی نارسائی کا بدلہ محض ایک کاری ضرب لگا کر لے لیا تھا۔ اور میں چوبیس سال تک ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی ضربوں کا سامان کیا کرتا تھا۔ وہ مجھ سے بڑی کھلاڑی ثابت ہوئی تھی۔

"بے وقوفوں جیسی حرکت مت کرو ارتضیٰ، تم کیا چاہتے ہو کہ میری بنی بنائی ساکھ ایک پل میں زمین بوس ہو جائے۔ پولیس صرف راکھ کرید کر چنگاریاں برآمد کرتی ہے۔ ہمیں ہمارے حسب توقع نتائج نہیں دیتی۔"

"تو کیا کروں پاپا میں، میں چپ چاپ یوں تماشا تو نہیں دیکھ سکتا۔ تمام مہمان آچکے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد بارات بھی آجائے گی۔ ہم لوگوں کو کیا جواب دیں گے۔ جواب دینا تو بہت دور کی بات ہے، میں تو ان عجیب و غریب نظروں کا سامنا بھی نہیں کر سکتا۔ جس میں عینی کے لیے ابہام ہوں گے۔ شکوک و شبہات ہوں گے۔"

وہ تقریباً" رو دینے کو تھا۔ پریشان میں بھی تھا۔ مگر اس کی طرح جذباتی نہیں ہوا تھا۔ ارتضیٰ کے مقابلے میں اس وقت میرے پاس قابل قبول حل صرف ایک ہی دکھائی دے رہا تھا۔ زیاد آفاق وہی ہماری اس مشکل میں مدد کر سکتا تھا۔

میں نے موبائل پر اس کا نمبر پنش کیا تھا اس کے لیے میرا اس طرح فون کرنا تعجب خیز تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ہمیں یہ شادی ملتوی کرنا پڑ رہی ہے۔ دوسری طرف سے اس نے کسی قسم کا استفسار نہیں کیا تھا۔

کم از کم میری ایک الجھن تو ختم ہوئی تھی۔ اور اب مجھے یہاں موجود مہمانوں کو بھی اسی طرح ایک جھوٹی داستان سنانی تھی۔ ارتضیٰ ابھی بھی پولیس کو کال کرنے کے ارادے پر مضبوطی سے جما ہوا تھا، وہ مجھے سمجھانے کی سعی کر رہا تھا۔ اس وقت میری نظروں میں، میری عزت سے بڑھ کر کوئی اور شے بھی نہیں تھی۔ معاً" بختاور اور نادیہ کی موجودگی نے میرے لبوں کو گنگ کر دیا تھا۔

تب میں ان سے حقیقت نہیں چھپا پایا تھا۔ بختاور کی نظروں میں اب بھی اپنا آپ بلند کرنے کی خاطر میں نہایت چڑچڑے انداز میں، اس کی بیٹی کے حوالے سے اسے آئینہ دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس وقت میری مخاطب وہ نہیں نادیہ تھی، البتہ درپردہ اسے سنا رہا تھا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ عینی جانتے بوجھتے ایسا قدم کیسے اٹھا سکتی ہے۔"

"وہ ایسا کر چکی ہے نادیہ! یہ اس کی خود سری کا پہلا واقعہ نہیں ہے۔ مگر شاید تمہارے لیے ہو گا۔ وہ میری عزت کو داؤ پر لگانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔ کسی بھی حد سے گزر سکتی ہے۔" میرا لہجہ اس وقت مصنوعی شکستگی کی لپیٹ میں تھا۔ معاً" میں نے بختاور کو اپنی اور لپکتے دیکھا تھا۔ وہ میرے سامنے کھڑی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بے خوف و خطر نظر آرہی تھی۔

"قرۃ العین خود سر نہیں ہے۔ اگر ہے تو ایسا تم نے اسے بنایا ہے۔" وہ مجھے آئینہ دکھا رہی تھی۔ ارتضیٰ مہمانوں کو ریسیو کرنے کی خاطر اندر چلا گیا تھا۔

"میں نے...؟" اچنبھے سے اپنی جانب اشارہ کرتے ہوئے میں مکمل طور پر خود کو مظلوم ظاہر کر رہا تھا۔

"ہاں تم نے، تم نے مجبور کیا اسے ایسا کرنے پر۔ کیا کچھ نہیں کیا تم نے اس کے ساتھ، مگر وہ خاموش رہی اس کی محبت تک تو تم چھین چکے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے تمہاری محبت کا پاس رکھا۔" کون سی بختاور میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ معاً" اس نے میرا گریبان تھام لیا تھا۔

"یاد رکھو ثاقب حسن اگر قرۃ العین کو کچھ ہوا تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ یہ... یہ وعدہ نبھایا تم نے۔ تم نے تو مجھ سے عہد کیا تھا کہ تم یہ راز کبھی عیاں نہیں ہونے دو گے۔ بس چوبیس سال میں تمہارا ضبط جواب دے گیا۔ جب تمہیں وعدہ نبھانا نہیں تھا تو میری زندگی میں کیوں آئے، میں تمہارے بغیر زندگی گزار سکتی تھی۔ میری زندگی کو ایک نئے عذاب سے دوچار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں، تم سے شدید نفرت کرتی ہوں ثاقب حسن!

کوئی حق نہیں پہنچتا تھا تمہیں کہ تم اسے اس حد تک ذلیل کرو۔ وہ تمہاری زر خرید غلام تو نہیں تھی۔ کیا تمہارے لیے ایک زر خرید غلام کافی نہیں تھا۔ کیا کبھی میں نے تمہارے کسی حکم کی نفی کی، اس لیے کہ بدلے میں تم میری بیٹی کو وہ اپنائیت دے سکو جو تم ارتضیٰ اور مومو کو دیتے ہو۔ تم نے اسے کبھی یہ التفات دیا ہی نہیں، لیکن پھر بھی میں نے اختلاف رائے کا نکتہ نہیں اٹھایا۔ چوبیس سال میں نے تمہاری فرعونیت کی نذر کر دیے، صرف اس لیے کہ تم نے میری بیٹی کو اپنے نام کا سائبان دیا تھا۔ اسی سائبان کے استحکام کی خاطر میں نے اپنے ساتھ ساتھ اپنی بیٹی کی خواہشات کو قربان کر دیا تھا۔ میں تمام عمر اسے ایک نام بخشنے کی سزا دیتی رہی۔ ایسی زندگی تو وہ یتیم خانے میں بھی گزار سکتی تھی۔ بلکہ اس سے بہتر زندگی، تو پھر مجھے تمہاری کیا ضرورت تھی۔

تم ایک نہایت گھٹیا اور کم ظرف شخص ہو۔ تمہیں ہرگز بھی مجھ سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔" وہ سسکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس کی سسکیاں مجھے جھنجھوڑ رہی تھیں۔ انکشافات کا ذخیرہ میرے ہی نہیں اس کے سینے میں بھی موجود تھا جسے آج وہ میرے سامنے منکشف کر گئی تھی۔ اور پھر وہ جھولتی ہوئی میرے قدموں میں گر گئی تھی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف لپکا تھا۔ عجیب سی کم مائیگی اور شکستگی کے احساسات نے میری آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عجیب سی کم مائیگی اور شکستگی کے احساسات نے میری آنکھوں کو دھندلا دیا تھا۔ معاً" ایک اجنبی لمس میرے سر پر آجما تھا۔ میں نے ایک دم چونک کر اپنے عقب میں جھانکا تھا۔ اور پھر مجھے ایک شدید ترین جھٹکے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میرے سامنے میرے پاپا بیٹھے تھے۔ میں ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی، میرے ساتھ وہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی مجھے ڈھونڈ لیں گے۔ میرے معاملے میں وہ ہمیشہ اتنے ہی مستعد رہے تھے۔ مگر بظاہر جو لاپروائی ان کی شخصیت کا خاصہ تھی میں اس کی عادی تھی۔ مجھے اپنے حوالے سے ان کی مستعدی تفکر دیکھ کر صرف تکلیف ہوا کرتی تھی۔ میرے اندر کا ابال بڑھنے لگا تھا، محبت ایک الوہی جذبہ ہے جو اندر سے پھوٹتا ہے۔ جس پر کوئی اختیار یا زور نہیں چل سکتا۔ بچپن سے لے کر آج تک میری زندگی کا ایک ایک پل اسی جذبے کے تحت پروان چڑھا تھا۔ میں نے تمام زندگی اس شخص کی محبت پانے کی کوشش میں صرف کر دی۔ یہ شخص مجھ سے دور بھاگتا اور میں اس کی جانب کھنچی چلی جاتی۔ مجھے دھتکارتا، پیار کرنا تو در کنار اس نے مجھے نظر بھر کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ یہ میرے اختیارات کی شکست ہی تھی کہ میں پھر بھی اس شخص سے محبت کرتی تھی۔ شدید ترین نفرت کا عملی مظاہرہ کرنے کے باوجود میری محبت نے اس نفرت کو ہرا دیا تھا۔

یہ شخص میرا باپ نہیں تھا۔ یہ صرف ارتضیٰ اور مومو کا باپ تھا۔ برسوں پہلے یہ حقیقت میرے تصورات کے دور افتادہ گوشوں میں موجود رہی تھی۔

اس حقیقت کو میں نے بار بار پرکھا تھا۔ جانچا تھا۔ مگر جو پہلو میری نظروں سے اوجھل تھے یا پھر جنہیں میں نے دانستہ در خور اعتنا نہیں جانا تھا' وہی تکلیف دہ انکشاف میرے ذہنی آزار کا باعث بنا ہوا تھا۔ صرف میرا ذہن اس حقیقت کو تسلیم کر پایا تھا' میرا دل ابھی بھی مزاحمت پر آمادہ تھا۔

زندگی کتنی بے یقین سی چیز تھی۔ جب میں حقیقت سے آشنا ہونا چاہتی تھی۔ تب عیاں ہونے کے لیے کوئی در' کوئی روزن نہ تھا۔ اور آج جب میں نے حقیقت کو کھوجنا ترک کر دیا تھا تو بنا کوشش ہی تمام پردے اٹھ گئے تھے۔ جب پردے ہٹے تھے تو منظر بھی واضح دکھائی دے رہا تھا۔ اور میں اس منظر سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔ میں ان کے سامنے کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ کیسے رہ سکتی تھی۔ آج مجھ سے انہیں بابا کہنے کا زعم چھین لیا گیا تھا۔

چوبیس سال تک میں اس شخص کی اذیت کا سامان کرتی رہی تھی۔ چوبیس سال تک میں نے انہیں سکون نہیں لینے دیا تھا۔ چوبیس سال تک وہ مجھ سے نفرت کرتے رہے تھے۔ اور میں تاسف اور زود رنجی میں مبتلا رہی۔ کیا کچھ نہیں سوچا تھا میں نے ان کے بارے میں' خود غرض' خود پسند' خود پرست' زعم پرست اور حقیقت کیا نکلی تھی۔ یہ شخص چوبیس سال سے میری ماں کی بدکرداری کو ان احساسات کے دبیز پردوں میں ملفوف کیے ہوئے تھا۔ میں نے تو کبھی یہ بھی نہیں سوچا تھا کہ آیا میں اتنے صبر اور ایثار کا مظاہرہ کیوں کرتی تھی۔ کیا کمی تھی ان میں' بیک گراؤنڈ مضبوط تھا' پاپا سے زیادہ خوبصورت تھیں' تعلیم یافتہ تھیں لیکن پھر بھی وہ ان سے دبتی تھیں۔ اس تعلق کی بے اعتنادی میں' میری ماں کا کیا مقام تھا۔ آج میں جان پائی تھی وہ بھی تمام جزئیات سمیت اور یہ شخص کہاں کھڑا تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا کم از کم قرۃ العین ثاقب وہاں کھڑی نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ اس شخص کے سامنے کھڑی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ کتنے استحقاق سے میں نے انہیں اپنی نفرت اور ہٹ دھرمی کا نشانہ بنایا تھا۔ ان کی سرد مہری اور شکن آلود چہرہ اتنا اذیت ناک تو نہیں تھا۔ اور اب میں ان کے ساتھ ساتھ کسی اور کی زندگی کو اذیت سے ہم کنار نہیں کر سکتی تھی۔ معیز حیدر کو تو انہوں نے مجھ سے بچا لیا تھا۔ مگر زیاد آفاق کا تو کوئی قصور نہ تھا۔ وہ بھی ایک باعزت زندگی گزارنے کا حق رکھتا تھا۔ میری حقیقت جاننے کے بعد میں اس کی اذیت میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ یقیناً "اس اقدام سے ناخوش ہوگا۔ مگر آج اس کا ناخوش ہونا مجھ سے شادی کرنے سے بہتر تھا۔ میری اندر کی آوازیں اس کمرے میں موجود دو نفوس کی حقیقی جذبات و احساسات کی ترجمان تھیں۔ میں قصداً" دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ معاً" ان کی آواز سنائی دی تھی۔

"میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" انہوں نے نہایت مضبوط لہجے میں مجھے مخاطب کیا تھا۔ وہ برداشت کرنے کے عادی تھے۔ میں انہیں اس برداشت کرنے کے تکلیف دہ عمل سے آزاد کر دینا چاہتی تھی۔

"میں اگر اتنی آسانی سے آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوتی تو ایسا کرتی ہی کیوں۔" میری آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔ کس قدر دشوار تھا ان لمحات سے مفر۔

"میں جانتا ہوں کہ تم تمام حقیقت سے آگاہ ہو گئی ہو۔ لیکن پھر بھی میں تمہیں لے جانے آیا ہوں۔" ان کا لب و لہجہ سابقہ درشتی اور اجنبیت سے عاری تھا۔

"لیکن میں اب کسی ڈرامے کا حصہ بننا نہیں چاہتی۔ میں کسی کے احساسات کو اپنی حقیقت کی بھینٹ چڑھانا نہیں چاہتی۔ آپ کا کیا ہے۔ آپ تو ایسے جینے کے عادی ہیں۔ کچھ عرصہ تو لگے گا نا مجھے آپ جیسا بننے میں' میں اتنی جلدی حالات کو فیس کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔" میں جذباتی تغیر سے دوچار تھی۔ میں نے اپنے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں کی تھی۔

"تم نہیں جانتیں قرۃ العین تم کیا کرنے جا رہی ہو؟"

انہوں نے حالات کو قابو میں کرنے کی خاطر مجھے جذباتی تغیر سے دوچار کرنا چاہا تھا۔

"نہیں جاننا چاہتی۔ یہ جاننا ہی تو بہت بڑا عذاب ہے۔"

"تم یہ عذاب خود کو نہیں' بختاور کو دینا چاہتی ہو۔ تم دنیا کے سامنے اپنی حقیقت نہیں بلکہ بختاور کی بدکرداری کو سامنے لانا چاہتی ہو۔ جسے میں نے چوبیس سال چھپایا۔"

"غلط کیا آپ نے۔" میں نے قطعی ___ انداز میں ان کی بات کاٹ دی۔ وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

"محبت کے نام پر آپ نے صرف بے اعتمادی کو پروان چڑھایا تھا۔ آپ نے چوبیس سال تک مما سے اپنی محبت نہیں نبھائی بلکہ قرۃ العین جیسے عذاب کو اپنے اوپر مسلط کیا ہے۔ آپ کو ان سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ بات آپ کو تسلیم کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہونا چاہیے۔ ایک مردہ محبت کو اپنے گلے کا طوق بنانے سے بہتر تھا۔ آپ شادی ہی نہ کرتے' زندگی کو مصلحتوں کی نذر تب ہی کیا جاتا ہے جب نتائج امید سے لبریز ہوں اور آپ نے تو قدم قدم نتائج کو بھگتنا تھا۔ سامنا کرنا تھا۔ قبول کرنا تھا۔" میں بھرائی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"میری محبت مردہ نہیں تھی قرۃ العین۔ البتہ سو ضرور گئی تھی۔ میں آج بھی تمہاری ماں سے محبت کرتا ہوں۔ تمہاری طرح میں نے بھی بارہا سوچا تھا کہ مجھے اس سے شادی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن جب میں اس کے بغیر اپنی زندگی کا تجزیہ کرنا چاہتا ہوں تو ایک صاف شفاف سلیٹ کی مانند میری زندگی میرے سامنے آ جاتی ہے۔ میں نے ہمیشہ اسے تکلیف میں مبتلا رکھا۔ لیکن جب بھی میں نے اس سے جدا ہونے کے بارے میں سوچا اس سے زیادہ تکلیف کا سامنا مجھے کرنا پڑتا تھا۔ تم اگر مجھ سے شاکی ہو تمہارا شاکی ہونا بجا ہے' لیکن اگر بختاور کے حوالے سے تمہارے دل میں خدشات ہیں تو میں کہوں گا کہ تم ان خدشات کو اپنے دل سے نکال دو کیونکہ اگر تم سے کوئی خاص محبت کرتا ہے۔ تمہاری خاطر اپنی زندگی کو داؤ پر لگا سکتا ہے' تمہارے لیے' ہر تکلیف برداشت کر سکتا ہے۔ تمہیں سرد و گرم سے بچانے کے لیے اپنی زندگی کی بھی قربانی دے سکتا ہے۔ تو وہ بختاور کا وجود ہے۔ تم نے صرف حقیقت کو جانا ہے تو تم برداشت نہیں کر پا رہیں۔ اس نے تو حقیقت کو گزارا ہے۔ تم سب سے نظر نہیں ملا پا رہیں۔ اور وہ تمہاری خاطر نظریں اٹھا کر جیتی رہی۔ وہ عورت میرے لیے ایک معمہ بنی رہی۔ اور میں اپنے آپ کو اتنی اعلا مرتبت شخصیت سمجھتا رہا کہ میرے نزدیک تم دونوں مٹی کے ذروں سے بھی کم تر ہو گئے تھے تمہاری خاطر اس نے وہ کیا جو میں اس کی خاطر کبھی نہیں کر سکا' باوجود اس کے کہ وہ میری زندگی کی وہ خواہش تھی جس کی خاطر میں اپنے والدین کے سامنے گڑگڑایا تھا۔ ظرف کبھی کبھار یوں ہی حقیقتوں کو سامنے لا کر کھڑا کر دیا کرتا ہے۔ اس کے ظرف کی بدولت ہی میں نے سر اٹھا کر زندگی گزاری تھی۔ اور میرا ظرف یہ تھا کہ میں نے اس کے ساتھ شادی کی تھی اور بس" وہ متاسف انداز میں سر ہلا رہے تھے۔

میرے اس عمل نے انہیں پچھتاوں میں دھکیل دیا تھا۔ حالانکہ میں تو انہیں پچھتاوں سے نکالنے کی خاطر ہی اس عمل تک آئی تھی۔ معیز کو مجھ سے بچانے کے لیے انہوں نے وہ سب کیا۔ جو ناگزیر تھا۔ زیاد آفاق کے ساتھ کی گئی زیادتی کیونکر انہیں سکون دے سکتی تھی۔ وہ چپ تھے۔ بظاہر رضامند بھی تھے۔ مگر میرے لیے ان کی ایسی خاموشی' ان کی رضامندی کی دلیل کی نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں مگر میرے خوش رہنے کی خواہش نہیں رکھ سکتے۔ اب بھی وہ میری خوشی کی خاطر یہاں نہیں آئے تھے۔ انہیں تقاضے کھینچ لائے تھے۔ اپنی نام نہاد عزت اور محبت کے تقاضے معاً" انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"چلو میں تمہیں لینے آیا ہوں۔" وہ ایک بار پھر اپنا سابقہ مطالبہ دوہرا رہے تھے۔

”مجھے کہیں نہیں جانا۔ مجھے زیاد آفاق سے شادی نہیں کرنی۔“ میں نے ہٹیلے انداز میں کہا۔
”باوجود اس کے کہ اس کے دل میں تمہارا کیا مقام ہے۔“ انہوں نے پرشوخ انداز میں کہا تھا۔ میں پھیکی ہنسی ہنس دی تھی۔
”جب آپ مجھے معیز سے شادی نہ کرنے کے جواز دے سکتے ہیں۔ تو میں بھی آپ کو زیاد آفاق کے ساتھ شادی نہ کرنے کا جواز دے سکتی ہوں۔“
”تم میرے ساتھ وہ سب مت کرو جو میں نے تمہارے ساتھ کیا۔“ وہ درد سے کراہ رہے تھے۔
”میں آپ کے ساتھ وہ نہیں کر رہی جو آپ نے کیا۔ میں وہ کر رہی ہوں، جو مجھے کرنا چاہیے میں زیاد آفاق کو خود سے آزاد کر رہی ہوں۔ میں تمام عمر اس کے ساتھ وہ زندگی نہیں گزار سکتی۔ جو آپ نے مما کے ساتھ گزاری۔ آپ کی زندگی میں تو محبت بھی شامل تھی۔ مگر ہم دونوں کے مابین کچھ نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو وقتی نوعیت کا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ماضی کا حصہ بن جائے گا۔ میں آپ کی طرح رشتوں کو آزار بنانا نہیں چاہتی۔“ میں سفاکی سے گویا ہوئی تھی۔ وہ تاسف سے سر ہلا رہے تھے۔
”میرے لیے قرۃ العین کبھی بھی اتنی اہم نہیں رہی تھی جتنی کہ آج۔ وہ بھی اس بنا پر نہیں کہ آج اس نے مجھے اپنا احساس دلایا تھا۔ بلکہ اس لیے کیونکہ قرۃ العین کے بغیر بختاور کا وجود بے معنی ہے۔ وہ اگر زندگی گزار رہی ہے تو قرۃ العین کی خاطر۔ میں تو سمجھا تھا کہ میں اس کے دل میں اپنی محبت کا بیج پیدا کر چکا ہوں۔ اس کے دل کی زمین پر تو کوئی اور قابض رہا۔ اور میں سمجھتا رہا۔ میری محبت اس رشتے کی اساس ہے۔
اس رشتے کی اساس صرف قرۃ العین ہے آج اسی قرۃ العین کی وجہ سے بختاور نے میرا گریبان پکڑا تھا۔ آج میں نے پہلی بار اس کی دھمکیاں سنی تھیں۔ کیا اس سے بڑی شکست میرا مقدر بن سکتی ہے۔“
”لیکن میرے لیے اس عورت کا کیا مقام ہے۔ اس کا تعین کرنے میں وقت لگے گا۔“ میں ان سے اپنا رخ موڑ گئی۔ زندگی کا یہ موڑ ناقابل برداشت ہی نہیں ناقابل قبول بھی ہے۔
تھوڑی دیر تک دونوں کے مابین خاموشی چھائی رہی تھی۔ تھوڑے توقف کے بعد ان کی آواز ایک بار پھر ابھری تھی۔
”میں نے تمام عمر بختاور کو کوئی خوشی نہیں دی۔ اور آج جب وہ زندگی اور موت کے بیچ جھول رہی ہے۔ تو میں اسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی دینا چاہتا ہوں۔“ میرے لیے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا تھا۔ کسی کو بھی میں اس کے کیے کی سزا نہیں دے سکتی۔ اپنی ماں کو سزا دینا کیوں کر آسان ہو سکتا تھا۔ یہ لوگ میری ہی دی گئی سزا کو میرے لیے سزا بنانے کا فن جانتے ہیں۔ ایک بار پھر ان کی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی تھی۔
”اسے شدید ترین نروس بریک ڈاؤن ہوا ہے۔ تمام حقیقت سے تم آگاہ ہو میں، وہی حقیقت اس کے لیے ایک دوہری اذیت ہے۔ اس نے مجھ سے شادی صرف اس لیے کی تھی کہ میں اس کی بیٹی کو اپنا نام دے رہا تھا۔ آج اس کی بیٹی یہ جان گئی تھی کہ میں اس کا باپ نہیں ہوں۔“
میں بے اختیار رو دی تھی۔ میں اگر جان گئی تھی تو بھی اتنی اذیت کا سامنا نہیں کیا تھا۔ جتنا یہ سب جان کر دکھ ہوا تھا کہ میں جو آج تک ایک شخص کی اذیت کا باعث بنتی رہی تھی۔ جب جب اس نے مجھے دیکھا تھا، جب جب میں نے اسے پکارا تھا، جب جب میں نے اپنا حق مانگا تھا، وہ کس قدر تکلیف سے گزرا ہو گا۔ اگر یہ مجھ سے اپنی نفرت کا اظہار کر دیتے، کم از کم یہی بتا دیتے کہ میں ان کی بیٹی نہیں ہوں تو بھی میں اس مقام پر نہ کھڑی ہوتی جہاں اس وقت میں کھڑی تھی۔ انہوں نے مجھے صرف اپنا نام دیا تھا اس سے وابستہ استحقاق پر میرا ذرہ برابر حق نہیں تھا۔ اور میں انجانے میں اس حق کے لیے ترستی رہی۔ کیا اس سے زیادہ

تکلیف دہ کوئی اور حقیقت ہو سکتی تھی۔ میرے آنسو میرے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

میرے آنسو میرے گالوں پر بہہ رہے تھے۔ ہسپتال کے ایک کمرے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر وہ زندگی اور موت کی کشمکش سے دوچار تھی۔ میں احساس جرم کے اس کنارے پر کھڑا تھا جہاں سے چند انچ کے فاصلے پر پاتال تھا۔ تاریکی تھی۔ وہ مجھے اس طرح سزا دے گی، اس کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ کیا تھی یہ عورت میرے لیے۔ جب پاس ہوتی تھی تو کوئی احساس نہیں امنڈتا تھا اور جب دور جانے کی کوشش کرتی تھی تو سارے احساسات منجمد کر ڈالتی تھی۔ یہ میری محبت کا کون سا رخ تھا۔ یہ محبت تھی یا کوئی دیوانگی کوئی جنون، کون سا ربط تھا ہم دونوں کے مابین، دروازے بند ہو گئے تھے۔ مگر ان سے جھانکتا ہر لمحہ جاندار تھا۔ میں بختاور کے بغیر زندگی گزارنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔
جب قرۃ العین کو تلاش کرنے کی سوچ ابھری تھی۔ تو میرے سامنے ایک بے آب و گیاہ سمندر آ کھڑا ہوا تھا۔ کوئی سمت کوئی راستہ، کوئی منزل نہ تھی اور تب زیاد آفاق نے مجھے تذبذب میں ڈال دیا تھا۔ کتنا پریقین لہجہ تھا اس کا۔
”قرۃ العین کہیں نہیں جا سکتی۔ کہیں پر بھی جانے کے لیے اسے ہمت درکار ہوتی ہے اور وہ اس ہمت سے مستثنیٰ ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ لیکن یہ فیصلہ نہیں کر سکتی۔“
میں اس کے پریقین لہجے سے متاثر ہو گیا تھا۔ معیز کے بعد میں نے کسی اور کو اس کے متعلق اس انداز سے گفتگو کرتے دیکھا تھا۔
گھر کا کونا کونا چھاننے کے بعد مجھے اسٹور میں اس کا سکڑا سمٹا وجود دکھائی دیا تھا۔ عروسی لباس میں ملبوس وہ زور سے بھی بیگانی، کونے میں دبکی ہوئی تھی۔
میرے چھونے پر وہ ایک دم چونک سی گئی تھی۔ میں اسے یہاں سے لے جانے آیا تھا۔ ایک بار اسے بختاور کے سامنے لے جا کر کھڑا کر دینا چاہتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی روشنی لوٹا دینا چاہتا تھا۔ لیکن قرۃ العین میری کسی بھی سعی پر آمادگی نہیں رکھتی تھی۔
بہت لاوا تھا اس کے اندر، لیکن اس کے باوجود وہ برداشت اور صبر کی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی۔ وہ اب بھی صرف خود کو سزا دے رہی تھی۔ لیکن نہیں اپنی دانست میں وہ اپنے ساتھ زیادتی کر رہی تھی۔ مگر درحقیقت اس کا یہ انتقام مجھ سے منسلک تھا۔ مجھے زندگی کی بدترین سزا دینے کی تدبیر بے اختیاری تھی۔
ایک حقیقت وہ میرے کتھارسس سے جان پائی تھی۔ اور حقیقت وہ تھی جو اس لمحے وجود میں آئی تھی۔ اور یہ حقیقت زیادہ جاندار اور پر اثر تھی۔ جب وقت اپنے ساتھ سب کچھ بہا لے گیا ہو تو ایسی صورت حال میں ماضی ہی باقی بچتا ہے۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ ماضی کی تلخ اور کڑوی سچائیوں کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی تھی۔
اس کی آنکھوں کی خود اعتمادی اس کے ماں کے وجود سے منسلک تھی۔ اس کے شدید رد عمل کے بارے میں جان کر وہ خود اپنے سابقہ مصمم ارادوں پر قائم نہیں رہ سکی تھی۔ ہسپتال کے اس کمرے میں وہ بختاور کے ہاتھ تھامے اسے پکار رہی تھی رو رہی تھی۔ شاید اپنا غبار نکال رہی تھی۔ مگر اب میرے لیے کچھ بھی تکلیف دہ نہ رہا تھا، ساری پھانس نکل چکی تھی۔ ہماری زندگیاں اب بھی ایسی گزرنی تھیں مگر بہرحال مبہم خدشات مٹ چکے تھے۔ جو ابہام مجھے بختاور کی ذات سے تھے۔ ختم ہو چکے تھے۔

☼ ☼